

”و عقیل شاداب شخصیت اور فن“

تحقیقی مقالہ

برائے پی ایچ-ڈی-ڈگری (اردو)
کوٹھہ یونیورسٹی، کوٹھہ (راجستھان)

فیکٹری آف آرٹس

رسروچ اسکالر
بے بی شبانہ



زیر نگران
ڈاکٹر حسن آراء
صدر شعبہ اردو
گورنمنٹ آرٹس کالج کوٹھہ
کوٹھہ (راجستھان)

شعبہ اردو

فیکٹری آف آرٹس

کوٹھہ یونیورسٹی، کوٹھہ (راجستھان)

2017

"AQEEL SHADAB- SHAKHSIYAT AUR FAN"

**A Thesis
Submitted For The
Award Of Ph. D. Degree Of Urdu
University Of Kota**

**In The
Faculty Of Arts**

**By
Baby Shabana**



**Under The Supervision Of
Dr. Husn Ara
Head Of The Dept. Urdu
Govt. Arts College Kota
Kota, (Raj.)**

Department. of Urdu

Faculty of Arts

University Of Kota (Raj.)

2017

Dr. Husn Ara
Head of the
Department of Urdu
Govt. Arts College, Kota
(Rajasthan)

Certificate

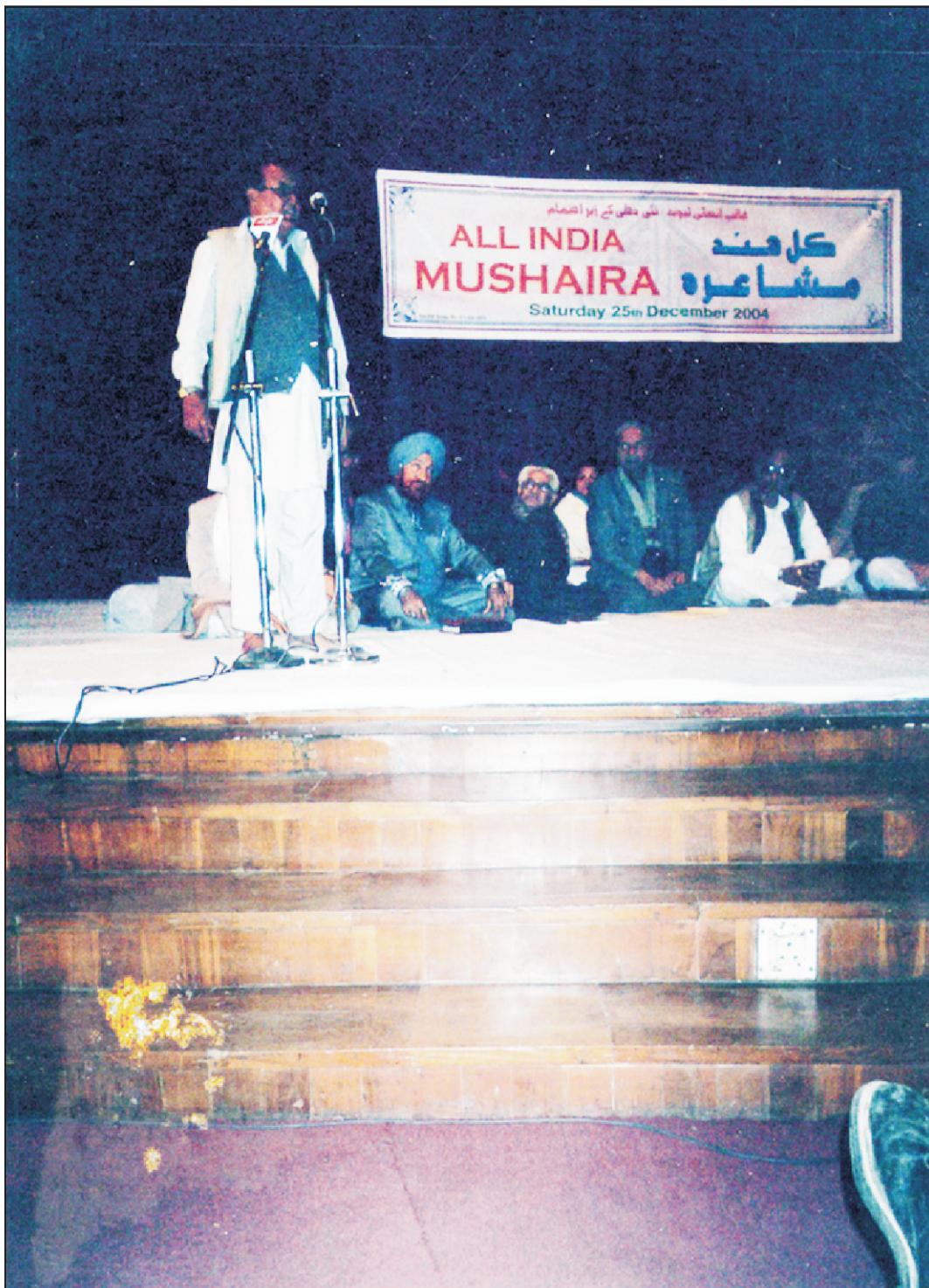
I feel great pleasure in certifying that the thesis entitled
"Aqeel Shadab Shakhsiyat Aur Fan"
embodies a record of the result of investigation carried out by Mrs.
BABY SHABANA under my guidance. I am satisfied with analysis
of data interpretation of result and conclusion drawn. She has
completed the residential requirement as per rules. I recommend
the submission of the thesis.

Date.

Dr. Husn Ara
Head of the
Department of Urdu
Govt. Arts College, Kota
(Rajasthan)



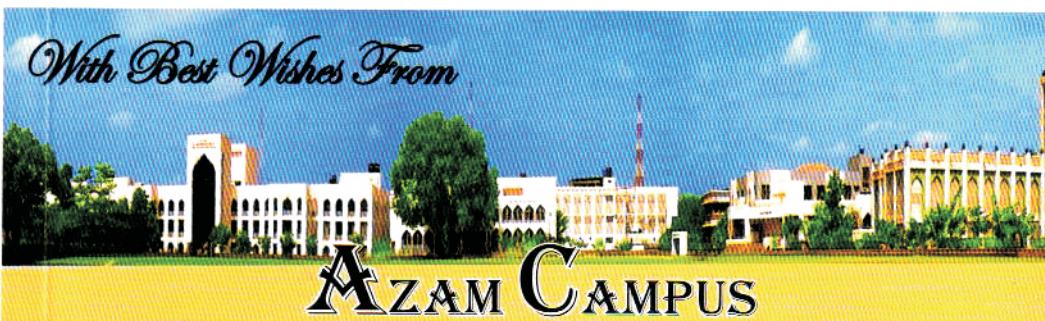
جناب عقیل شاداَب (مرحوم)



کل ہند مشاعرہ

Editor: NAZEER FATEHPURI

- 1) Saira Manzil, 230/B/102, Viman Darshan, Sanjay Park,
Logaon Road, Pune - 411 032 M.S. (India)
M.: 9822516338, 8055755623 Email: nazir_fatehpuri2000@yahoo.com
- 2) P.O. Box No. 13, Yerwada, Pune - 411 006 M.S. (India)



AZAM CAMPUS

PRIMARY SCHOOLS

- HGM Azam Urdu Primary School
- MCE Society English Primary School
- HAK Memon English Primary School

COLLEGES

- Abeda Inamdar Jr. College for Girls
- Abeda Inamdar Sr. College
- MCES Arts & Comm. Night College
- HGMA College of Edn. (B.Ed. English)
- MCES Jr. College of Edn. (D.Ed. English)
- MCES Jr. College of Edn. (D. Ed. Marathi)

INSTITUTES

- Allana Institute of Management Sciences
- Allana Institute of Information Technology
- Institute of Res. & Development Centers
- PAI International Learning Solutions
- Institute of Pharmacy (Diploma)



P. A. Inamdar
President

Maharashtra Cosmopolitan Education Society, Pune

HIGH SCHOOLS

- Anglo Urdu Girls High School
- Anglo Urdu Boys High School & Jr. College
- HAK Memon Urdu High School
- MFAS Jr. College of Edn. (D.T.Ed. Urdu)
- AKK New Law Academy
- Allana College of Pharmacy
- Allana College of Architecture
- MAR Institute of Hotel Mgt. & Research
- MAR College of Dental Sci. & Research
- School of Art

SISTER INSTITUTES

- ZVM Unani Medical College
- MAR College of Physiotherapy & Research
- MMER'C School of Nursing
- Deccan Muslim Institute & Research Center
- Golden Jubilee Technical Institute



Munawar Peerbhoy
Chairman

Haji Gulam Mohd. Azam Education Trust, Pune

2390-B, Khan Bahadur Hidayatullah Road, Azam Campus, New Modikhana, Pune -1
Tel. No.: 26452040 / 26452288 Fax No.: 26459112 Email ID : hgmactrust@gmail.com

اشاعمت کا چھٹیسواں سال

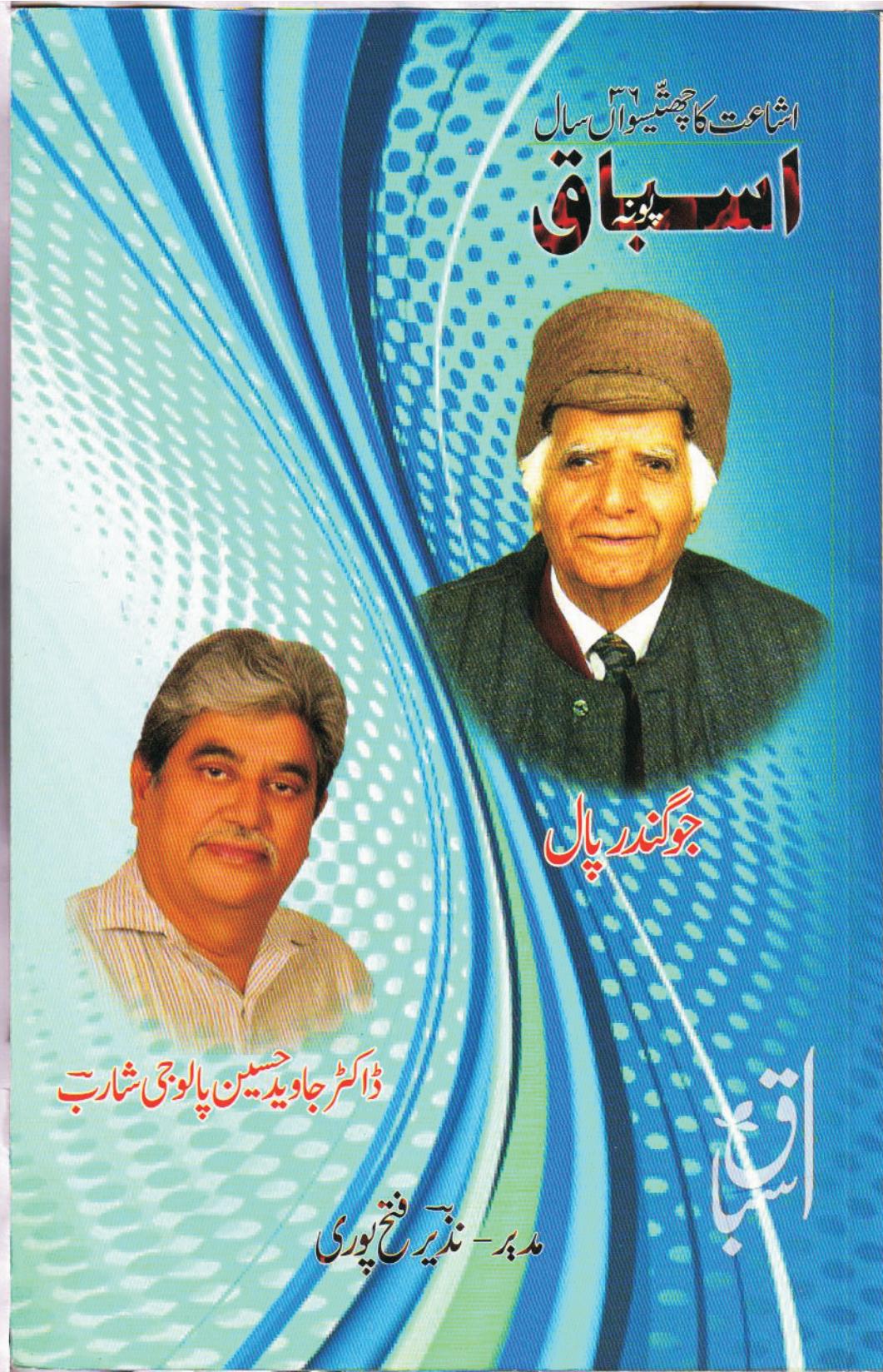
امہ سباق

جو گندر پال

ڈاکٹر جاوید حسین پالوجی شارب

سباق

مدبر - نذیر فتح پوری



سماں اسپاٹ، پونے

1

اشاعت کا چھتیسوائی سال

اسپاٹ

پونے (महाराष्ट्र)

جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء

جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء

دین

نذر فتح پوری

M : 0091 9822516338

M : 0091 8055755623

ڈائیکٹ دل دیند

شم沙ہ جلیل شاد

0091-9420864859

شہر پیلسٹ

عالی جناب متوہر پیر بھائی صاحب

چنبری میں حاجی نلام محمد عظیم ایجوکیشن ٹرست، پونے

بیڈ ڈسٹریٹ پیلی ٹیکن لارڈ پیلی ٹیکن لارڈ

نذر فتح پوری نے جے گنیش پر لیں پونے سے
چھپوا کرومان درشن، لوہا گاؤں روڈ، پونے ३२००३२
سے شائع کیا۔

فائلو ڈسٹریٹ

ع-ع-اشرنی

9422520230

راہیں

(1) Saira Manzil,230/B/102

Viman darshan Sanjaypark

Lohgaon Road Pune-411032 M-S

(2) Nazeer fatehpuri

PostBoxNo.13,YerwadaPune411006

E-mail:

nazir_fatehpuri2000@yahoo.com

آرائش و کمپیوٹر کمپوزنگ

ارقم ببلی کیشز : 9767113554

نر سلاں : 200 روپے

لا ٹپڑ پیٹ پیٹوں سے 250 روپے

خُبھوٹھی قھاقن 500 روپے

لا ٹف مھپڑ شپ 5000 روپے

اچ شماری گئی قیمت 60 روپے

نوٹ: (1) مضمون تگارک رائے سے اوارے کا تخفیق ہونا ضروری
نہیں (2) اسپاٹ سے متعلق کوئی بھی قانونی چارہ جوئی صرف
یونکی عدالت میں ہوگی۔ (اورہ)

فہرست ابواب مقالہ

صفحہ	عنوان	نمبر
(۲)	☆ پیش لفظ	
(۱) باب اول	
(۸)	کوٹھ کا ادبی پس منظر	(۲) باب دوم
(۳)	عقیل شاداب کی شخصیت اور کارنامے (۳۱) عقیل شاداب کے ہم عصر شعراء (۶۲)	(۳) باب سوم
(۴)	عقیل شاداب کی غزل گوئی (۷۷) عقیل شاداب کی نظم نگاری (۲۰۲)	(۴) باب چہارم
(۵)	(۵) باب پنجم
(۶)	ما حصل کتابیات ☆	(۶) باب ششم
(۷)	کتابیات	

پیشِ لفظ

اردو شعر و ادب میں عقیل شاداب کا نام متعدد حیثیتوں سے انفرادیت کا حامل ہے۔ آپ کا شمار راجستھان میں عہد جدید کے معتبر شعرا میں ہوتا ہے۔ موصوف کی شخصیت ادبی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ راجستھان کی ادبی محفلوں میں روشن چراغ کے مانند مشعلے راہ رہیں گے۔ جب کبھی بھی ریاست کوٹہ اور راجستھان کی ادبی تاریخ مرتب کی جائیگی عقیل شاداب کا نام اس فہرست میں شامل کیا جاتا رہے گا۔

عقیل شاداب نے بدلتے ہوئے زمانے میں آنکھیں کھولیں۔ موجودہ دور کی سیاسی سماجی اور معاشری مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع خاص بنایا۔ عقیل شاداب کسی ازم کی پابند شاعر نہیں تھے جو کچھ دیکھتے محسوس کرتے اسے بے باکی سے کہہ دینے میں یقین رکھتے تھے۔

”تذکرہ شعراۓ کوٹہ“ عقیل شاداب کا ایک ادبی اور تاریخ اعتبر سے اہم کارنامہ ہے جو ۲۰۰۴ء میں راجستھان اردو اکادمی کے زیر احتمام منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس کتاب میں عقیل شاداب نے کوٹہ کے سبھی شعراۓ کرام اعلیٰ درجہ کے شعرا کے کلام کا انتخاب شاندار انداز میں کیا ہے۔ ”تذکرہ شعراۓ کوٹہ“ ایک نایاب تھفہ ہے۔ جس میں کوٹہ کے کئی معتبر شعرا کے نام شامل ہیں۔ جن کی ادب نوازی سخن سخن اور سخن فہمی کا درجہ نہایت بلند ہے۔

عقیل شاداب بنیادی طور پر جدید ہن و شعور کے مالک تھے۔ ان کے خیال و فکر میں بلندی ملتی ہے، ان کی غزلیں اور نظمیں اس بات کی وضاحت کرتی ہے۔ ان کی شخصیت اور فکر و فن کی مزید وضاحت کے لئے یہ مقالہ ”عقیل شاداب شخصیت اور فن“، تحریر کیا گیا ہے۔

میں نے عقیل شاداب پر مقالہ تخلیق کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اس مقالہ کے عنوان کے تحت ان کی شخصیت اور کارناموں کا اہم تر مفصل اور کامیاب ذکر کر سکیں۔ اور اس کام کو سر انجام دینے کے لئے میں نے اس مقالہ کو مندرجہ ذیل چھہ ابو ب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے باب میں جس کا عنوان ”کوٹہ کا ادبی پس منظر“ ہے۔ اس باب میں کوٹہ کی شعری اور ادبی تاریخ پیش کی ہے۔ اور کوٹہ کے شعر و ادب کی تمام شخصیات کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ علاوہ ازیں کوٹہ کی سیاسی اور سماجی تاریخ کا احاطہ کیا گیا ہے۔

دوسراباپ ”عقلیل شاداب کی شخصیت اور کارنامے“ کے تحت ان کی سوانح عمری، ان کی خانگی اور خاندانی حالات مکمل طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کے فن پر بھی جامع مفصل روشنی ڈالی ہے۔ لہذا اس باب کی مدد سے ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

آپ کیم ۱۹۳۵ء کو اپنے آبائی مکان محلہ برج راج پورہ، کوٹھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم کا نام مشتی محمد ابراہیم خاں تھا اور والدہ صاحبہ کا اسم شریف گل بی بی تھا۔ والد مشتی محمد ابراہیم خاں کوٹھ ریاست کی عدالت میں مقدمات کی پیروی کرتے تھے۔ عقلیل شاداب شروع سے ہی بڑے ذہین اور ضحاک انسان تھے۔ معاملہ فہمی، سخن فہمی اور سخنوری جیسی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ دسویں جماعت تک اپنی تعلیم کوٹھ میں مکمل کرنے کے بعد آگے کی تعلیم کے لئے عقلیل شاداب نے انجینئرنگ کی ڈگری کی حصول کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ زیر تعلیم ہی تھے کہ اس درمیان میں ان کی خانگی حالات ناسازگار ہو گئے، آپ کے والد محترم کا انتقال ہو گیا۔ آپ جب کوٹھ آئے تو یہاں کے حالات منتشر تھے، آپ انجینئرنگ کا کورس مکمل نہ کر پائے اور خانگی مسائل کو حل کرنے کے بعد عقلیل شاداب نے از سر نواپنی شعری صلاحیتوں پر کام کرنا شروع کیا۔

تیسرا باب ”عقلیل شاداب کے ہم عصر شعراء“ ہے۔ اس باب کے عنوان کے تحت ان شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جو ان کے عہد میں شاعری کرتے رہے۔ مزاج اور کلام کے اعتبار سے کچھ تو انہیں ہی کی طرح نئے لب و لہجہ اور خیالات کے حامی دکھائی دیتے ہیں اور کچھ روایتی مزاج کے حامی ہیں۔ کچھ ترقی پسند اور کچھ بڑے آزادانہ طور پر اپنی بات اپنی انداز میں کہتے ہیں۔

چوتھا باب ”عقلیل شاداب کی غزل گوئی“ ہے۔ اس باب میں عقلیل شاداب کی غزل گوئی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ان کی غزل گوئی کا مکمل احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو غزل کے میدان میں وہ کس معیار کے شاعر ہیں اس کا کامیابی سے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیوں کہ عقلیل شاداب ہمہ جہت شاعر ہیں، لہذا انہیں کسی ایک صنف سخن کے نظریہ سے دیکھنا کچھ مشکل تور ہا لیکن ان کی طرف سے ہماری نسبت نے اس کام کو آسان کر دیا ہے۔ لہذا قارئین ہی بہتر فیصلہ کر سکیں گے کہ ہمارا نظریہ کس حد تک کامیاب ہے۔

پانچواں باب ”عقلیل شاداب کی نظم نگاری“ ہے۔ اس باب میں عقلیل شاداب کی نظم نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نظموں کے حوالے سے عقلیل شاداب ایسے جیا لے اور بہادر شاعر ہیں جنہوں نے ہر کیفیت اور واقعات کو بڑے بے باک اور پر خلوص انداز میں اپنا وسیلہ اظہار بنایا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ نظموں کے اعتبار سے عقلیل شاداب تازہ گوشاعر ہیں۔ کہیں کہیں تو ان کی جرأت پرواز ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے مگر ان کی یہ جرأت مندی

ہی ان کی سچائی سے ہمارا تعارف کرواتی ہے۔ اور پھر جو لذت ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ واقعی ایک سچے اور بے باک نظم نگار کی ایک بہترین خوبی ہے۔

باب ششم ”حاصل“ ہے۔ یہ آخری باب ماحصل کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے جس میں پچھلے پانچوں ابواب کا احاطہ کرتے ہوئے نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ عقیل شاداب کی شخصیت اور کارناموں کو بیان کرتے ہوئے موصوف کی شخصیت کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عقیل شاداب پر ابھی تک ایم فل کی سطح پر ۲۰۰۳ء میں کام ہوا ہے جو راجستھان یونیورسٹی جے پور میں پروفیسر فیروز احمد کی نگرانی میں رو بنیہ نے کیا ہے، لیکن اس کے بعد عقیل شاداب کی کئی تصانیف شائع ہو چکی ہے اس لئے میں نے عقیل شاداب کی شخصیت اور فن کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ مرتب کیا ہے جو عقیل شاداب کی فنی اور فکری نظریات پر مبنی ہے۔ اگرچہ میں نے ان کی فن کو گرفت میں لینے کی پوری کوشش کی ہے پھر بھی تحقیق میں کمیاں رہنا ایک فطری عمل ہے۔

میں یہاں سب سے پہلے مقالے کی تکمیل کے موقع پر اللہ کا تہہ دل سے شکردا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے دین کے عظیم خزانے کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم کے لئے بھی ہمت و حوصلہ افزائی عطا کی۔

میں ڈاکٹر حسن آراء صاحبہ کا شکردا کرنا چاہتی ہوں جن کے زیر نگرانی یہ مقالہ تحریر کیا گیا ہے۔ میں اپنی کم علمی کے باوجود ان کی حوصلہ افزائی، رہنمائی اور بے پناہ شفقت کی وجہ سے ہی یہ کام کر پائی ہوں۔ انہوں نے اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود اس مقالے کی تکمیل سے لے کر تکمیل کے تمام مراحل تک میری رہنمائی فرمائی۔ اور تحقیق و تنقید کے رموز سے واقف کیا۔ تحقیق کی اس دشوار گزار راہ کو میں نے انہیں کی شفقت، ہمت افزائی اور رہنمائی میں سلامتی سے پا کیا۔

میں پروفیسر فاروق بخشی صاحب کی بھی بے حد شکرگزار ہوں انہیں نے مجھے عقیل شاداب پر مقالہ لکھنے کا مشورہ دیا۔ جب میں نے عقیل شاداب کی نظموں اور غزلوں کی کتاب ”آدمی نما“ اور ”بے آب سمندر“ کا بغور مطالعہ کیا تو میرے دل میں یہ خواہش جاگی کہ میں صرف اور صرف عقیل شاداب پر مقالہ لکھوں۔ اب میرے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ عقیل شاداب کی زندگی، ان کی شخصیت، ان کا شعری سفر، ان کی ازدواجی زندگی سے متعلق معلومات مجھے کس طرح ملے گی۔ میں نے اپنی یہ پریشانی فاروق بخشی صاحب کے سامنے ظاہر کی تو انہوں نے مجھے عقیل شاداب کے صاحبزادے جناب فرخ ندیم سے ملنے کی صلاح دی۔ میں نے ان سے مل کر مقالے سے متعلق جو بھی دشواری میرے سامنے تھی وہ سمجھی ان کو بتائی اور انہوں نے بے حد محبت کے ساتھ مجھے یہ یقین دلا یا کہ

مقالات کو تکمیل تک پہنچانے میں وہ میری ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اور میں نے عقیل شاداب کی زندگی کے حقیقی واقعات، ان کے فرزند فرخ ندیم سے بال مشافہ گفتگو سے حاصل کئے۔

یہاں میں یہ بات کہنا بے حد ضروری سمجھتی ہوں کہ فرخ ندیم صاحب اور ان کی اہمیت ریحانہ صاحبہ نے شروعات سے لے کر مقالے کی تکمیل تک میرا ہمیشہ ساتھ دیا۔ اور عقیل شاداب سے متعلق تمام معلومات مجھے فراہم کی اور ان کے گھر سے میرا رشتہ اس قدر جوڑ گیا کہ مجھے اس پورے سفر میں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میں کب ان کے خاندان کا حصہ بن گئی۔

چونکہ میں اس وقت اپنی زندگی کے انہائی پیچیدہ حالات سے گزر رہی تھی۔ ایسے حالات میں مقالے کو تکمیل تک پہنچانا میرے لئے بے حد مشکل کام تھا۔ اور یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میری رہنمائی کرنے کے لئے ڈاکٹر حسن آراء صاحب، پروفیسر فاروق بخشی اور فرخ ندیم صاحب ہر قدم پر میرے ساتھ رہے۔ لہذا میں تمام مشکلات کا سامنا کرتی ہوئی اپنے مقالے کو پائے تکمیل تک پہنچایا۔

میں شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج کوٹھ کے تمام اساتذہ: ڈاکٹر نعیم صاحب، ڈاکٹر قمر جہاں صاحب، ڈاکٹر نادرہ صاحبہ کی مشکور و ممنون ہوں جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔

میں اپنے ہم جماعت ساتھیوں کے بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا اور مجھے نیک مشوروں سے نوازہ۔

اس موقع پر اپنے والدین کے بے حد مشکور ہوں جنہوں نے مختلف مراحل میں میرا تعاون کیا اور مجھے پیام اور مسلسل تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کیا۔ میرے دونوں بھائی زبیر احمد اور شعیب علی نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ مجھے امید ہے کہ میرا یہ کام، میری محنت اور کوشش ضرور نگ لائے گی اور عقیل شاداب کی ادبی خدمات منظر عام پر آ کر ایک ایسا سورج بن کر چمکے گی جس سے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے راہ ہموار ہوگی۔

سورج ہوں زندگی کی رقم چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

بے بی شبانہ

ریسروچ اسکالر

باب اول

کوٹھ کا ادبی پس منظر

باب اول

کوٹھ کا ادبی پس منظر

راجستان ابتداء ہی سے دہلی اور لکھنؤ کے بعد ایک ادبی مرکز رہا ہے۔ یہ سر زمین جغرافیٰ لحاظ سے ریاستان کی جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر حسن آراء

”راجستان جغرافیٰ لحاظ سے ریاستان کہا جاتا ہے۔

لیکن ادب لحاظ سے ہمیشہ نگران ہی رہا“۔ ۱

کوٹھ ضلع راجستان کے جنوب مشرق میں دریائے چمبل کے دونوں کنارے پر بسا ہوا ہے۔ لیکن اس شہر کا پیشتر حصہ مشرقی کنارے پر آباد ہے۔ ذمین، پہاڑی، پھرائی اور میدانی ہے۔ چمبل کالی سندھ، پروان و دیگر ندیاں بہتی ہیں اور اسے سیراب کرتی ہیں اس شہر کے تمام ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے۔

کوٹھ شہر کا تعلق اردو زبان سے اتنا ہی پر انا ہے جتنی خود اردو زبان ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کوٹھ شہر اردو ادب کے تخلیقی اعتبار و مزاج کے اعتبار سے کافی زرخیز رہا ہے۔ یہاں ابتداء سے ہی اعلیٰ درجے کے شاعر اور ادیب پیدا ہوتے رہے اور اپنے عملی تخلیق سے شعرو ادب کے چارغ روشن کرتے رہے۔ راجا مہاراجاؤں کی تاریخ سے لے کر ابھی تک یہ عمل جاری ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیوں کہ ادب ایک ایسا شعبہ زندگی ہے جو ایک بار اگر وجود میں آجائے تو پھر اس کا قیام تادم حیات جاری رہتا ہے۔ اور وہ اپنے عمل کے ذریعہ زندگی کے تمام راستوں کا تعارف پڑھنے لکھنے والوں سے کرواتا رہتا ہے۔

الہذا کوٹھ شہر تو یہے جغرافیٰ اعتبر سے بڑا خوبصورت اور پُر فضا شہر ہے۔ یہاں کی قدرتی فضانہ صرف ادبیوں اور شاعروں کے لئے سازگار ہے بلکہ ہر شعبہ زندگی میں کام کرنے والے شخص کے لئے بہترین ہے اس کی ایک وجہ یہاں بہتی ہوئی وہ چمبل ندی ہے جو اس خطے کو پورے صوبے میں سب سے خوشحال اور خوشگوار بنائے ہوئے ہیں۔ کسی شاعر نے خوب ہی کہا ہے ۲

ندی کا ہے یہ کرشمہ جو ہو گئی رونق

کہ ریگزار میں مثل بہار ہے کوٹھ

موجود دور میں کوٹھ جدید تعلیم (سائنس اور ٹکنولوژی) کے حوالے سے پورے ہندوستان میں اپنی شناخت بنا چکا ہے لیکن ہمیشہ سے ہی اس شہر نے اردو زبان و ادب کو صحبت مند ماحول عطا کیا۔

کوٹھ ریاست کا قیام شاہجہاں کے زمانے میں ۱۸۳۲ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس ریاست کے حکمراء ۱۸۷۶ء تک سلاطین مغلیہ سے وابستہ رہے۔ ۱۸۷۶ء میں مہاراجہ امیر سنگھ نے انگریزوں سے معاهدہ کر لیا، ۲ اس طرح ان کے سلاطین مغلیہ سے مراسم ختم ہو گئے۔ تاہم سرکاری دفاتر میں فارسی کی اہمیت قائم رہی۔ مگر فارسی شعر و ادب کے سلسلے میں کوئی نمایا خصیت نظر نہیں آتی۔ غدر کے بعد انگریزوں کی ایماء پر نواب فیض علی خاں کوٹھ کے وزیر اعظم مامور ہوئے۔ اور ریاست کے دفاتر میں اردو زبان استعمال کی جانے لگی۔ ۱۸۷۷ء میں مطبع فیض کے نام سے پرلیس قائم ہوا۔ اس پرلیس پر سرکاری قوانین اردو اور دیوناگری رسم الخط میں شائع کئے جاتے تھے۔ اس دوران ریاست کے سرکاری ملازمین میں ایسے حضرات شامل ہیں جن کو شعرخن کا شوق تھا۔ چنانچہ گوبند سہاۓ نشاط و ہاں نجح کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۳ اور جمیش علی خاں جم حاکم مقرر ہوئے۔ ۴

مثلاً بھلی پانی صنعت، ہرفت وغیرہ۔ یہ شہر کوٹھ ساڑی اور کوٹھ استھون کے لئے بھی مشہور ہے۔ بڑا سربر و شاداب علاقہ ہے۔ صرف ہریالی کے اعتبار سے ہی نہیں یہاں شعر و ادب کے چمن بھی اسی طرح شاداب رہتے ہیں۔ ہر سال دشہر کے موقع پر کل ہند مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ جس میں تمام ہندوستان کے شعراً شرکت فرماتے ہیں۔

”راجستان میں کوٹھ ریاست کو بھی ادبی اور

جغرافیائی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔“ ۵

تقریباً ۱۳۰۰ویں صدی کوٹھ بھلی کی نسبت سے اس شہر کا نام کوٹھ پڑا۔ قدیم زمانہ سے ہی کوٹھ ریاست کا وجود بوندی ریاست سے وابستہ رہا ہے۔ بوندی کے حکمراء خاندان کے فرد مادھو سنگھ کو اس کی حسن خدمت کے صلے میں شہنشاہ شاہجہاں نے کچھ علاقہ ریاست بوندی کا اور کچھ شاہی علاقہ میں ۱۸۳۲ء میں عطا کر کے کوٹھ ریاست قائم کرائی۔ ۶

قیام ریاست سے اس وقت تک ریاست کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ ہاڑوتی میں ہاڑا راجپتوں کے ساتھ ہی مغل تہذیب کی جھلک بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔ مغلوں کی زبان فارسی تھی۔ اور ملک میں مسلمانوں کی آمد و رفت سے اردو زبان کا وجود ادب سامنے آنے لگا تھا۔ دہلی اور اس کے قریب و جوار میں اردو زبان کا استعمال عام بول چال میں ہونے لگا تھا۔ لیکن اردو شعر و سخن کے ابتدائی نقوش ۱۹۰۰ویں صدی میں دکھائی دینے لگے تھے۔ دہلی کے اجزٰ جانے کے بعد غدر ۱۸۵۷ء سے متاثر ہو کر دہلی کے ادباء و شعراً راجستان کے مختلف ریاستوں میں

تلاش معاش کے سلسلے میں آئے اور یہاں سکونت پذیر ہوئے۔ جس کے زیر اثر یہاں شعروخن کا سلسلہ اتنا بڑھ گیا کہ جا بجا چھوٹے چھوٹے ادبی گھوارے قائم ہونے لگے۔ مثلاً جے پور، ٹونک، بیکانیر، جھالاواڑ، الور، بھرت پور، اجمیر، جودھپور، بوندی اور کوٹھ وغیرہ۔

”کوٹھ کی اندر وہی اصلاح کے لئے ۱۸۷۳ء میں انگریزوں نے نواب ممتاز الدولہ فیض علی خاں بہادر کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ کوٹھ میں اردو آمد و استحکام کا شرف بھی انہی کو حاصل ہے۔ پہلی بار اردو سرکاری اور عدالتی زبان بنی۔ اردو پر لیں بھی قائم ہوا سرکاری قوانین بھی شائع کئے گئے۔ وہاں کا دستور العمل عدالت دیوانی ۱۸۷۵ء میں مطیع فیض (جیل پر لیں) کوٹھ سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس کے دو کالم تھے۔ ایک میں اردو رسم الخط ہے اور دوسرا میں دیونا گری مگر زبان دونوں کی ایک ہی ہے جو خالص اردو ہے۔“

”کوٹھ ریاست میں اردو کا فروغ اس وقت تیز تر ہوا جب مہاراؤ کوٹھ نے اپنی ریاست کے انتظام کو سنبھالنے کے لئے برٹش سرکار سے ایک قابل آدمی بھیجنے کو کہا۔ برٹش سرکار کی طرف سے پہاسو کے نواب فیض علی کو کوٹھ بھیجا گیا جو بے پور میں اپنی کاؤشوں اور اچھے بندوبست کی وجہ سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ نواب فیض علی کوٹھ میں مدارالمہام کے عہدے مقرر ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے ۱۸۷۳ء میں آتے ہی اردو کو ریاست کی سرکاری زبان بنادیا اور ایک سے بڑھ کر ایک عالم اور فاضل انسان کو باہر سے بلا کر اچھے عہدوں پر فائز کر دیا۔ کوٹھ ریاست کے مورخ ڈاکٹر مقتدر الال لکھتے ہیں:

”نواب فیض علی نے آٹھوں نظامتوں کے ناظر، پندرہ تحصیلوں کے تحصیلدار عدالتی دیوانی اور فوج داری کے حاکم، شہر کوتوال، بڑے مکموں کے سرنشیت دار، ناظر، کنسل اور محکمہ عالیہ کے سب اہل کار باہر سے بلوائے جس سے ہاڑوئی میں اردو لکھی جانے لگی۔ اردو زبان کا استعمال کثرت سے ہونے لگا۔“ ۸

لیکن ادبی سطح پر اردو اس وقت زیادہ عام ہوئی جب حاجی سید جعفر حسین سیشن نجح کوٹھ کے ساتھ مشی افضل حسین ثابت لکھنؤی بھی کوٹھ آ کر بس گئے۔ مولوی ثابت لکھنؤی ایک بہتر عالم اور قابل آدمی تھے۔ آپ عربی فارسی کے جاننے والے تھے لیکن اردو میں شعر کہتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو ادب کو کوٹھ میں پروان چڑھانے کا سہرا ثابت لکھنؤی کے سر ہے، تو غلط نہ ہوگا۔ کوٹھ مہاراؤ ان کا ادب کرتے تھے۔ اور دربار میں ان کی جگہ مقرر تھی۔ نثر و نظم دونوں میں انہوں نے اپنی کتب یادگار چھوڑی ہیں۔ مرزاد بیر سے متعلق ان کی تحریر شدہ کتاب ”حیات و بیر“ مولانا

شبی نعمانی کی کتاب ”موازنہ انیس و دبیر“ کے جواب میں تحریر کی گئی تھی۔ کیوں کہ شبی کا جھکا و انیس کا طرف تھا۔
الہذا یہ کتاب دبیر کے حق میں ایک اہم دستاویز ہے جسے اردو ادب میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہیگا۔ مولانا ثابت نے ہزاروں مرثیے بھی اپنی یادگار میں چھوڑے ہیں۔ ان کے نوحون اور مرثیوں کا مجموعہ ”صریح میل“ کے نام سے چھپ چکا ہے۔ انہوں نے غزل اور رباعی کے ذریعہ بھی اپنے جذبات دوسروں تک پہنچائے، ان کے کلام میں سادگی ہے۔ ۹

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ محترم ثابت لکھنؤی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ زبان و خیال کے اعتبار سے بہترین شعر کہتے تھے۔ موجودہ شعری اور ادبی دنیا میں ان کا ایک شعر تو مہاورہ ہی بن گیا ہے جو مندرجہ ذیل چار مصروعوں پر مشتمل ہے۔

جدا رہیں تو جُدائی سے آہ آہ کریں
جمل کے بیٹھیں تو کمجنگ زہرا گنے لکیں
عجب سُلگتی ہوئی لکڑیاں ہیں رشتہ دار
الگ رہیں تو دھواں دیں میں تو جلنگیں ۱۰

مندرجہ بالا اشعار محترم ثابت لکھنؤی کے بہترین شاعر اور مفکر ہونے کا ثبوت ہیں کیوں کہ کسی خانگی مسئلے یا طرز فکر کو ابھی تک اس پیرائے میں کسی نے بیان نہیں کیا ہے جیسا کہ موصوف نے لکھ دیا ہے۔ بحیثیت انسان بھی ثابت لکھنؤی مقبول، معروف شخصیت ہیں۔ الہذا انہوں نے کوٹھ کے ادبی پس منظر کو مستحکم کرنے میں نمایاں خدمت انجام دی۔
ثابت لکھنؤی صاحب کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے کوٹھ کے ہزاروں لوگوں کو اردو زبان اور ادب کی طرف راغب کیا۔ ان کے شاگردوں میں یوں تو بہت مشہور ہوئے مگر قیس کوٹھی، مفتول کوٹھی نے اکھیل بھارتی (کل ہند) سطح پر اپنی پہچان بنائی یہ دور خاص طور پر اردو کے لئے بڑا سازگار رہا۔ اس زمانے میں عثمان غنی مائل، چھوٹے خان، رشید، نیاز احمد نیاز، شار، احمد حسین زور، عبدالعظم خاں بسل، حاجی ڈم ڈم کوٹھی، راجندر کمار مجور کے نام قابل ذکر ہیں۔ ۱۱

کوٹھ میں اردو شعرو شاعری کو مقبول کرنے کا شرف مولوی سید افضل حسین ثابت لکھنؤی کو حاصل ہے، جو ۱۸۸۲ء میں عدالتی ملازمت کے سلسلے میں کوٹھ تشریف لائے تھے۔ یہ بہت ہی قادر الکلام شاعر تھے ان کی شخصیت سے اردو شعر و ادب کا خوشنگوار ماحول بن گیا اور ان کی کوششوں اور کاوشوں کی بدولت یہاں شعری نشستیں و مشاعروں کا سلسلہ عام ہونے لگا کئی ادبی انجمنیں قائم ہونے لگیں۔

بقول مفتول کوٹوی:

”شروع شروع میں یہ نشستیں سید کے باغ سیدھ کنور عل کانو ہرہ
اور راج کنہاڑی کی حوالی میں منعقد ہوتی رہیں۔ خاص نشستوں
میں ثابت لکھنوی، وکیل محمد حسین ثاقب اور جناب سہیل امرودی
ہی شریک ہوتے تھے۔“ ۲

کوٹہ میں اردو ادبی ترقی کی منزل طے کر رہی تھی کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ۱۹۱۴ء کو کوٹہ کی سرکاری زبان اردو کی جگہ ہندی مقرر کر دی گئی۔ لیکن اردو کی سرکاری حیثیت ختم ہونے کے بعد بھی عوام کی دلچسپی اردو میں برقرار رہی۔ اردو کے شیدائی شعروخن کے علاوہ نشر کے میدان میں بھی گامزن ہوئے۔

آزادی کے بعد ایک طویل وقت تک کوٹہ میں ادبی سرگرمیاں خاموش رہیں، لیکن ۱۹۶۰ء کے شاعروں کے ذریعے ادبی محفلیں سجھنے لگیں۔ جس میں باہر سے بڑے شعراً کو مدعو کیا جاتا تھا۔ کوٹہ میں اس وقت اردو ادب کی کم از کم چار پیڑیاں ادبی خدمات میں لگی ہوئی ہے۔ آزادی سے قبل کے ماحول دیکھنے والی آنکھوں میں حاجی ڈم ڈم کوٹوی، روشن کوٹوی اور تو فیق کوٹوی آج بھی لکھ رہے ہیں اور امین نشاطی عزیز مانگروی وغیرہ اس قافلے سے پچھڑ گئے۔

۱۹۷۰ء کے آس پاس اپنی پہچان بنانے والوں میں عقیل شاداب، احتشام اختر ظفر غوری، اور ظفر احمد پرواز کے نام بہت اہم ہیں۔ احتشام اختر جدید اردو نظم کا ایک اہم نام بن کر ابھرے ہیں۔ ان کے تین مجموعہ کلام ”راکھ“، ”نیلا آگاٹش“ اور ”صح کاستارہ“ ان کی تخلیقی قدرت کے روشن ثبوت ہیں۔

عقیل شاداب کوٹہ کے ہی نہیں راجستان کے اردو شاعروں میں سب سے زیادہ شائع ہونے والے شاعر ہیں۔ ان کی آواز اردو شعراً میں الگ پہچان رکھتی ہے۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ”بے آب سمندر“ ہے جو شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ ۳

کوٹہ میں کچھ شعراً ایسے بھی ہیں جو کوٹہ میں پیدا ہوئے تو نہیں لیکن ملازمت کی وجہ سے وہ ایک عرصے سے کوٹہ میں مقیم ہو گئے۔ اور اب کوٹہ ہی ان کا وطن ثانی بن گیا ہے۔ ان شعراً میں بہار صدیقی، فضاجوکالوی، احتشام اختر اور فاروق بخشی کے نام قابل ذکر ہیں۔ بہار صدیقی اور فضاجوکالوی کا شمار جدید شعراً میں تو نہیں کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی وہ اپنی شاعری پر جدیدیت کا لیبل لگانا پسند کرتے ہیں تاہم یہ قابل ذکر بات ہے کہ ان دونوں

شاعروں نے جدیدیت کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا ہے۔ اور کوٹھ کے شاعرانہ مزاج کو بد لئے کی کوشش کی ہے۔ ”۱۳“
چوتھی نسل کے ادباء جن سے بہت امید ہے ان میں نعیم اختر، دانش، فرخ ندیم اور احمد سراج لاکھیری کے
نام قابل ذکر ہیں۔ کوٹھ میں پچھلے دو سو برس سے اردو ادب لکھا جا رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں
بھی اس وراثت کی باگ ڈور سنبھالے گی۔ ۱۵

کوٹھ کی چند اہم تصنیفات و تالیفات

کوٹھ میں اردو کا کوئی بھی پرلیس باقاعدگی سے کبھی نہیں رہا ہے۔ سب سے پہلے نواب فیض علی خاں کے دور
(۱۸۷۴ء) تا ۱۸۷۵ء میں ایک جیل پرلیس قائم ہوا تھا۔ ۱۹۰۲ء صدی کے اختتام میں اردو کا ایک اور پرلیس
قائم ہوا۔ یہ پرلیس پنڈت پرشوم لال سویہ دوچ نے ۱۸۷۹ء میں ولایت سے منگوا کر جھالاواڑ میں قائم کیا تھا۔ جو
۱۸۹۹ء میں کوٹھ پر ننگ پرلیس کے نام سے کوٹھ میں منتقل کیا گیا۔ ۱۶

۱۸۹۶ء میں پنڈت بنواری لعل یتھو پرلیس جھالاواڑ سے کوٹھ لائے، دوسرا یتھو پرلیس برکت علی محافظ
عدالت فوجدار نے قائم کیا جو تجارتی نوعیت کا تھا۔ اور کچھ دن چل کر ختم کر دیا گیا۔ ۱۷
اس کے بعد ابھی تک کوئی اردو پرلیس کوٹھ میں نہیں رہا ہے۔

(۱) ”خارق الاشرار“، ازمولوی فتح اللہ صاحب کوٹھ ریاست کی اول تصنیف تصور کی جاتی ہے۔

(۲) ”جلوه گاہ پیغمبر“، از ثابت لکھنوی، اشاعت ۱۹۰۶ء، میلاد نامہ پرمی ہے۔

(۳) ”حیات دیر“، مصنف: ثابت لکھنوی، اشاعت ۱۹۱۲ء۔ یہ نادر نشری تصنیف بہلی نعمانی کی ”موازنہ
انیں اور دیر“ کے جواب میں لکھی گئی تھی۔

(۴) ”تاریخ راجیہ کوٹھ“، کوٹھ کے ناظم چودھری مول چند کی ضخیم تاریخ ہے۔ شائع: ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ یہ کتاب
کرمل جیمس ٹاؤ کی تاریخ، ٹاؤ راجستان کی غلطیوں کو ظاہر کرتی ہے اور تنقید کے ذریعہ صحیح واقعات بیان کرتی ہے۔ ۱۸

(۵) ”دربار حسین“، از ثابت لکھنوی، اشاعت ۱۹۲۱ء میں اس کتاب میں دیر کے ۵۲ شاگردوں کے حالات اور
۲۷ شاگردوں کی فہرست دی گئی ہے۔

(۶) ”صبر جمیل“، از ثابت لکھنوی، اشاعت: ۱۹۲۲ء مرثیوں، رباعیوں اور سلاموں کا مجموعہ ہے۔

(۷) ”جبات شاد“، از شاد میر ٹھی، اشاعت: ۱۹۲۶ء شاعر کے نعتیہ کلام پر مشتمل ہے۔

(۸) ”میلاد سراج“، ازمولوی سراج احمد سراج، اشاعت: ۱۹۲۹ء

- (۹) ”سہرہ اردو قصاید“، اشاعت: ۱۹۳۰ء مہاراج کنور صاحب کی شادی پر پڑھے گئے کلام کا مجموعہ۔
- (۱۰) ”بقائے سخن“، اشاعت: ۱۹۲۷ء مرتب للتا پرشاد، رام بابو سکسٹن کے اعزاز میں منعقد کئے گئے مشاعرے کی غزلوں کا مجموعہ۔
- (۱۱) یوروپین اور انڈین و یورپین پوٹس آف اردو اینڈ پرشن (انگریزی میں) کوٹھ کے دیوان رام بابو سکسٹن نے ۱۹۳۸ء میں لکھی۔ شائع ۱۹۳۲ء میں ہوئی، تقریباً ۹۸/ یوروپ کے مختلف ملکوں کے شعرا کا انتخاب کلام ہے۔
- (۱۲) ”مخزن اسرارِ معرفت“، از شاد میر ٹھی۔ اشاعت: ۱۹۲۹ء کلام شاد میر ٹھی
- (۱۳) ”نالیہ دخراش“، از شاد میر ٹھی، اشاعت ۱۹۵۵ء (حضرت عباس کا مرثیہ)۔
- (۱۴) ”پنجتھن“، از شاد میر ٹھی، اہل بیت کی منقبت، پانچ نوحیں اور سلاموں پر مشتمل ہے۔ کوٹھ کے سپر ٹنڈ پولس رہے رام داس بھجن نے پنے تجربہ کے بنا پر حسب ذیل کتابیں لکھی اور شائع کرائی ہیں۔ ملازمان پولیس کے لئے مفید ہے۔
۱. آئینہ تفتیش ۲. مخزن سراغ رسانی
 ۳. ٹانٹیاڑا کو کے مختصر حالات ۴. خیانت و دیانت
 ۵. چند رکلا ۶. لندن اور پریس
 ۷. تفتیش زنا بالجبر ۸. سوال و جواب کا سبیلان
- (۱۵) ”سرابوں کے سفیر“، اشاعت ۱۹۷۰ء مریشن: عقیل شاداب، کرشن گوپال دادھیچ، ظفر غوری اور ظفر احمد پرواز تھے۔ گیارہ جدید شعرا پرمنی ایک مجموعہ کلام تھا۔
- (۱۶) ”راکھ“، از احتشام اختر، اشاعت: ۱۹۷۳ء (غزل، نظم پر مشتمل)
- (۱۷) ”نیلا آکاش“، از احتشام اختر، اشاعت: ۱۹۲۳ء (نشری نظموں پر مشتمل)
- (۱۸) ”حسن تغلل“، از فضاض جو کالوی: ۱۹۸۱ء (شعری مجموعہ)
- (۱۹) ”صحیح کاستارہ“، از احتشام اختر، اشاعت: ۱۹۹۰ء (غزلیات پرمنی)
- (۲۰) ”حسن نظر“، از فضاض جو کالوی: ۱۹۹۱ء (شعری مجموعہ)
- (۲۱) ”رموزِ عرفان از فضاض جو کالوی: ۱۹۹۵ء (منظومہ ترجمہ نگاری)
- (۲۲) ”سکون“، اکرام راجستھانی: ۱۹۹۸ء (غزل کا انتخاب)
- (۲۳) ”اضطراب“، از آزاد ارمی: ۱۹۹۹ء (غزلوں کا مجموعہ)

- (۲۴) ”بے آب سمندر“، از عقیل شاداب ۱۹۹۹ء (غزلوں کا مجموعہ)
- (۲۵) ”آباد خرابہ“، از ظفر غوری ۲۰۰۲ء (غزلیات کا مجموعہ)
- (۲۶) ”ماہِ نو“، مرتب: مفتون کوٹوی ۲۰۰۰ء (شعری مجموعہ، ناشر راجستھان اردو اکادمی)
- (۲۷) ”ہسٹری آف اردو لٹریچر“، از رام بابو صاحب سکینہ: تاریخ ادب اردو مترجم مرزا محمد عسکری صاحب
- (۲۸) ”شگوفے“، از حاجی ڈم ڈم کوٹوی ۱۹۹۳ء منتخب کلام
- (۲۹) ”رات ابھی باقی ہے“، از پرشوم یقین ۲۰۰۳ء (غزل، نظم کا مجموعہ)
- (۳۰) ”اداسِ محبوں کے موسم“، ڈاکٹر فاروق بخشی (شعری مجموعہ)
- ان کے علاوہ جو ہندی رسم الخط میں شائع ہوئے ہیں:
- (۱) ”پلکوں کے سائے“، از فاروق بخشی ۱۹۷۶ء (شعری مجموعہ)
- (۲) ”ہم چلے کچھ اور چلے“، از پرشوم یقین ۱۹۹۲ء (غزلیات پرمنی)
- (۳) ”ہم سمندر سمندر گئے“، از شکور انور ۱۹۹۶ء (غزلیات کا مجموعہ)
- (۴) ”خیالات و جمال“، از بشیر احمد توفیق ۱۹۹۶ء (نظموں، غزلوں پر مشتمل)
- (۵) ”جھوٹ بولوں گا نہیں“، از پرشوم یقین ۱۹۹۶ء (غزلیات پرمنی)
- (۶) ”اضطراب“، از چاند شعری: ۱۹۹۹ء (غزلیات کا مجموعہ)
- (۷) ”وہ چاند چہرہ سی لڑکی“، از ڈاکٹر فاروق بخشی (شعری مجموعہ)

کوٹہ کے اردرسائل و جرائد

کوٹہ سے روزانہ اردو اخبار کبھی جاری نہیں ہوا۔ لیکن چند رسائل و جرائد نے کم وقت کے لئے ہی صحیح اردو ادب کی خدمت میں تعاون کیا ہے

- (۱) ”خور بافِ زندگی“، از مولوی سلیمان ۱۹۲۵ء (جلد بند ہو گیا)
- (۲) ”کوٹہ مسلم گذٹ“، از حافظ محمد اسحاق ۱۹۲۷ء (اجازت نہ ملنے کی باعث بند ہو گیا)
- (۳) ”ہر برٹ کا لمحہ میگزین“، نگران حافظ حکمت علی حکمت ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۵ء
- (۴) ”اصفی گذٹ“، از قاضی شجاع الدین احمد ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۷ء

(۵) ”دشاد پندرہ روزہ ادبی مجلہ“ لیتا پرشاد کی ادارت میں اکیم اپریل ۱۹۵۸ء سے تا نومبر ۱۹۵۹ء میں لیتا پرشاد کے انتقال کے ساتھ بند ہو گیا۔

(۶) ”تراش“ ماہنامہ، شادکوٹی کی ادارت میں ۱۹۲۷ء سے ۱۹۶۸ء تک شائع ہوا۔ کوٹھ کے چند اہم مشاعرے، ادارے ارواجمن اردو شعر و ادب کی شمع روشن کرنے میں کوٹھ کے کئی انجمن و ادارے، مشاعرے اور نشتوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ قت اور صفحات کی پابندی کے سبب ہم چند اہم کاہی ذکر رہے ہیں۔ جن کی بدولت کوٹھ کا ادبی ماحول شاداب ہوا۔ مہاراج کنورا اور بھیم سنگھ جی کی شادی پر منعقد مشاعرے:

۱۹۳۴ء میں کوٹھ کے مہاراج بھیم سنگھ کی شادی کے موقع پر عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ بندی اردو اور ہژروتی کے شعرا نے ان کی شان میں قصائد اور سہرے کہے۔ ساتھ ہی ایک مجموعہ بھی شائع کیا۔ ”ان میں شریک اردو شعرا کے کچھ نام یہ ہیں۔ ثابت لکھنؤی، بابو ہر دیال شیدا، بابو جگدش سہائے ماہر، بابو بالمند گبت، منشی موہن لعل بخشی، بابو برج موہن الحقیر، سید پیر عارف پیر، مولوی سراج، عاجزو غیرہ۔ یہ مشاعرہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک درخشان باب ہے جو کوٹھ دربارے منعقد کیا۔“ ۱۹

ہر برٹ کالج کے انیوں ڈنر پر منعقد مشاعرے:

۱۹۰۸ء میں ہر برٹ کالج کے قیام کے بعد سے ہر سال انیوں ڈنر پر طرحی مشاعرہ منعقد کیا جاتا تھا۔ اس کالج کے شعبہ اردو فارسی کے طلباء و طالبات، شعرا اور تعلیمی ادارے مل جوں کر شعر و ادب کی محفیلیں آراستہ کرتے۔ یہ سلسلہ کئی سالوں تک بدستور قائم رہا۔ کوٹھ کی ادبی تاریخ کا یہ ایک اہم باب ثابت ہوا۔

بزم ادب کوٹھ:

۱۹۳۴ء میں ثابت لکھنؤی نے اس بزم کی بنیاد رکھی۔ اس بزم کا اول کام ادب کی خدمت کرتے ہوئے ماہنہ نشستیں منعقد کرتا رہا ہے۔ یہ بزم ابتداء سے لے کر آج تک ادب کی خدمت میں مصروف ہے۔

”کوٹھ میں اردو ادب کی فروغ میں ”بزم ادب“ کے تعاون کو نہیں بھلا کیا جا سکتا۔ اس بزم کے زیر اہتمام بڑے بڑے مشاعرے اور سینار ہوئے ہیں۔ مگر ایک عرصے سے یہ انجمن اب خاموش ہے۔ علاوہ ازیں ”بزم سخن“ اور کئی دوسرے انجمن بھی ہیں جو خاموشی سے اپنا کام کر رہی ہیں۔“ ۲۰

بھارتیہ و سینیٹی کوٹھ

۱۹۳۶ء میں اس کا وجود عمل میں آیا۔ اردو زبان و ادب کے قدر دان ما سٹر ہنومان پرشاد کا نام اس سینیٹی کے بیان اگزاروں میں شمار ہے۔ اور یہ سینیٹی ادب کے ساتھ ساتھ اردو نغمہ سنجیدوں کی محفلیں بھی آ راستہ کرتی رہی ہے۔ ان محفلوں میں کوٹھ کے تمام شعراء اور مولوی ثابت لکھنؤ اپنے شاگردوں کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔
مشاعرہ ریلوے اسٹی ٹیوٹ، کوٹھ:-

مارچ ۱۹۴۰ء کو ریاست کے ہائی کورٹ کے نجی رہے اور بعد میں ریاست کے دیوان ہوئے۔ جناب رام با بو سکسینہ کے اعزاز میں مشاعرہ منعقد کیا گیا جو کافی مقبول ہوا۔
میلہ دشہرہ کے موقع پر ہونے والے مشاعرے:-

نیشنل لیول کا درجہ حاصل کر چکا کوٹھ کا دشہرہ میلہ پورے شہر میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ اس میلے میں روز نئے نئے پروگرام رکھے جاتے ہیں۔ کوئی سمنیں، مشاعرے، قولیاں، شام غزل اور فلمی کلا کاروں کا شرکت کرنا وغیرہ۔

یوں تو مختلف ثقافتی پروگرام منعقد کرنے کا سلسلہ ۱۹۵۲ء سے شروع ہوا ہے۔ لیکن پہلا مشاعرہ رنگ منچ پر ۱۹۵۳ء میں منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کی صدارت للتا پرشاد شادانے کی تھی۔ راجستان کے مختلف ریاستوں سے شعراء نے شرکت کی۔ ۲۱

نگر پالیکا کے روپ نیوشعبہ سے تعلق رکھنے والے کرشن گوپال دادھیچ ایڈ و کیٹ کی کوششوں اور کاوشوں کی بدولت ہی میلے میں ادبی پروگرام منعقد کئے جانے لگے۔ مشاعروں کی مقبولیت کے زیر اثر نگر نگم آج تک رنگ منچ پر کل ہند مشاعرہ منعقد کرتا ہے۔ تقریباً ۳۰ رسالوں تک کرشن گوپال دادھیچ اور عقیل شادا ب صاحب اس مشاعرے کے روح روائی ہیں۔

جدید شعر و ادب سینما را اور کل ہند مشاعرہ:-

۱۹۷۸ء میں دوروزہ پروگرام، سینما را اور مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے ہر خطہ سے شاعر اور ادیب آئے تھے۔ ادبی سمجھا کے تحت عمل میں آیا یہ پروگرام دو دن تک امید کلب نیا پورہ کے ہال میں سینما را اور سینما پوزیم اور کوٹھ اسٹیڈیم میں عظم الشان، مشاعرہ انعقاد کیا گیا۔ اس میں شرکیں شرکاء کے چند نام یہ ہیں: کمار پاشی، بالی، بکل، بشیر بدر، انور، خلیل تنویر، شاہد، باقر مہدی، راشد، ندا، وغیرہ۔ مشہور اور معروف شعراء تھے۔ ان کے

سرپرستوں میں کلدیب شریو استو، اونکار لعل چوہان، ظفر غوری، ظفر احمد پرواز اور کنویزوں میں عقیل شاداب تھے۔ کوٹھے میں اردو شعرو شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۱۹ء میں صدی کے آخر میں ہوتا ہے۔ جو موجودہ دور تک مسلسل قائم ہے۔ تب سے لے کر اب تک اردو شعر و سخن میں مصروف ان شعرا کا ذکر کرتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے کلام و شعری مصروفیات سے کوٹھے کی سرز میں کومنور کیا ہے۔

دور اول (۱۸۸۲ء تا ۱۹۵۰ء) چند شعرا

ثابت لکھنؤی :- ۱۹۶۲ء میں لکھنؤ میں تولد ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت حاصل کر اپنے نانا پیر محمد رضا ظہیر (جو دبیر کے شاگرد تھے) سے شاگردی اختیار کی اور شاعری کا سفر شروع کیا۔ ۱۸۸۲ء میں یگانہ روزگار شخصیت مولوی سید افضل حسین ثابت لکھنؤی کوٹھے تشریف لائے اور عدالت عالیہ میں ملازمت اختیار کی۔ بعد میں رٹائر ہو کر وکالت کی اور آخرش ۱۹۲۱ء میں ۷۸ رسال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اور آخری ارامگاہ کا شرف کوٹھے کی سرز میں کو بخشنا۔ ۲۲

”یہ بڑے ہی عالم و فاضل اور قادر الکلام شاعر تھے۔ غزل اور مرثیہ میں پُد طولی حاصل تھا۔ تمام شعری اصناف میں ”حیات دبیر“ جو شبلی نعمانی کی ”موازنہ انیس و دبیر“ کے جواب میں لکھی گئی تھی، یہ ایک نادر تصنیف ہے۔ ۳۳
ثابت لکھنؤی کو مرثیہ، غزل، نظم، سلام، رباعی، قطعات، منقبت اور نعت ہر صنف میں مہارت حاصل تھی۔

رباعی

کم ظرف امیری میں بدل جاتے ہیں
اپنے بھی فقیری میں بدل جاتے ہیں
بناتے ہیں دانت اور آنکھیں بوڑھے
اعضا بھی تو پیری میں بدل جاتے ہیں

سمیل امر وہی:- نام مظہر الہادی اور تخلص سمیل۔ قریب قریب ۱۹۷۰ء میں امر وہہ میں پیدا ہوئے۔ تلاش معاش کے سلسلے میں کوٹھے آئے اور نیو ہائی اسکول رامپورہ میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اردو، فارسی اور انگریزی پر دسترس تھی۔ کوٹھے کے کئی شاعروں نے ان سے استفادہ کیا۔ بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کا شمار کوٹھے کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔

حافظ حکمت علی حکمت:- والد کا نام پیر عارف علی عارف، عربی، فارسی اور انگریزی کے عالم تھے۔ ظفریہ و مزاجیہ

شاعری کرتے تھے۔ ہر بڑ کالج میں استاد تھے۔ کالج میگزین میں بھی اردو کے حصہ کے نگران تھے، ان کی شاگردی میں بہت سوں کوشعری ذوق حاصل ہوا۔ پاکستان میں انتقال فرمایا۔

کاکا پرشاد شاد: - نام کا کاپر شاد، اردو میں شاد اور فارسی میں حزیں تخلص تھا۔ والد کا نام گلزار علی، ۱۹۶۰ء میں بریلی میں کائنٹھ کے گھر پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی اور انگریزی کے ماہر تھے۔ قادر الکلام شاعر تھے۔ اردو اور فارسی اشعار کہے ہیں۔ قدیم رنگِ سخن کے پیرو تھے کلام میں پختگی و شکفتگی تھی۔

شاائق: - نام ماسٹر ہرنارائے تخلص شاائق، ہر بڑ کالج کوٹھ میں مدرس تھے۔ بھارتیہ دیوبندی کوٹھ سے بھی منسلک تھے۔ کلام سادہ سلیس ہے۔

کہا میں نے کہ عرصے سے تمہاری جستجو میں ہوں

تو بولے دل میں ڈھونڈو ہم وہاں رہتے ہیں مدت سے

عبدالستار عبد: - پیدائش ۱۸۷۵ء کو کوٹھ میں ہوئی۔ علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں مختار سرشنہ کی ملازمت اختیار کی۔ شو خیانہ مزاج کے مالک تھے بہترین اشعار کہے ہیں

حضرت ناصح سمجھ پر آپ کے پتھر پڑیں

ہم تو دیوانے ہیں، دیوانوں کو سمجھانے لگے

عبداللطیف لطیف کوٹھی: - پیدائش ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔ عربی، فارسی اور اردو کے تعلیم یافتہ تھے۔ شعری ابتداء میں اپنے کلام پر عبد کوٹھی اور محمود عالم سے اصلاح لیتے تھے۔ زیادہ تر غزل، نعت و حمد کہیں ہیں۔

مرتے مرتے لطیف کے منہ سے

نام نکلے نبی کا یا تیرا !

مشتی محمود عالم قیصری: - سری لنکا کے شہر سر آنڈلیب میں تولد ہوئے۔ اردو، فارسی میں دسترس اور عربی میں مہارت حاصل تھی۔ کلام پر اصلاح پہلے مولوی مظہر الہبادی سہیل بعد میں عبد الوحید نیرنگ کا کوری جھالا واڑی سے ملی۔ خود کو داغ دہلوی کا شاگرد تصور کرتے اور کلام میں بھی داغ دہلوی کے اثرات موجود تھے۔ غزلوں کا مجموعہ ”خیابان سخن“، اور ایک نایاب نسخہ فرہنگ مصادیر اردو، اور حدیث کی کتاب بھی مرتب کی۔ لیکن تنگ دستی کے سبب کوئی بھی کتاب شائع نہ ہو سکی۔

بعد دفن نعش میری قبر پر رکھنا ضرور

ان کا سنگ آستان میرے سرہانے کے لئے

پیر عارف علی پیر:- باہر سے کوٹھ کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ شاعری کا شوق تھا، طبیعت میں شوخی تھی۔ غزل کہتے تھے، کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا،۔ بے عمر ۸۰ رسالہ انتقال ہو۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

ذکورہ بالاشعرا کے علاوہ دیگر شعرا بھی قابل ذکر ہیں۔ میر محمد حسین ثاقب، پرکاش چاند مظفر نگری، بابو ہیر اعل سودشیدا، شیخ قربان علی حرماں، وکیل ریاض الحسن ریاض، موہن لعل الحق، بابو عبد القادر ندا، مرزا عباس بیگ مرزا، قاضی امراء علی، مولوی فضل احمد صفحی، سید نور الحسن انور، مشی چندی سہائے سخن، لالہ شنکر لعل بے عقل، مشی اشرقی، مشی بالکند گپت، مشی مکٹ نرائن انسپکٹر، ممتاز علی بیکل، ماسٹر محمد اسحاق اسحاق، بابو فرید الدن فرید، مقبول عالم سرنشستہ دار وغیرہ۔

دور ثانی: (۱۹۵۰ء تا ۱۹۸۰ء)

دوسرے دور کے ممتاز شعرا کا ذکر درج ذیل ہے۔ اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔ محمد محروح، عبدالعزیز ات تملکین، للتا پرشاد شاد، مولوی سراج، لعل محمد جوہر، سراج رحمانی، نور محمد قیس کوٹھی، راغب کوٹھی، چاند مظفر نگری، مفتون کوٹھی اور ملا رحمت کوٹھی۔

لعل محمد جوہر کوٹھی:- والد کا نام شکور محمد تھا۔ شاعری کے فن میں نکھار مغل اجمیری کی محبت سے آیا۔ شعر و ادب کی خدمت کر کوٹھی کی علمی فضا میں قابل قدراً صاف کیا۔ انتقال ۱۹۹۰ء میں کوٹھی میں ہوا۔

تمکین کوٹھی:- نام عبدالعزیز تخلص تمکین، والد کا نام عبد الرحمن، پیدائش ۱۹۰۱ء کوٹھی میں ہوئی۔ عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم مظہر الہادی سے حاصل کی۔ کلاسیکل و روایتی شاعری میں مہارت حاصل تھی۔

نمونہ کلام:-

ہزاروں ظلم و ستم ہوں مگر رہیں خاموش
ہمیں تو حکم نہیں ہے زبان ہلانے کا
سوالِ وصل پڑ جھڑک کے کہتے ہیں
کہ ذکر کچھ تجھے اس کے سوانحیں آتا

پرکاش چاند مظفر نگری:- ستمبر ۱۹۱۲ء میں بمقام مظفر نگری میں پیدا ہوئے۔ مشی نذر الحسن نظیر کھاتوی سے تلمیز اختیار کیا۔ وہی سے ۱۹۳۷ء میں ”صح وطن“ کے نام سے رسالہ جاری کیا۔ ۱۹۵۲ء میں کوٹھی آئے اور بزم ادب کی بنیاد قائم کی اور صدر بھی رہے۔ غزل کے علاوہ قطعات رباعیات اور نظمیں لکھتے ہیں۔ زبان پر قدرت اور بیان پر مہارت حاصل ہے۔ رنگِ تغزل بختہ اور مذاقِ سخن شستہ ہے۔ ” ۲۲

یہ ہو اے چانداب کوئی قیامت خیز ہنگامہ
ادھر نظریں حسین ان کی ادھر ہے دل جو اپنا
مولوی سراج کوٹوی:- نام عبد الرشید، والد کا نام عبد الرحمن تھا۔ ابتداء میں وحشی اور بعد میں سرتاج رحمانی تخلص رکھا۔
ثابت لکھنؤی سے شاگردی اختیار کی۔ متعدد اصنافِ سخن سلام، غزل، نظم، قطعات، رباعی میں نام پیدا کیا۔ فلموں
میں گیت بھی لکھے۔

دل تیرے عشووں میں غمزوں میں اشاروں میں رہا
ایک بندہ سیکڑوں پروردگار میں رہا

مشی للتا پرشاد شاد:- میرٹھ میں ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام مشی جنگ بہادر جنگ، غالب، حالی اور داغ
وغیرہ سے مراسم تھے۔ اردو، فارسی پر عبور تھا۔ اور شاعری سے گھر اگاؤ تھا۔ اس لئے شعر و سخن کی بزمیں میں شریک
ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ شاد بھی بچپن سے ہی جایا کرتے تھے۔ اس لئے ذوق پیدا ہوا اور اونکل عمر ہی سے شعر
کہنے لگے۔ پھر جب تعلیم کے بعد فکر معاشر ہوئی۔ ”اخبار عام“ لاہور ”دشاد“ میرٹھ اور ”راجپوتانہ گذٹ“
کی ادارت کے فرائض بھی انجام دئے۔ کچھ عرصے سرکاری ملازمت بھی کی مگر ۱۹۱۶ء میں ”نانا“ کو پریش تحریک کے
لئے کانگریس کی صدارت پر ملازمت چھوڑ دی۔ لیکن دوبارہ ملازم ہو کر ۱۹۲۵ء میں ریلوے کے خزانچی کے عہدے
سے رٹائر ہوئے۔ ۲۵

بزم ادب کی صدارت بھی کی۔ غزل، مرثیہ، سلام، نعت، نوحہ، قطعہ اور رباعی پر عبور حاصل تھا۔ صوفیانہ شخصیت کے
مالک رہے۔ انتقال ۱۹۵۹ء کو کوٹھ میں ہوا۔

تعجب ہے کہ تم نے شاد کو اب تک نہ پہچانا
مسلمانوں میں ہندو، ہندوؤں میں مسلمان تھا
محروم کوٹوی:- اصل نام محمد بخش، تخلص محروم ہے۔ قرآن حافظ، زندہ دل شخص تھے۔ کوئی کتاب شائع نہیں
ہوئی۔ کوٹھ میں انتقال ہوا۔

پرده میرانہ کبھی بزم حسیناں میں رہا

جونہ اندرھا ہوا افسوس و نقصان میں رہا

مفتوح کوٹوی:- نام غلام معین الدین تاریخی نام کی مناسبت سے بالکل درست ہے ان کے بزرگوں کا وطن ریاست

کوٹھے ہے۔ ان کے والد کا نام محمد رحیم بخش تھا جو کہ ملکہ پوس سے وابستہ تھے۔ ان کے والد ایک مذہبی، نیک طبیعت صالح بزرگ تھے۔ جس کے سبب محلہ والے والوں نے اپنی مسجد کا منظم اور امام مقرر کر دیا تھا۔ اس طرح مفتون کوٹھی صاحب کی تربیت بڑے خلوص کے ساتھ مذہبی رنگ میں ہوئی۔ جس کے اثرات مفتون کوٹھی کی شخصیت اور شاعر پر عمر کی آخری لمحوں تک دیکھے گئے۔ ۲۶

آنکھوں نے میری علم کا دریاد دیکھا!

دنیا ہی میں اک نور سراپا دیکھا !!

مفتون مرے استاد وہ گھانسی مُلّا !

انسان کی صورت میں فرشتہ دیکھا !!

”ان کی تعلیم ملاگھاسی کے پاس ہوئی۔ مفتون کوٹھی نے ان سے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اور اسے فیضیاب ہوئے کہ انہوں نے اپنے کلام میں بھی یاد کیا ہے۔“ ۲۷

مفتون کوٹھی کوٹھے کی شعری فضا میں نور کی طرح آئے۔ جس کی علمی روشنی سے کوٹھے کا ادبی ماحول جگمگا اٹھا۔ یہاں کی ادبی فضا کو روشن کرنے کے لئے انہوں نے کئی انجمنوں کی بنیاد رکھی۔ طرحی نشستیں آرائیے کی۔ اور نئے شاعروں کو تربیت کیجئی۔ ثابت لکھنوی کے بعد مفتون کوٹھی کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ ان کا نام کوٹھے کے اہم ترین استاد اداہ شاعروں میں گنا جایگا۔ جو مرکزی شخصیت کے مالک ہیں کوٹھے کے ادبی ماحول اور شعرا پر متعدد مضمومین غیر مطبوعہ تصانیف مثل ”حیاتِ مفتون“ کچھ اپنی شاعری کے متعلق اپنے ہی قلم سے ”میری یک سالہ زندگی“، ”حالات خاندانِ طائی“ اور ”حیاتِ طیبہ“ لکھے ہیں۔ اور تقریباً نظم و نثر پر مبنی پچاس غیر مطبوعہ نسخہ مرتب کئے ہیں۔ انتقال ستمبر ۱۹۸۰ء میں ہوا۔ ۲۸

دوست داری تو بڑی چیز ہے لیکن مفتون

دشمنی بھی تو حریفوں سے بھائی نہ گئی

راغب کوٹھی:- نام احمد حسین صدیقی اور تخلص راغب تھا۔ ۱۹۴۱ء کو کوٹھے میں پیدا ہوئے۔ مڈل تک تعلیم حاصل کی اور شعروشاوری میں اپنارہبر مولوی افضل حسین ثابت لکھنوی کو بنایا۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے۔ مجموعہ کلام ۱۹۸۰ء میں بعنوان ”معراجِ خیال“ پاکستان سے شائع ہوا۔ رنگِ سخن روایتی ہے۔ نعت اور غزل نیز قطعات و ربانیات میں طبع آزمائی کی ہے۔ ۲۹

میرے فسانے میں تم بھی ہو میری ذات بھی ہے
و فوِ غم بھی محبت کی کائنات بھی ہے

دورِ ثانی کے دیگر شعرا کی خدمات اور مصروفیات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان میں چند نام یہ ہیں۔ قیس کوٹوی، جوہر کوٹوی، حافظ نور محمد نور، عبداللہ خاں شید، عبدالعزیزم خاں بکل، پیر عثمانی غنی مائل، محمد اکمل، وکیل احمد حسین جوہر، رضا، منشی علی احمد شمر، ظہیر گلشن آبادی، امیر محمد اختر، خلیل آفریدی وغیرہ۔

دور حاضر: (۱۹۸۰ء تا حال) چند شعرا

ظفر احمد پرواز:- والد کا نام عبد العزیز، پیدائش ۱۹۳۹ء کو باراں میں ہوئی۔ گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا۔ تعلیم ایل۔ ایل۔ بی۔ اور انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ تلمیز توقیق کوٹوی سے حاصل کی۔ عقیل شاداب اور ظفر غوری کے ساتھ مل کر فرسودہ روایت کی مخالفت کی۔ نظم و غزل دونوں کہتے ہیں۔ شعروخن میں جدید عکس نظر آتا ہے۔

”راجستان سماحتہ اکادمی اردو اکیڈمی سے بھی ان کو اعزازات ملے ہیں اور ان کی قدر و منزلت حلقہ علم و ادب میں صرف راجستان میں ہی نہیں بلکہ تمام ملک میں ایک پہچان مانی جاتی رہے گی۔“ ۲۰

ظفر غوری:- نام ظہیر الحق غوری تخلص ظفر غوری، والد کا نام مظہر الحق غوری تھا۔ پیدائش ۱۹۳۶ء کوٹہ میں ہوئی۔ اردو، فارسی پر دسترس تھا۔ انگریزی اور اردو میں ایم۔ اے۔ کیا۔ پیشہ مدرس اختیار کیا۔ نظم، غزل، دوہے اور قطعات کہیں۔ رنگِ سخن جدید اداہ اور فکر عصری تھا۔ ”کوٹہ کی شاعری میں نئے زمانے کی شروعات ان کے اور ان کے احباب سے ہوتی ہے۔ ۲۲ مئی ۱۹۹۵ء کو کوٹہ میں انتقال ہوا۔ ثابت لکھنؤی اور مفتون کوٹوی کے بعد ظفر غوری کوٹہ کے شعری روایت کو نیا موڑ دینے اور ایک بڑے حلقہ کو متأثر کرنے والے منفرد شاعر تھے۔ ۲۱

”ہندوستان کے سبھی بڑے اخبارات و رسائل جیسے ”شبِ خون“،

”شاعر“، ”آج کل“، ”سر سبز“ اور جواز وغیرہ میں خصوصیت سے

شائع ہوتے رہے۔ ایک کتاب ”آباد خرابہ“، ”مجموعہ غزلیات“

راجستان اردو اکادمی نے ۲۰۰۰ء میں شائع کی۔“

مجھ کو اشکوں سے نہ لکھ دل کا دھواں کاغذ پر

نقش بے آب ہوں، جل جل کے نکھرتا جاؤں

ڈم ڈم کوٹوی:- نام محمد بخش، والد کا نام محمد حسین، ولادت ۱۹۱۳ء کو کوٹہ میں ہوئی۔ تلمذ مفتون کوٹوی اور یاسین خاں

نشاط ٹونگی سے رہا۔ شعر و سخن میں دل اور فکار اور اکبرالہ آبادی کے مذاقِ سخن کی جھلکیاں اور طنز و مزاح کا خوبصورت امتراز نظر آتا ہے۔ ڈی۔ وی۔ ریڈ یو اور رسائل سے نثر اشاعت ہوتے رہے ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں راجستان اردو اکادمی سے اعزاز انعام حاصل کیا۔

عشق بھی ہوتا رہے دکان بھی چلتی رہے

وقت ہو ڈم ڈم بسرا آدھا ادھر ادھر

اخت Sham اختر:- نام اخت Sham پاشا، والد کا نام احمد حسین پاشا۔ ولادت ۱۹۲۲ء کو جمیر میں ہوئی۔ مشورہ سخن اپنے ماموں علیم الدین علیمی سے کیا۔ ملازمت ۱۹۷۲ء میں گورنمنٹ کالج کوٹھ میں لیچکر اور پھر صدر شعبہ کے عہدے پر فائز رہے۔ کلام میں دورِ جدید کا اثر واضح نظر آتا ہے۔ نظمیں، غزلیں، مائیں، دوہے، قطعات وغیرہ کہے ہیں۔ ریڈ یو اور ڈی۔ وی۔ سے وابستگی اور مضامین و کلام رسائل و جرائد سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۰ء میں راجستان اردو اکادمی سے سبک سعیدی انعام و اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔

اختر نے غزل اور نثری نظم میں طبع آزمائی کے ہے ان کی شاعری کے اب تک ۳۰ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ”راکھ“ جو غزل اور نثری نظم پر مشتمل ہے یہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ ”نیلا آکا ش“ جو خالص نثری نظم پر مشتمل ہے یہ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ تیسرا مجموعہ ”صحیح کاستارہ“ ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ جو خالص غزلوں پر مشتمل ہے۔ ۳۲

عقلی شاداب:- نام عقلی احمد خاں، والد کا نام منتشری محمد ابراہیم خاں تھا۔ ولادت جون ۱۹۲۵ء کوٹھ میں ہوئی۔ کسی کے تلمیذ نہیں ہوئے۔ شاعری کی ہر صنف نظمیں، غزلیں، قطعہ، رباعی، گیت وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلام پر ہندی اثرات موجود ہے۔ جدید حسیت اور نئے لفظوں سے کلام کو خوبصورت بناتے ہیں۔ فرسودہ روایت کی مخالفت کر ادبی ماحول میں نئی روح پھونکنے میں اہم روول ادا کیا ہے۔ ۱۹۹۲-۹۳ء میں راجستان اردو اکادمی سے اعزاز انعام حاصل کر چکے ہیں۔

روح بھی رفت صلیب پہ ہے

جسم وجہ میں گڑھی ہیں کیلیں بھی

فاروق سخنی:- نام محمد فاروق۔ ولادت ۱۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو میرٹھ میں ہوئی۔ اردو میں ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی۔ کا مقالہ ”ساغر نظامی: حیات اور خدمات“ تھا۔ بشیر بدر سے مشورہ سخن کیا۔ پیشہ درس و تدریس اختیار کیا۔ کلام میں جدید حسیت کی کلام فرمائی نظر آتی ہے۔ کئی عملی اور ادبی انجمنوں سے وابستگی ہے۔ شاعروں میں مقبولیت

حاصل کر چکے ہیں۔ مختلف اسلاف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل سے خاصی رغبت ہے۔ ان کے تین شعری مجموعے ”پکوں کے سائے“، ”ادالمحوں کے موسم“، ”چاند چہرہ تی ایک لڑکی“ (ہندی شائع ہو چکے ہیں۔ تقدیری مضمایں میں ”مفاہیم“، ”ماضی ایک تجرباتی مطالع“، ”سامانی“، ”ساغر نظاہی حیات اور کارنامے“، ”تحقیقی مقالہ“ ۱۹۰۲ء شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے علاوہ ”اردو ادب میں طنز و مزاح“، ”راجستھان میں جدید اردو غزل“، ”اردو ادب آزادی کے بعد“، ”تقدیروتاڑ“، ”زیر طبع ہیں۔ چوتھا شعری مجموعہ ”مجھے گھر یاد آتا ہے۔ ابھی اشاعت کی منزل میں ہیں۔

تقریباً ڈیڑھ درجن سے زیادہ کتابیں مرتب کر چکے ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں راجستھان اردو اکادمی نے اعزاز و انعام سے سرفراز کیا ہے۔

بزم کی اور ہے تہائی کی دنیا کچھ اور
رات بھر و تا دین میں ہنسانے والا

فضا جو کالوی:- نام دوارکا ناٹھ شرما، والد کا نام پنڈت بندرا بن جی، ولادت اسٹمبر ۱۹۱۹ء کو پاکستان میں ہوئی۔ شعری ذوق و شوق طالب علمی سے رہا ہے۔ ملازمت فوج میں اختیار کی۔ ملک کی خدمت پر جوش و خروش سے کیں۔ ملازمت سے سبد و شش ہو کر اردو ادب کی خدمت کی طرف مائل ہوئے۔ ۱۹۷۳ء کو کوٹھ کو اپناوطن ثانی بنایا۔ تلمذ سید مظفر احمد ظفر ہاشمی سے کیا۔ کچھ کلام پر اصلاح ساحر سیال کوئی صاحب سے لی۔ اردو اور فارسی پر عبور حاصل ہے۔ تمام شعری اصناف پر طبع آزمائی کی۔ مثلاً غزل، نظم، قطعہ، رباعی، مثنوی، گیت وغیرہ کوئہ کے سب سے بزرگ شاعر ہیں۔ اپنے اصولوں کے پابند، مزاج میں سادگی، زبان سادہ اور سلیس ہے۔

مختلف رسائل و جرائد سے کلام مضمون شائع ہوتے رہتے ہیں۔ صدر جمہوریت سے اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ راجستھان اردو اکادمی سے ۱۹۱۹ء کے چاند بھاری لال جبایا کا انعام و اعزاز سے نوازے گئے۔ کلام پیش خدمت ہے:

شاعری کیا ہے فقط وہم و گماں کا اک بجوم
ہاں چلن، مسلک مصنف کا بتاتا ہے کلام

فرخ ندیم:- والد کا نام عقیل شاداب، پیدائش ۹ نومبر ۱۹۶۳ء کو اپنے نانا کے گھر علی گڑھ میں ہوئی۔ علمی و ادبی گھرانے کے فرد ہیں اور گھر کا ماحول ہمیشہ سے ہی شاعری کے لئے خوش گوار رہا۔ تعلیم ۱۹۹۰ء میں گورنمنٹ کالج

کوٹھ سے اردو میں امتیازی حیثیت سے ایم۔ اے۔ کیا۔ پیشہ درس و تدریس اختیار کیا۔ بغیر کسی تلمذ کے اپنے ذوق و شوق کی ہی رہنمائی کی۔ غزل، نظم اور گیت کہتے ہیں۔ نشر و اشاعت سے بھی تعلق رکھا ہے۔

مجھے منزل تک پہچا کروہ منزل سے پلٹ آیا

سفر کا کس قدر شوقيں میرا ہم سفر نکلا

پرشوم یقین:- نام پرشوم سورن کار، والد کا نام شنگر لال سورن، ولادت ۱۹۵۴ء کو کروی میں ہوئی۔ کسی سے اصلاح نہیں لی۔ موسیقی سے لگاؤ ہے۔ ہاڑوتی ہندی اور اردو میں شاعری کرتے ہیں۔ غزل سے خاص رغبت ہے۔ زبان لغت آمیز ہے کلام میں ثقل الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ عوامی مسائل اور جدید دور کی اجھنوں کو اپنے کلام کا موضوع بنانے لیتے ہیں۔ نمونہ کلام:

ہائے کیوں ظاہر کیا میں نے میرے غم کا سب
خیریت جو پوچھتے تھے اب خفا ہونے لگے

کنور جاوید:- نام کنور جاوید بدایونی، والد کا نام عادل صدیقی، ولادت ۱۹۶۲ء میں یو۔ پی۔ میں ہوئی۔ تعلیم ایل۔ ایل۔ بی۔ اور اردو میں ایم۔ اے۔ کیا بغیر کسی تلمذ کے اپنے ذوق و شوق کی ہی رہنمائی قبول کی۔ غزل قطعات اور گیت لکھے ہیں۔ مشاعروں اور کوئی سمیلنوں میں مقبولیت حاصل ہو چکی ہے کئی اخباروں اور انجمنوں سے بھی ویسٹگی رہی ہے۔ عصری حالات پر کلام کہنے پر عبور حاصل ہے۔ انعام و اعزاز سے بخشے جا چکے ہیں۔

شعر:

پڑے پڑے یہاں سب سوکھ کر ہوئے پیلے
ہری ردا سے ڈھکا یہ مزار کس کا ہے

روشن کوٹوی:- نام اسحاق محمد، والد کا نام لعل محمد جو ہر کوٹوی تھا۔ ولادت ۱۹۲۸ء کوٹھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم (زمہبی اور اردو) اور شعری ذوق و شوق، تربیت و اصلاح والد سے ہی حاصل کیا۔ زندگی بھرنکا حنہیں کیا۔ حسن و عشق کے خوبصورت اشعار کہتے ہیں۔ ”اردو کی زندہ روایت کے شاعر ہیں۔ ان کی گنتی اب استاد شاعروں میں ہوتی ہے۔ نوآموز شعرا کی تربیت و رہبری کرتے ہیں۔ معشوقة غزل کے قتيل ہیں۔ راجستان اردو اکادمی نے

۲۰۰۲ء کا قمر واحدی انعام و اعزاز جشن ہے۔
 سخت مشکل ہے آج کل روشن
 دوستوں سے نباه ہو جائے

شکور انور:- نام عبد الشکور انصاری، والد کا نام چھوٹے خان انصاری، ولادت ۱۹۵۲ء میں کوٹھ میں ہوئی۔ پیشہ مدرس اختیار کیا۔ کسی سے تلمذ نہیں۔ نظم و غزل دونوں کہی ہیں۔ لیکن غزل سے دلی رغبت ہے۔ جدید شعری روایت سے قریب ہیں۔ رسائل نی۔ وی۔ اور یڈیو سے نشر اشاعت ہوتے رہتے ہیں۔

عمر کوٹھی:- نام عمر قریشی، تخلص سَعْمَرَ کوٹھی، والد کا نام نیلم خاں تھا۔ ۱۹۲۸ء کو کوٹھ میں پیدا ہوئے۔ مفتول صاحب، عرشی اجھیری اور نشاط ٹونگی جیسے استادوں سے مشورہ سخن کیا۔ رنگ سخن روایتی صرف غزل کہتے ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں شہید ہوئے۔

اس دور کے مذکورہ بالاشعرا کے علاوہ دیگر شعرا کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ لیکن سب کا ذکر ممکن نہ ہونے کے سبب ان کے نام ہی دئے جا رہے ہیں۔ آزاد ارمی، الرام راجستھانی، محمد سلیمان رہبر، لطفی کوٹھی، توفیق کوٹھی، لطیف کوٹھی، گوہر کوٹھی، بہار صدیقی، عزیز مانگروٹی، شبیر بارانوئی، جگمال سنگھ جاوید، جلال تو قیر، بشیر احمد توفیق، وید پرکاش، اکھلیش احمد، روف اختر، امین اثر، ابن رضا، عبدال الحمید حیراں، داش، راہی ٹونگی، جبار راءی، عبد الطیف سرور، شاہد پٹھان، چاند شعری، امیر صابر، فاروق انجینئر، بشیر احمد لطفی، سعید محوی، مضطرب صدیقی، شمار احمد، ستار ندیم اور محمد یقین الدین یقین وغیرہ۔ ان شعرا ہیں جو عقیل شاداب کے ہم عصر شعرا میں ان کا تفصیلی ذکر باب سوم میں کیا گیا ہے۔

کوٹھ کا یہ ادبی ماحول تھا جس کے نسب و فراز سے گزر کر اردو زبان و ادب ترقی کرتا رہا اور اس ماحول میں عقیل شاداب نے اردو کے محافظ کے طور پر اس کی سرپرستی کی۔ اور بڑے ہی خلوص اور لگن کے ساتھ اس کی خدمت کی۔ راجستھان کے اردو ادب کی تاریخ میں اور خاص طور پر کوٹھ کی تاریخ میں نئی نسل کے لئے راستہ روشن کرتی رہے گی۔



حوالا جات

(باب اول)

نمبر شمارہ	نام کتاب رسالہ	صفہ نمبر سن اشاعت	مصنف / مرتب
۱.	مولوی سلیم الدین سلیم بے پوری	۵۵۵ء	ڈاکٹر حسن آراء
۲.	وقایع راجستھان	۱۵۸	
۳.	ماہنامہ زمانہ کانپور	۲۸۶ دسمبر ۱۹۲۳ء	
۴.	تلاندہ غالب	۷۳	مالک رام
۵.	مولوی سلیم الدین سلیم بے پوری	۹ ۵۵۵ء	ڈاکٹر حسن آراء
۶.	راجستھان میں اردو زبان و ادب	۲۵۵	ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی
۷.	راجستھان میں اردو زبان و ادب	۲۵۵	ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی
۸.	مفہیم	۹۵ ۲۰۰۲ء	ڈاکٹر فاروق بخشی
۹.	مفہیم	۹۶ ۲۰۰۲ء	ڈاکٹر فاروق بخشی
۱۰.	تذکرہ شعرائے کوٹہ	۳۵ ۲۰۰۱ء	عقلیل شاداب
۱۱.	مفہیم	۹۶ ۲۰۰۲ء	ڈاکٹر فاروق بخشی
۱۲.	تذکرہ شعرائے کوٹہ	۲۶ ۲۰۰۱ء	عقلیل شاداب
۱۳.	مفہیم	۹۷ ۲۰۰۲ء	ڈاکٹر فاروق بخشی
۱۴.	اندازِ نظر	۷۱ ۲۰۱۰ء	احتشام اختر
۱۵.	مفہیم	۹۷ ۲۰۰۲ء	ڈاکٹر فاروق بخشی
۱۶.	راجستھان میں اردو نشر کی ایک صدی	۱۰۲ ۲۰۰۹ء	ڈاکٹر قمر جہاں بیگم
۱۷.	تذکرہ شعرائے کوٹہ	۳۱ ۲۰۱۰ء	عقلیل شاداب
۱۸.	راجستھان میں اردو زبان و ادب	۲۵۶	ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی
۱۹.	تذکرہ شعرائے کوٹہ	۳۸-۲۷ ۲۰۰۱ء	عقلیل شاداب

نمبر شمارہ	نام کتاب/رسالہ	مصنف/مرتب	صفہ نمبر سن اشاعت
۲۰.	مفاہیم	ڈاکٹر فاروق بخشی	۹۶ ۲۰۰۳ء
۲۱.	تذکرہ شعرائے کوٹھہ	عقلیل شاداب	۲۹ ۲۰۰۴ء
۲۲.	راجستھان میں اردو نشر کی ایک صدی	ڈاکٹر قمر جہاں بیگم	۱۰۳ ۲۰۰۹ء
۲۳.	تذکرہ شعرائے کوٹھہ	عقلیل شاداب	۳۶ ۲۰۰۵ء
۲۴.	راجستھان میں اردو زبان و ادب	ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی	۲۲۲
۲۵.	راجستھان میں اردو زبان و ادب	ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی	۲۵۸-۲۵۹
۲۶.	تو فیق کوٹھی کی حیات اور شعری خدمات	نیلوفر اکرم	۳۶ ۲۰۰۹ء
۲۷.	تو فیق کوٹھی کی حیات اور شعری خدمات	نیلوفر اکرم	۳۸ ۲۰۰۹ء
۲۸.	فضا جو کالوی فن اور شخصیت	آمنہ خاتون	۲۲ ۲۰۱۰ء
۲۹.	تذکرہ شعرائے کوٹھہ	عقلیل شاداب	۳۱ ۲۰۱۰ء
۳۰.	ظفر غوری شخصیت شعری خدمات اور انتخاب کلام	عبدالحفیظ	۹۶ ۲۰۱۰ء
۳۱.	تذکرہ شعرائے کوٹھہ	عقلیل شاداب	۳۲ ۲۰۱۰ء
۳۲.	ظفر غوری شخصیت شعری خدمات	عبدالحفیظ	۱۰۵ ۲۰۱۰ء

▪▪▪

باب دوم

عقلیل شاداپ کی شخصیت اور کارنامے

عقلیل شاداب کی شخصیت اور کارنامے

عقلیل احمد خاں نام، ادبی دنیا میں عقلیل شاداب کے نام نامی سے مشہور ہوئے۔ ۱۰ اگر جون ۱۹۳۵ء کو اپنے آبائی مکان محلہ برج راج پورہ، کوٹھ میں پیدا ہوئے۔ عموماً بیماریوں میں متبلار ہے، گھر میں دولت کی ریل پیل تھی نوکر چاکر کی افرات تھی۔ والد کا نام ابراہیم خاں تھا کو کوٹھ ریاست کی عدالت میں مقدمات کی پیروی کرتے تھے۔ ان کے پاس مذہبی علمی و ادبی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ انہیں اپنے پیشے کے علاوہ کتابوں کے مطالعہ کا بھی شوق تھا۔ گھر میں علمی اور ادبی ماحول تھا، والدہ صاحب کا اسم شریف گل بی بی تھا جو افغانی پٹھانوں کے ایک معزز خاندان کی فرد تھیں۔ گل بی بی صاحبہ کی سب سے بڑی بیٹی خوشندی بیگم ہے ان سے چھوٹے عقلیل شاداب اور ان کے چھوٹے بھائی شکیل احمد ہے جو اس وقت امریکہ میں مقیم ہے۔ بنیادی طور پر گھر والوں کا اردو ادب سے گھرہ رشتہ تھا۔ ایسے ماحول میں پروش پا کر عقلیل شاداب کا شعروادب کی طرف رجحان ہوا۔ ان کی شخصیت میں ماں کی محبت، نرم مزاجی اور بابا پ کی سختی اور اصول پسندی کا امتزاج ہمیشہ موجود رہا۔

عقلیل شاداب جو اسکول جانے لائق ہوئے تو انہیں اردو میڈیم اسکول کی جگہ ہندی میڈیم اسکول سے تعلیم دلانے کا آغاز کیا۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ آنے والا زمانہ ہندی کا زمانہ ہو گا کیوں کہ اس زمانہ میں ہندی کا رواج تھا۔ وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے بچوں کو ہندی کے ذریعہ تعلیم دلانے کی طرف متوجہ کیا۔ عقلیل شاداب نے ۱۹۵۲ء میں ہائی اسکول سے امتحان پاس کیا اور بعد ازاں اپنے بھائیوں اور باقی خاندان کی طرح اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ چکے گئے۔ علی گڑھ جانے سے قبل تقریباً ۱۹۵۱ء سے ہی شعرو شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی پہلی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

کروں کیا میری بر بادی کا سامان ہوتی جاتی ہے

پریشاں اور وہ زلف پریشاں ہوتی جاتی ہے

۱۹۵۱ء کے قریب، ہی انہوں اپنی پہلی نظم لکھی جس کا عنوان ”پہلی نظم“ تھا۔ اس نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

ایک دن اک دوست کا میں کر رہا تھا انتظار

آپ کی جانب اٹھی نظریں میری دیوانہ وار

چونکہ عقلیل شاداب نے اسکول میں ہندی میڈیم سے تعلیم حاصل کی تھی اس لئے قرآن شریف اور اردو

پڑھانے کے لئے گھر پر ایک استاد کا انتظام کیا گیا رفتہ آپ کار جان اردو تاریخ، مذہب اور شعروادب کی طرف بڑھنے لگا۔ ان کے والد محمد ابراہیم خاں کے پاس کتب و رسائل کا بڑا ذخیرہ تھا جس سے انہوں نے فیض اٹھایا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے ما مول نیاز محمد خاں کی قائم کردہ لائبریری سے بھی فیض اٹھایا۔ لائبریری میں انہوں نے اردو اور اسلامی کتابوں کو کثرت سے پڑھا اس کے علاوہ کل اسکی قدیم شعراء جیسے میر، مومن، غالب، ذوق وغیرہ کا بھی بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ شاعروں کے علاوہ عقیل شاداب کی فکشن سے بھی بے حد دلچسپی رہی۔ چنانچہ ناول اور افسانہ پڑھنا ابتداء سے ہی ان کی عادت تھی۔

۱۹۵۳ء میں عقیل شاداب اعلیٰ حاصل کرنے علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ اور انجینئرنگ کی ڈگری کے حصول کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران عقیل شاداب کے شعری اور ادبی ذوق کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ یوں تو کوئی ہی میں ان کی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا لیکن علی گڑھ کے قیام کے دوران ان کے فکر و فن میں نکھار پیدا ہوا۔ وہاں کی علمی اور ادبی ماحول نے عقیل شاداب کی شخصیت اور ادبی ذوق و شوق کو نکھارنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

عقیل شاداب علی گڑھ کے جن اساتذہ سے متاثر ہوئے ان میں آل احمد سرور، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر خورشید الاسلام، خلیل الرحمن عظیمی، مولانا نصیا الدین بدایوی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر محمد حسن کے نام قابل ذکر ہیں۔

۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر محمد حسن جدید یونیورسٹی ڈرامہ کلب کے (Convener) تھے۔ عقیل شاداب کی صلاحیتوں کے پیش نظر ان کو ڈرامہ کلب کا سیکریٹری بنایا اور ایک ڈرامہ میں جو پرکاش پنڈت کا لکھا ہوا تھا اور جس کا نام ”اخبار کا دفتر“ تھا عقیل شاداب کو اس میں ادا کاری کا بھی موقع ملا اور وہ انعام سے بھی نوازے گئے۔ اسی زمانے میں خلیل الرحمن عظیمی علی گڑھ میں شعروادب کے روح رواں تھے لہذا مشاعروں اور ادبی نشستوں میں عقیل شاداب کی ملاقات ان سے ہوتی رہتی تھی۔ اس لئے انہوں نے خلیل صاحب کا بہت اثر قبول کیا اور شہر یار سے بھی ملاقات رہتی تھی۔

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ عقیل شاداب کی زندگی میں علی گڑھ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ خود عقیل شاداب بھی اس سے متفق ہے۔ ان کی زندگی میں ایک خاص واقع رومنا ہوا جس نے ان کی فکر پر بڑا گہرا اثر ڈالا اپنے زمانے کے جید عالم فارسی، عربی، سنسکرت، ہندی، اردو کے ماہر صوفی مسلک اور ویدانت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد پنڈت حبیب الرحمن شاستری سے ان کی ملاقات ہو گئی اور عقیل شاداب ان کی شخصیت سے کافی متاثر

ہوئے۔ رفتہ رفتہ ان سے عقیل شاداب کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ رابطہ رشتہ میں تبدیل ہو گیا۔ یعنی موصوف کی سب سے چھوٹی صاحبزادی طاہر بیگم سے ان کی شادی ہو گئی جو اعلیٰ درجے کا ذوق اور صلاحیتیں رکھنے والی خاتون تھی۔ پنڈت جبیب الرحمن کی علمیت نے عقیل شاداب کی شخصیت پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اس شادی سے علی گڑھ سے ان کا مستقل رشتہ اور تعلق قائم ہو گیا۔

اتفاقاً اسی زمانے میں ترقی پسند شاعر اور جدید طرز فلکر کا ٹکرائی عروج پر تھا۔ علی گڑھ میں اختر انصاری، خلیل الرحمن اعظمی، خورشید الاسلام، شہریار وغیرہ جو کسی زمانے میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اب ان کا جھکاؤ جدید شاعری کی طرف ہو گیا تھا چونکہ شاداب فطری طور پر اختر انصاری، خلیل الرحمن اعظمی کی طرز فلکر سے اپنے آپ کو زیادہ قریب محسوس کرتے تھے۔ اس کا اثر عقیل شاداب کی شاعری پر بھی پڑا۔ عقیل شاداب نے بھی تنقید اور فرسودگی سے دامن بچاتے ہوئے شاعری کے جدید رحمانات کو اپنی شاعری میں سمودیا ویسے تو ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۵۱ء میں کوٹھی سے شروع ہو چکا تھا آگے چل کر افسانہ نگاری کا شوق بھی پیدا ہوا لیکن ان کی طبیعت شاعری کی طرف زیادہ مائل رہی۔ انہوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی اپنے مطالعہ اور موزوں طبیعت سے اور بغیر کسی رہبری کے شعر و سخن میں اپنانام پیدا کیا۔

اس سلسلے میں اختمام اختر نے اپنے مختصر سے کتابچہ میں عقیل شاداب کی بابت ٹھیک ہی لکھا ہے کہ۔

”فلکوفن کی بابت عقیل شاداب کو بچپن سے ہی ادب سے شغف رہا
اور مطالعہ کا شوق اپنے باپ دادا سے ورشہ میں ملا۔ شروع سے ہندی
میں تعلیم دلوائی گئی اور اردو پڑھنا لکھنا اپنے شوق سے خود سکھا۔ کافی
عرصہ تک ہندی رسم الخط ہی رہا بہت بعد میں اردو میں لکھنا شروع کیا
جو کچھ بھی کیا اپنے بل بوتے پر کیا۔ کسی سے کوئی مدد نہیں لی شاداب
کے کلام میں ہندی کی مٹھاں اور تشبیہ و اشعارات میں ہندی کی
امیزش ہے اس لئے اپنی ایک الگ پہچان جلد ہی بنائی تھی اور اب تو
ان کا لہجہ سب سے الگ اور منفرد ہے جو صاف پہنچانا جاتا ہے۔“

۱۲ ستمبر ۱۹۵۸ء کو عقیل شاداب کے والد محمد ابراہیم خاں صاحب کا انتقال ہو گیا اس وقت وہ ڈپلومہ

انجینر نگ کے دوسرے سال میں تھے اس کے بعد تعلیم آگے جاری نہ رہ سکی۔ عقیل شاداب ۱۹۶۲ء میں آبائی جائداد کے تنازعات کی وجہ سے علی گڑھ سے کوٹہ والپس لوٹ آئے اور وراشت اور جائداد کے جھگڑوں میں الجھ گئے۔ کوٹہ میں رہتے ہوئے ان کے علمی اور ادبی جنون نے انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔

یہاں اتفاق سے ادبی ماحول تھا۔ کوٹہ میں ادبی نشستیں منعقد ہوتی تھیں بزمِ ادب بھارت تیندوسمیتی وغیرہ ایسی تنظیمیں تھیں جو ہندی زبان و ادب کی خدمات کے ساتھ ساتھ اردو سے بھی گہرا تعلق رکھتی تھی۔ ان سب سے علاوہ ظفر غوری، ظفر احمد پرواز، ڈم ڈم کوٹوی، عمر کوٹوی، امین نشاٹی، لطفی کوٹوی، شاد کوٹوی، بہار بدایوی اور مفتون کوٹوی یہ وہ شاعرے ہیں جو کوٹہ اور بیرون کوٹہ میں اپنی پہچان بنائے ہوئے تھے اور بزمِ ادب کے ذریعہ اردو ادب کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس میں ایک اضافہ عقیل شاداب کا بھی ہو گیا۔ ۱۹۶۳ء میں برمکان عقیل شاداب نے مولانا آزاد لاہور بری قائم کی پیشتر رسائل باہر سے منگوائے گئے۔

اس کے علاوہ متعدد سینما اور مشاعرے منعقد کئے گئے جس میں عقیل شاداب بڑھ کر حصہ لیا۔ ان میں دو تقریبات بہت اہم ہیں:

(۱) جشنِ قیس اور ہندی اردو سعکتم مشاعرے - ۱۹۶۵ء

(۲) یوم غالب کی صد سالہ تقریب - ۱۹۶۹ء

یہ تقریبات کوٹہ کی ادبی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ راجستان میں جدیدیت کو فروغ دینے میں عقیل شاداب نے بڑھ کر حصہ لیا اس سلسلہ میں انہوں نے ایک کتاب ”سرابوں کے سفیر“ ۱۹۷۷ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں راجستان کے گیارہ (۱۱) شاعرے کا کلام ہے۔ اس کے علاوہ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں انہوں نے راجستان کے جدید غزل پر ایک سینما اور مشاعرہ کیا جس میں ہندوستان کے تقریباً سب ہی نامور شاعر شریک ہوئے تھے جس میں بکل سعیدی، محمد علوی، مکار پاشی، مخمور سعیدی، راجندر ماتی، باقر مہندی، ندا فاضلی نے شرکت کی تھیں۔ اس طرح راجستان میں جدید شعروادب کی فروغ میں شاداب نے بڑا ہم رول ادا کیا۔ اسی دوران انہیں اکادمی نے ۱۹۹۲-۹۳ء کا ادبی اعزاز و انعام بھی عطا کیا۔ ۱۹۹۳ء میں ایک مختصر سا کتابچہ ”تعارف و انتخاب کلام“، عقیل شاداب، احتشام اختر نے ترتیب دیا اور راجستان اردو اکادمی نے شائع کیا۔ جس میں منتخب غزلیں اور نظمیں ہیں بعد ازاں پہلی مرتب ۱۹۹۹ء میں اپنی غزلوں کا مجموعہ ”بے آب سمندر“ کے نام سے شائع کیا اس میں ان کی ۱۰۲ ارغزیات شامل ہیں۔ یوں تو عقیل شاداب نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کو غزلوں کے سبب زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

اس سلسلے میں خلیل تنوری سہ ماہی رسالہ ”رنگ“ میں لکھتے ہیں کہ :

”عقلیل شاداب کی غزلوں کا مجموعہ“ بے آب سمندر“
 شائع ہوا ہے۔ انہوں نے غزلیں اور نظمیں بھی کہی
 ہیں لیکن ان کے جو ہر بھی غزل میں نمایاں ہوئے
 ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک بے ساختگی ہے،
 دیومالائی اسطور انہوں نے غزلوں میں علامت کے
 طور پر استعمال کیا ہے۔“ ۲

”بے آب سمندر“ کے شائع ہو جانے کے بعد راجستھان اردو اکادمی نے ”تذکرہ شعراء کوٹھ“ ۲۰۰۱ء میں شائع کی۔ یہ عقیل شاداب کی تحقیقی اور نشری کتاب ہے اس کتاب کی ابتداء میں کوٹھ کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے پھر موجودہ دور کے جدید شعراء کا کلام درج ہے۔ ان شعراء میں ابن رضا، امین اختر، احتشام اختر، ظفر احمد پرواز، بشیر احمد، جلال توقیر، فاروق بخشی، محمد شاہد پٹھان، فاروق انجینئر، ڈم ڈم کوٹوی، سعید محی وغیرہ اس کتاب میں ۲۰۰۰ رشراعہ کا ذکر ہے۔

عقیل شاداب کی شعری کاوشوں اور کوششوں نے سب کو متاثر کیا اور کوٹھ میں انہوں نے ظفر غوری، ظفر احمد پرواز، لطفی کوٹوی، راہی ٹونگی وغیرہ احباب سے مل کر جدیدیت کے فروع میں اہم روپ ادا کیا ہے۔ راجستھا کے پس منظر میں جدید شعروادب کے حوالے سے عقیل شاداب کا نام غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔
 بقول خلیل تنوری ۳

”عقلیل شاداب کے شعر کہنے کی رفتار بہت تیز رہی ہے

اور ابھی تھکن کے کوئی آثار نہیں ہے“ ۴

شاداب صاحب بنیادی طور پر جدید ہن رکھتے تھے اور ان کی سرشنست میں نئی بات کرنا نئے رنگ و آہنگ کو اپنانا اور نئی شاعری کا ہم سفر رہنا پسندیدہ تھا لہذا اس کے زیر اثر انہوں نے اپنے شعری سفر کی شروعات کی اس کے لئے انہیں پرانے شعراء سے کئی مرتبہ جدو جہد بھی کرنی پڑی الجھنا پڑا اور نئے راستے کی حفاظت کی پاسداری قائم رکھنے کے لئے جو محنت درکار ہوتی ہے اُسے اپنانا پڑا۔ خصوصاً مفتوق کوٹوی روایتی شاعری کو بے حد پسند کرتے تھے لہذا انہیں شاداب صاحب کی روشن پر زیادہ اعتراض تھا۔ مفتوق کوٹوی صاحب کا بھی ایک اپنا انفرادی حلقة

احباب تھا ان کے ساتھ تمام شعراء شاداب صاحب کی عظمت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کیوں کہ ان کی نظر میں شاداب صاحب کی ایک ڈھنی بغاوت مذہبی روحانیت کے خدرو جے خلاف تھی۔ لیکن جس پر اللہ کا کرم شاملِ حال ہوا اور نیت صاف ہوں تو دنیا کے کسی بھی تخلیق کا روایتی عمل سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ شاداب صاحب نے خود بڑا اعتماد رکھتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا اور کامیابی سے غور و فکر کی نئی نئی منازل طے کرتے رہے۔

عقلی شاداب کے ساتھ خصوصاً ان کے رفقاء کا میں ظفر غوری اور احتشام اختر صاحب کا ذکر بھی ضروری ہے کیوں کہ یہ شاداب صاحب کے اسے ادبی ہم سفر میں جنہوں نے ہمیشہ ان کے ہم قدم رہتے ہوئے حوصلہ افزائی اور تخلیقی صحبتوں سے نوازہ۔ شاداب صاحب ہم اثر شعراء کی نظر میں چائے لیک سے ہٹ کام کرنے والے شاعر ہیں لیکن دراصل وہ اس ازی اور ادبی جدت کو ہر حال میں محفوظ رکھتے ہیں جن کی طرف قدم بڑھانا ہر ایک ادیب اور شاعر کے بوٹے کی بات نہیں۔ یہاں ان کے ہی ایک شعر سے یہ موضوع واضح ہو جاتا ہے۔

روایوں کی لکیروں کو پیٹنے والوں

یہ کائنات عبارت ہے انقلابوں سے

شاداب صاحب یہاں جو کہنا چاہتے ہیں وہ ہر خن فہم کے لئے آسان بات ہے۔ بشرطیکہ ان کا ذہن نئی تبدیلیوں کو قبول کرنے کی ہمت اور صلاحیت رکھتا ہو۔ اکیلے کام کرتے ہوئے انہیں محسوس ہوا کہ اجتماعیت کے بغیر ان کا ڈھنی سفر جاری نہیں رہا پائے گا۔ لہذا اسی خیال کے پیش نظر تقریباً ۱۹۸۴ء میں انہوں نے ”بزمِ ادب“ کی تشکیل کی۔ باقائدگی سے اس میں نشستیں اور ہندی کی گوشہ یا منعقد کرتے رہے۔ اس کام کی تائید میں عقلی شاداب کو نہ صرف اردو شعراء کی حمایت حاصل ہوئی بلکہ ہندی کے ادیب و شاعر بھی بزم سے مسلک ہوئے اور اس بزمِ ادب کے تعلق سے شہر کوٹہ میں ادبی اور شعری اتحاد کی ایک ایسی صحت مند فضا قائم ہوئی کہ جس نے سبھی کو اپنا گروہ دہ کر لیا۔ اور اس طرح بزمِ ادب میں دھیرے دھیرے اپنے قالین کو وسعت عطا کرتے ہوئے شہر میں کئی مشاعرے اور کوئی ستمیں بھی کروایا۔

یہاں جن حضرات کا ذکر شاداب صاحب کے ساتھیوں کے طور پر کرنا ضروری ہے ان میں محترم کرشن گو پال داد پیچ، ظفر غوری، احتشام اختر، کل دیپ شری واسطہ، نا تھوعل جین، پرھلا دکرشن بھار گو وغیرہ اہم ہیں۔ ان تمام حضرات نے مل کر شعرو ادب کی تخلیق اور تفہیم کے تمام مرحلے کئے۔

شاداب صاحب بنیادی طور پر غزل یا نظم کے شاعر ہیں یہ کہنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ کسی تخلیق کا کام کمل تعارف کروانا۔ سوچ کی لامحدود صفتیں تک آتے جاتے رہنا شاداب صاحب کی فطرت ہے۔ لہذا شاعری میں

بھی انہوں نے اپنے اس مزاج کی نمائندگی ہر گام پر بڑی کامیابی سے کی ہے۔ وہ جب لکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کا قلم رُکا وٹوں کو پسند نہیں کرتا بلکہ ایک مخصوص ذہنی تسلسل کے زیر اثر کام کرتے رہنے کا عادی ہے۔ زندگی کے لامحدود امکانات پر ان کا یقین انہی اپنے ہم اثر شعراء میں سب سے منفرد اور ممتاز درجہ عطا کرتا ہے۔ موصوف جہاں موجود ہوتے تھے چاہے سیاسی قالین ہو، سماجی، معاشری یا کسی بھی نوعیت کا اپنی بات اس ترتیب، تہذیب سے ادا کرتے تھے کہ ہر کوئی قائل ہوتا تھا اور اسی موجودہ صلاحیتوں کے سبب بعض منافقین غالباً آپ کی خلافت بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن اسے بے حد فطری مانتے ہوئے شاداب صاحب تادم حیات اپنے ادبی سفر کی تکمیل کے لئے مصروف عمل رہے۔ جدید شاعر ہونے کے باوجود عقیل شاداب کو زبان و مکاں کی قید و بند برداشت نہیں تھی اور جوبات کہتے اجتماعی شعور کے ساتھ کہتے۔ مثلاً

”عشق دنیا میں جس کو کہتے ہیں
یہ بھی اک قسم کی عبادت ہے
روح کو روح کا بلا وہ ہے
جسم کی جسم کی ضرورت ہے“

مشہور و مقبول ہندی گیت کار انڈیور نے ممبئی میں جب شاداب صاحب کا یہ شعر پڑھا تو صرف اسی بنا پر ملاقات کے لئے کوٹہ تشریف لے آئے۔ دو پھر کا وقت شاداب صاحب آرام فرمائے تھے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور سامنے انڈیور پہچان نہیں پائے تو موصوف نے کہا میں انڈیور ہوں تجھ سے ملنے ہی کوٹہ آیا ہوں۔ ان کی مقبولیت سے شاداب صاحب بھی واقف تھے الہذا لمح بھر کے لئے تعجب سے دیکھنے لگے پلٹگ سے اٹھے مصافحہ کیا، گلے لگایا اور بیٹھنے کو درخواست کی۔ انڈیور تشریف فرمائے اپنا تخلیقی مجموعہ شاداب صاحب کی نظر کیا اور عرصے دراز تک گفتگو جاری رہی۔ لوٹنے لگے تو یوں گزار ہوئے کہ آپ ممبئی تشریف لائیں اور فلموں کے لئے لکھیں۔ شاداب صاحب کیوں کہ ادبی اور شعری مالی اعتبار سے کوٹہ میں مطمئن تھے الہذا انڈیور کے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ انڈیور لوٹ تو گئے لیکن بعد میں احساس ہوا کہ ان کے مقبول ترین گیتوں میں شاداب صاحب کی شاعری کا عکس بھی جھلکتا ہے۔

اس طرح اس واقعہ کے حوالے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عقیل شاداب ایک ایسی شخصیت ہیں جنہیں شاعری کے ذریعہ خود کو منوانے، تھوپنے یا ایکسپوزر کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ بلکہ ان کی شاعری ان کی اپنی بنیادی شخصیت کی وہ فطری عکاسی ہے جو شعر میں ڈھل کر خود بخود آپ بیتی اور جگ بیتی کے توازن کو زم کی کیفیت کے ساتھ

حاصل کر لیتی ہے۔ شاداب صاحب مزاج سے بڑے لا ابالی اور لا پرواہ قسم کے شخص نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی چند اندر و فی صلاحیتیں لاشعوری طور پر ان کی شخصیت کی بہترین آئندہ دار ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ صرف آمد کے اشعار ہی پر گزر بسر کر لیتے ہیں۔ انگنت مرتبہ ایسا ہوا جب انہیں اچانک کوئی بھی موضوع دیا گیا اور انہوں نے فوراً اس پر طبع آزمائی کر کے دوسرے کے احساس کی تشكیل اشعار کی صورت میں بڑی کامیابی سے کی اور ایسا اس لئے ممکن ہو پاتا تھا کیوں کہ وہ ایک فطری شاعر تھے۔

جدید اردو شاعری کے بانی نظیراً کبراً آبادی ہیں جو بے حد عام موضوعات سے لے کر بڑی گہری انسانی اور فلسفیانہ مسائل اور حقائق پر بھی بہترین شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ اسی طرح عقیل شاداب کا مزاج بھی ہمارے ملک کی کچی ممٹی کا ہی مزاج ہے جسے وہ شعری قابل میں جس روپ میں چاہیں ڈھال لیتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں :

کچی ممٹی سے جیسی باس آئے
ایسی خوشبو تمہارے پاس آئے
ایسے آتا ہے دل میں تیراغم
جیسے کوٹھے پر دیودا س آئے

مندرجہ بالا اشعار شاداب صاحب کہ نہ صرف شعری پس منظر کی وضاحت کرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ شعر کہنے کی ان کی بے پناہ صلاحیتوں کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص ہیں جو بچپن ہی سے بڑی عجیب و غریب شخصیت کے مالک ہیں۔ بقول شاعر:

”میرے دل کے کسی کونے میں چھوٹا سا کوئی بچہ“

بڑوں کی دلکشی کر دنیا بڑا ہونے سے ڈرتا ہے

مزاج کے اعتبار سے شاداب صاحب اس شعر کے مصدق (عین مطابق) ہیں۔ جب کبھی گفتگو کرے تو ایسا محسوس ہوتا کہ پہلے سے کسی بھی موضوع کے بارے میں سوچ سمجھ کر بولنا ان کی عادت کے خلاف ہے بس بات کرتے ہی اپنی رائے کا اظہر بڑی بے باقی سے کر دیتے اور فیصلہ مجموعی طور پر سُنت اور شریک ہونے والوں پر چھوڑ دیتے۔ اپنے اسی فطری بہاؤ کی وجہ سے کبھی کبھی شاداب صاحب انجانے خطرات کا شکار بھی ہو جاتے تھے۔ اور یہ اس لئے کہ وہ بے حد جذباتی اور سلچھے ہوئے آدمی تھے۔ ان کا یقین زندگی کے لامدد و دامکانات پر اتنا ہی سچا ہے جتنا کہ کسی بھی ایماندار فکار کا ہونا چاہئے۔

ایک مرتبہ ایک نشست میں انہوں نے ہندو ماٹھو لو جی پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی بے باک رائے کا

اظہار کیا۔ تمام لوگ جو اس محفل میں شریک تھے ایک لمحے کے لئے حرمت میں پڑ گئے اور واقعات تشبیش ناک حد تک سنجیدہ ہو گیا۔ اس موقع پر حسن اتفاق سے ان کے چھوٹے بیٹے فرخ ندیم بھی موجود تھے۔ جو انہیں نسبتاً بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ تمام شراکا کو سمجھا بجھا کر فرخ ندیم نے معاملہ رفع دفع کیا۔ یہ واقعہ عقیل شاداب کی شخصی معصومیت کا بڑا اہم ثبوت ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ عقیل شاداب لوگوں کے دلوں کا خیال نہیں رکھتے ہوں لیکن ان کی سوچ کی اجتماعیت اس قدر روئی تھی کہ وہ جس سے ملتے اسے اپنے جیسا اسلامیم کر لیتے اور بے تکلف ہونے میں وقت ضائع کئے بغیر اس کے ہم سفر ہو جاتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ حسن سے ان کا سلوک رہتا وہ ان کو سمجھ پاتا تھا یا نہیں۔ لیکن ایک شاعر میں جن فطری معصومیت کا ہونا سب سے پہلے ضروری ہے وہ ان کے بیہاں بڑی گھرائی تک موجود تھی۔ بے حد ریقیق القلب آدمی تھے اور اپنی شدتِ احساس کا اظہار بھی آنسوؤں کی صورت میں وہ بھی بھی کر دیا کرتے تھے۔ مثلًا ایک جگہ اپنی شخصیت کے اظہار میں وہ خود کہتے ہیں۔

نقیدِ حیات جان سے مہنگی ملی ہمیں
لیکن ہمارے ساتھ سے سستی چلی گئی

ایسا لگتا ہے کہ جیسے سنبھل کر چلنے کی عادت سی ان کو چڑھتی۔ اور جن لوگوں سے وہ واسطہ رکھتے تھے یا گھلتے ملتے یا بات کرتے تھے ان سے بھی وہ یہی توقع رکھتے تھے کہ جب وہ ملیں تو مکمل طور پر ملیں۔ بقول بشیر بدر:

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا
اگر گلنہیں ملنا تو ہاتھ بھی نہ ملا

عقیل شاداب مندرجہ بالا شعر کے تاثر کو پوری زندگی میں بڑی سچائی سے جیتے رہے اور اپنے جذبہ و احساسات کو اسی سچائی اور ایمانداری سے اپنے اشعار کی زبان بھی عطا کرتے رہے۔ اس طرح شاداب کی شخصیت ہمارے لئے ایک ایسی (Idial) شخصیت ہو جاتی ہے جو زندہ رہنے کے لئے کافی حد تک ضروری ہے۔

شاداب صاحب کی زندگی میں ان کی شریک حیات محترمہ طاہرہ بیگم صاحبہ کا بڑا اہم روں رہا ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ بھی تقریباً انہیں کی طرح بے حد حساس فطرت اور صاف گو خاتون تھیں اور شعر و ادب کے فطری تقاضوں سے خاندانی طور پر روشناں تھیں۔ کیوں کہ ان کے والدِ محترم بھی ایک معروف اعلیٰ ادبی شخصیت تھے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جانہ ہو گا کہ علی گڑھ میں اپنی زندگی میں اپنے ہم اثرادیبوں میں یہ سب سے منفرد اور ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ محترمہ طاہرہ بیگم میں بھی ان کے مزاج کا عکس بد رجہ اتم موجود تھا۔ شاداب زیادہ تر شعر کہنے کے بعد سب سے پہلے اس پر مشورہ جن سے کرتے تھے وہ شخصیت محترمہ طاہرہ بیگم ہی تھیں۔ جو با توں ہی با توں

میں شاداب کی شعری اصلاح کا ذریعہ بھی بن جاتی تھی۔ اکثر و پیشتر لوگ خصوصاً ادیب و شاعر جب شاداب سے گفتگو کرتے اور طاہرہ نیگم بھی وہاں موجود رہتی تو اولین وہ موصوف کی صلاحیتوں کی تعریف کرتے اور ان کے حوالے ہی سے شاداب صاحب تک پہنچ پاتے۔ بڑی ہی آسانی سے کوئی بھی شعر موضوع کر لیتی اور شعر کہہ دیتیں۔ لیکن اس خاموش مجاہد نے اپنی تمام تر خوبیوں کا استعمال شاداب صاحب کی ذہنی ادبی اور شعری جلا کے لئے کیا اور ان کے وجود میں اس طرح زم ہو گئی جیسے دریا میں لہریں۔

عقلیل شاداب نہ صرف یہ کئی فکر کے شاعر تھے بلکہ اپنے علاوہ دوسروں کے مزاج کو پہنچانے کی صلاحیتیں بھی ان میں خوب تھیں اس کا ثبوت ان کی ایک ادبی تخلیق ”تذکرہ شعراء کوٹہ“ سے بھی ملتا ہے۔ جس میں نہ صرف انہوں نے اپنے ہم اثر شعراء کے کلام کا ذکر کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ مختلف شاعروں کی مختلف سیرتوں کا ذکر بھی بڑے گہرے نفسیاتی مطالعے کے ساتھ کیا ہے۔ زندگی میں چلتے رہنے کی ان کی عادت فائدے نقصان سے اوپر کی سوچ مسلسل برسرے عمل رہنے کی فطرت ان کے اشعار میں جا بجا ظاہر ہوتی ہے۔ کہتے ہیں۔

متاع و مال نہ دے دولتِ بتاہی دے
مجھے بھی مملکتِ غم کی بادشاہی دے

یہاں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شاداب صاحب میں زندگی کے ہر جذبے سے مسلسل محفوظ ہونے کی صلاحیتیں موجود تھیں اور اپنے غم کو بھی آفاتی بنا دینا ان کے لئے بڑا آسان عمل تھا۔ شاعری پڑھنے کے بعد ایسا لگ سکتا ہے کہ کبھی شاداب صاحب معموم شخصیت ہیں اور سبھی مسرور۔ لیکن ان سے ملنے کے بعد انہیں جانے سمجھنے اور پہچاننے کے بعد یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ کسی ایک جذبہ فکر کے غلام نہیں تھے بلکہ مسلسل جاری رہنے والے انسانی سفر کو کامیابی اور کامرانی سے جینے کی بہترین صلاحیتیں ان میں موجود تھیں۔ اسی لئے جہاں بیٹھتے اٹھتے، ملتے جلتے ملاقات کرتے یادگار لمحات چھوڑ جاتے۔

شاداب صاحب کے ضمن میں یہ جاننا بے حد ضروری ہے کہ ان کا جڑا اپنے مذہبی اور تہذیبی معاشرے سے کس قدر اور کیسا تھا لگتا تو یہی ہے کہ عقلیل شاداب ایک بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اہل ایمان بھی تھے ان کا یہ قربان کے ہی ایک شعر کے ذریعہ واضح ہوتا ہے۔

”ہم اپنے عہد میں جتنے فضول بن کے رہے

یہودیوں میں خدا کے رسول بن کے رہے“

یہاں شاداب صاحب ایک مسلمان ہوتے ہوئے بھی مذہبی اعتبار سے مخصوص قسم کی تنہائی کا شکار ہیں اور

اس ہم جیت شعر کو لکھنے پر مجبور ہیں کیوں کہ ہمیں واضح ہے کہ یہودیوں کا کوئی رسول نہیں۔ شعر اس لئے اور ضائقہ دار ہو جاتا ہے کہ یہاں شادا بَ اگر غیر مطمئن ہیں تو انی طرف سے ہیں یا معاشرے کے طرف سے۔ تضاد ان کے یہاں ہے یا مشاعرے میں یہ نقطہ واضح نہیں ہوتا اور یہیں اس شعر کی حسنِ خوبی ہے کہ یہ قاری کو ایک پُرا صرار دعوتِ فکر عطا کرتا ہے اور مذہبی اعتبار سے فرد واحد کو اپنے نفسیاتی تجزیہ پر مجبور کر دیتا ہے کیفیت بالکل اس طرح ہے جو غالبَ کے یہاں موجود ہے۔

”خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا،“

عقلی شادا بَ کا یہ نیشنر بھی جگر کے پار نہیں ہے بلکہ ایک ایسے اضطراب کو جنم دیتا ہے جو ہمارے معاشرے کو اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑا کر دیتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ منصف ہے وہ ہی مجرم بھی ہے یہ انہیں کو طے کرنا ہے کہ وہ کیا ہے۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن کے اعتبار سے یہ ہماری گنگا جنی تہذیب پر بھی بڑا حملہ ہے کیوں کہ اگر اس تہذیب کی بنیاد کو سچائی مانتے ہیں تو مذہبی جڑاً اوسے رشتہ کمزور ہوتا ہے اور مذہبی شناخت کو مستحکم مانتے ہیں تو تہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوٹا ہوا نظر آتا ہے۔ شادا بَ کے علاوہ شاید ہی کسی ہم عصر شاعر نے اس فکری تضاد کو اس موثر طریقے سے پیش کیا ہو۔ مزاج کے اعتبار سے شادا بَ صاحب قلندر نماں ہیں۔ زیر پرست نہیں یہ ان کے ادبی شعور کی جلا میں بڑا کارگر پہلو ہے کیوں کہ جدیدیت کے حوالے سے زندگی کے جس سفر کے نئے پن کی تلقین شادا بَ اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ نام نہاد جدیدیت ان کے یہاں منہدم ہوتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔ کیوں کہ ایک شاعر ایسا تخلیق کا رہتا ہے جو زندگی کو اپنے فن میں یا ہتر میں زندگی ہی لکھتا ہے نہ کہ ان کے بناؤں اور غیر ضروری تقاضوں کا ذکر کرتا ہے جن کا زندگی کی اصلیت سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

سچائی تو یہی ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کے لئے کسی بھی انسان جا جڑاً اور پوری دنیا سے ہونا اشد ضروری ہے۔ اور اس کے لئے یہ عمل لیتی ہے کہ اسے اپنے ماحول سے ربط و ضبط قائم رکھانا ہوتا ہے اور ماحول بھی بھی کسی مخصوص طرزِ فکر کا غلام نہیں ہوتا۔ شادا بَ نے اس سچائی کو بڑی ایمانداری سے تسلیم کیا ہے کہ وہ کس گروہ کے شاعر نہیں۔ بقول ان کے :

”جدیدیت کا میرے ذہن پہ بخار نہیں،“

یہاں عقلی شادا بَ نے نئے پن کو جس سچائی سے معتوف کر دیا ہے وہ ادبی گروہ بندی کے خلاف بڑی سلبجھی ہوئی اور سچی ذہنی بغاوت ہے۔ کیوں کہ جسے ہم نیا مانتے ہیں اور منوانے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل نیا ہی ہے اس کا کوئی مستحکم ثبوت ہمارے پاس کبھی بھی موجود نہیں ہوتا ایک کار ٹونسٹ کے پیشہ مار کہتے ہیں:

کچھ نیا کرنے کی کوشش میں پُرانے ہو گئے

بال چاندی ہو گئے بچ سیانے ہو گئے

عقل شاداب کی طرزِ زندگی مکمل طور پر جینا تھا کسی نام نہاد جدت کا شکار ہو کر اپنی شخصیت کو محدود کرنا نہیں۔ اس لئے شروعاتی دور میں تو انہوں نے بھی یہ تسلیم کر لیا تھا کہ وہ جدید شاعر ہیں یا اس زمرے (Catagary) کے حصار میں آتے ہیں لیکن لکھتے لکھتے انہیں یہ احساس ہوا کہ اچھا ادیب اور شاعر عہد ساز تو ہو سکتا ہے لیکن وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ماضی لکھ رہا ہے، حال لکھ رہا ہے یا مستقبل سے دوچار ہے۔ بلکہ اسے یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ شعروادب کی تخلیق زمان و مکان کی حدود سے باہر کی چیزیں ہیں اس لئے وہ یہ سمجھ گئے کہ وہ ایک شاعر ہیں نہ کوئی تاریخ زگار جیسے نئے پُرانے کی پرواہ کرنی ہو۔

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ شاداب صاحب فی البدیع بھی کہتے تھے اور آمد کے شعر بھی نظر کرتے تھے۔ دسترس انہیں غزل میں حامل تھی تقریباً اتنا ہی قابو ان کا نظم پر بھی تھا۔ مثلاً ایک فلشن میں اپنے احباب کی فرمائش پر انہوں نے ایک نظم لکھی جس کا عنوان ”نیا ایتھاں“ ہے یہاں نظم کا سلسلہ کہتا ہے کہ شاعر موضوعاتی اعتبار سے بھی جس موضوع کو چاہے اپنے شعر کے قالب میں ڈھال سکتا ہے۔ نظم اس طرح ہے :

ایک نئے اتھاں کی بنیاد رکھا ہے ہمیں

ضائقہ اپنے لہو کا آپ چکھنا ہے ہمیں

جان دے کر زندگانی کو پرکھنا ہے ہمیں

آؤں جل کے نئے فرمان ہم جاری کریں

اپنے ہاتھوں اپنے مستقبل کی تیاری کریں

ایک عالم آج ہم سے بسرے پیکار ہے

ہر کنارہ اب ہمارے واسطے مجھد ہمارے ہے

گالیوں کی بارش ہیں وینگہ کی بوچھار ہے

کان اب تک آشنا ہے کرشن کی آواز سے

لڑ رہے ہیں مہابھارت ہم نئے انداز سے

دوستو! اب تو جوانوں کا زمانہ آگیا

سر فروں کا اور دیوانوں کا زمانہ آگیا
فرق لٹ جائے گا ہر انسان کا انسان سے
ایک نیا سورج اُگے گا خاکے ہندوستان سے

شاداب صاحب کے زمانے میں اس طرح کی نظموں کو جدید تخلیقی عمل کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات قبل ذکر ہے کہ واقعی شاعر زندگی کی تبدیلی کی بات تو کر رہا ہے لیکن اس کی سوچ میں یہاں اپنے ذاتی ہم اثر شعراء کی طرح خواہش مرغ کی قتوطیت قطعی موجود نہیں۔ اس لئے شاداب کو جدید شاعر کی جگہ اگر انقلابی اور رومانی شاعر کے طور پر سمجھا جائے تو شاید ان تک پہنچنے میں ہمیں آسانی ہوگی۔ انقلاب کا تعرف با آسانی کروایا جاسکتا ہے کیوں کہ انقلاب کے معنی تبدیلی کے ہیں اور تبدیلیاں تو زندگی میں آتی رہتی ہیں اور رومان ایک ایسا جذبہ زندگی ہے جو دنیا سے محظوظ ہونے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ لہذا شاداب جب بھی شعر کہتے ہیں ان کے غموں میں بھی مسکراہٹ کی کوئی نہ کوئی جھلک کہیں نہ کہیں دکھائی دے ہی جاتی ہے اگر ان کی کچھ گنی چنی تخلیقات کو چھوڑ دے تو وہ مکمل زندگی کے شاعر ہیں۔ جو اپنے فن کے حوالے سے ہستے، روتنے، مسکراتے اور قہقہے لگاتے ہوئے ہر لمحہ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھتے ہیں کیوں کہ اکتاہٹ سے انہیں چڑھ ہے۔ لہذا لچپسی کا کوئی نہ کوئی پہلو زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ سے وہ نکال ہی لیتے ہیں۔ اور اس طرح ایک فنکار کی ذمہ داری کو ادا کرنے کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ادیب و شاعر زندگی کو سمجھنے سمجھانے کے اعتبار سے بھی بھی دنیا کے دوسرے تمام لوگوں کے مقابلے میں بہتر طور پر کامیاب رہتے ہیں۔ انہوں نے زندگی میں جو محسوس کیا اسے ہو بہتر یہ بھی کیا۔ ایک اہم ترین نقطہ نظر ان کی شاعری میں یہ کہ وہ کسی گروہ بندی سے منسلک نہیں تھے۔ ان کی تقریباً سبھی غزلیں اور نظمیں یا شعری تخلیقات تھوڑی ہی توجہ کے بعد ہی سمجھ میں آ جاتے ہیں لہذا انہیں اپنے قاری اور سامع کو الجھائے رکھنے کا کوئی شوق نہیں۔ اس لئے شاداب کی شاعری میں سادگی، روانی، بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی لئے ہر عام و خواص اس کو سمجھ بھی لیتا ہے اور قائل بھی ہو جاتا ہے۔

ادب پڑھنا اور ادب لکھنا دونوں الگ الگ نوعیت کے کام ہیں۔ ادب پڑھنے کے بعد اس کی پیروی ادیب کا کام نہیں بلکہ اس سے ہٹ کر اپنا سفر کرنا ہی ایک اچھے اور سچے ادیب کی پہچان ہے اور دنیاوی اعتبار سے تخلیق اسی کو کہا جاتا ہے۔ لہذا شاداب اپنا تخلیقی سفر بڑی کامیابی اور کامرانی سے پورا کرتے ہیں۔ بے جا غالٹی اور پیچیدگیوں میں الجھنا انہیں پسند نہیں بلکہ زبان و خیال دونوں ہی کے حساب سے سلچ کروہ اپنی بات کہتے ہیں اس لئے وہ اپنے عہد میں مشاعروں اور تحریری ادب دونوں ہی اعتبار سے مقبولیت حاصل کر سکے۔

ان کی ایک اہم خصوصیت تھت اللفظ ہے۔ اس لئے ان کی شاعری سننے اور پڑھنے والوں کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ انہوں نے تحریروں میں مختلف رنگ بھرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ ہندی رسم الخط میں بھی شائع ہو رہا ہے جو لوگ اردو تحریر سے ناقف ہیں ان کے لئے یہ مجموعہ مفید ثابت ہو گا۔ ان کی زبان سے ادا ہونے والے لفظوں کا صوتی تاثر بھی قاری اور سامع تک بھرپور انداز سے پہنچتا ہے۔ تھت اللفظ پڑھتے تھے لیکن غنائیت قائم رہتی تھی کیوں کہ الفاظ کے حس سے وہ بخوبی واقف تھے۔ اسی لئے جب انہیں ادا کرتے تو جو تاثر آواز کے اعتبار سے ہم تک پہنچنا چاہئے تھا وہ پوری کامیابی سے رسائی حاصل کرتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کبھی کبھی مترجم پڑھنے والوں کے خلاف ہو جاتے تھے اور بے ساختہ ان کے منہ سے نکل پڑتا تھا کہ یہ تو گلے بازی ہے۔ لیکن کیوں کہ خن فہم تھے لہذا سچ شاعر کے بارے میں جلد ہی تسلیم کر لیتے تھے کہ ترجم الفاظ کا نہیں، گلے کا نہیں، آواز کا نہیں، بلکہ جذبہ و احساس کا ترجمہ ہے جو بے حد فطری اور اصلی ہے پھر ایسے شاعروں کی صحبت میں رہنا پسند فرمایا جو خوبصورت لب و لہجہ کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی ادائیگی میں بھی مترجم تھے مثلاً کیف بھوپالی، اظہر عنایتی، کمار بارابنکوی، فنا نظامی کانپوری، ساغر اعظمی اور فرخ ندیم وغیرہ۔

شاداب صاحب بڑے زندہ دل انسان تھے لہذا ادب کی مقبولیت پر جب بھی ان سے بات ہوتی تو وہ کہتے کہ ادیب اور شاعر کوئی Socialreform یا مصلح نہیں ہے بلکہ وہ صرف اپنے جذبہ و کیفیت کو لفظوں کا روپ عطا کرتا ہے۔ عقیل شاداب کا مطالعہ بے حد و سیع تھا اور جنون کی حد تک وہ پڑھنے کے شوقین تھے۔ ظاہر ہے کہ جو جتنا پڑھتا ہے اتنا ہی لکھ بھی پاتا ہے۔ شاداب ہر طرح کے لٹریچر کا مطالعہ کرتے تھے اور ہر وقت کرتے تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کتابیں پڑھتے پڑھتے ان کی نظر اس قدر بالغ ہو گئی تھی کہ دنیا کو پڑھ لینا بھی ان کے لئے آسان ہو گیا تھا۔ یعنی مطالعہ اور تجربہ دونوں ہی اتنے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں وہ پڑھتے ہیں تجربے کی کسوٹی پر اپنے مطالعہ کو پر کھتے ہیں اور شعر کہتے ہیں۔ اس طرح ان کا ادب تمام نفسیاتی مراحل طے کرنے کے بعد جب وجود کا چولا اختیار کرتا ہے تو سچا اور کامیاب ہو جاتا ہے۔ منتشر ہونے کی ان کی عادت نے انہیں کبھی یکجا نہیں ہونے دیا۔ اور کبھی اگر عارضی طور پر یکجا ہوئے بھی سکون منتشر ہو کر ہی پایا۔ اس کا ثبوت ان کی نظم ”آدمی نما“ سے ملتا ہے۔ نظم ملاحظہ ہوں:-

کارنس ک ایک گوشے سے مسلسل

میرے اپنے دانت مجھ پر ہنس رہے ہیں
میری آنکھیں میز پر رکھی ہوئی ہیں

اور مجھ کو تک رہی ہیں

کان میرے، میرے سر ہانے دھرے ہیں

اور مجھ کو سُن رہے ہیں

ناک پہلے تھی کبھی چہرے کی زینت

اب نہیں ہے

جانے کتنی بارا ب تک کٹ چکی ہے

بال میرے ایک کھونٹی پر طنگے ہیں

فارغ البابی پر میری خندہ زن ہیں

ہاتھ میرے ایک کونے میں کھڑی ہیں

پانو بوسیدہ شکستہ اور تھکن سے چور

دروازے کی چوکھٹ پر پڑے ہیں

وقت ایک دیوار سے چپکا ہوا ہے

اور بے رحمی سے گردش کر رہا ہے

رات کا پچھلا پھر ہے

میں کئی ٹکڑوں میں بت کر رہ گیا ہوں

گویا میں ایک آدمی سے

نخ زدہ بے جان کمرہ بن چکا ہوں

روز مرہ کی طرح سے

صبح سورج

سارے کل پر زے دوبارہ جوڑ دیگا

اور میرے نام کی تختی لگا کر

مجھ کو میرے گھر سے باہر چھوڑ دے گا ۲

یہ نظم نہ صرف عقیل شاداب کی مکمل شخصیت کا احاطہ کرتی ہے بلکہ فرد واحد کے جدوجہد کا تعریف بھی کرواتی

ہے اور تعریف بھی اس اعتبار سے زندگی جمود نہیں ٹھہراؤ نہیں بلکہ ایک انتشار و اضطراب ہے جو ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اور اسی کی سمجھ زندگی ہے اس میں کہیں کوئی وقفہ نہیں کوئی آرام نہیں کوئی پڑا اونہیں بلکہ جہد سے مسلسل ہے جو جاری رہتی ہے اور ہم سے اپنا کام لیتی رہتی ہے۔

عقلی شاداب اس لئے ایک انقلابی شاعر ہیں کہ وہ تبدیلیوں کو نہ صرف جنتے ہیں بلکہ جینا سکھاتے ہیں اور ثابت کر دیتے ہیں کہ زندگی اپنی حرکت ہی سے عبارت ہے۔ غزلوں میں بھی ان کے یہاں انقلاب کا یہی رویہ قائم رہتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

بھنوں سے میرا سفینہ نکلنے والا ہے

ندی کا آج پسینہ نکلنے والا ہے

اب یہاں یہ با آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ ندی کون ہے ہنور کا کردار کیا ہے اور پسینہ کیسے کہتے ہیں۔ عقیل شاداب کے یہاں تازگی پائی جاتی ہے کیوں کہ جتنا ممکن ہوتا ہے لکھنے لکھانے سے نچنے کی کوشش کرتے تھے اور اس طرح اپنی راہ کے خود مسافر ثابت ہوتے ہیں۔ شاداب کی شاعری کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اپنے ملک کے تہذیبی لب و لہجہ کے بڑے کامیاب عکاس ہیں۔ پڑھتے سبھی کچھ ہیں مگر لکھتے اس انداز سے ہیں کہ مٹی کی مہک ان کے کلام میں جا بجا بھر کر مخطوط کرتی ہے اور ان کا لب و لہجہ ان کی ہندوستانیت کو ہر اعتبار سے ثابت کرتا ہے اس کے علاوہ ان کا جڑا اپنی بنیادوں سے اتنا مضبوط اور مربوط ہے کہ ان کی اڑان آسمان کی اونچائیوں کی پرواد کئے بغیر ہر سمت قائم رہتی ہے اس کا ثبوت ان کی غزلوں میں جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ کہتے ہیں:

انگنانی چھپٹا رہی ہے واپس آ

گھر کی چوکھٹ بُلا رہی ہے واپس آ

کپڑے لئے سوکھ رہے ہیں ڈولی پر

دھوپ اکیلی نہا رہی ہے واپس آ

سردوٹے پر کبے ادھ پکھی روٹی

چولہے کا منہ چڑھا رہی ہے واپس آ ۵

مندرجہ بالا غزل ہماری ہندوستانی زندگی کا ایک بے حد سچا جیتا جا گتا اور چہکتا مہکتا منظر نامہ ہے جیسے ہر کوئی اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس طرح جیتا ہے کہ جس طرح شاداب نے اپنی غزل میں جیا ہے۔ کلام کی بے با کی اور

بے ساختگی ان کے مزاج کی فطری آواز کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ شعر کہتے وقت وہ نہ صرف منظرکشی کے اعتبار سے کامیاب ہیں بلکہ جذبہ و احساس کی تکمیل میں بھی کارگر ہیں اس لئے محسوسات کے اعتبار سے بڑے سچ اور سلچھے ہوئے شاعر نظر آتے ہیں۔

الہذا تمام پہلوؤں کے علاوہ عقیل شاداب میں ایک اچھے منتظم کی بھی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ کامیاب نشستیں کرواتے، مشاعرے کرواتے، سینما، سپوزیم کرواتے اور ہر طرح سے ادبی خدمات میں مصروف رہتے ان کے جانے کے بعد سے لے کر اب تک اس کی کو تمام ادبی حلقوں میں محسوس کیا جا رہا ہے۔ کہ اب کوئی ایسا ادبی منتظم موجود نہیں جو اتنے اچھے ناظم کے طور پر کوئی خصوصاً اردو سے مسلک ادبی سرگرمیوں کو بطور رہنمایا اور ہبہ لیڈ کر سکے۔

جیسا کہ ہم سمجھ چکے ہیں شاداب صاحب کا جڑا اپنی تہذیب اپنے کلچر سے بہت گہرا ہے اور ان کی شاعری میں حب الوطنی کا عنصر موجود ہے۔ وہ جس وطن میں رہتے ایک سچے صاحب ایمان کی طرح اس سے محبت کرتے ہیں اور بڑا گہرا جذباتی لگاؤ ان کا اپنے ملک سے ہے جو ان کی تخلیقات میں جا بجا نمایا طور پر نظر آتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ روزگارِ زمانہ بھی کوئی چیز ہے۔ یعنی اس حساب سے وہ غم جانا اور غم زمانہ کو یا غم روزگار کو بڑی خوبی سے مسلک کر دیتے ہیں اور اس خیالی توازن کے ساتھ جب شعر کہتے ہیں تو ان کا جذباتی تاثر پڑھنے اور سننے والے پر بڑا گہرا اثر کرتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

بلا وہ رزق کا برتر ہے ہر تعلق سے

پرندے اپنے نیشن بھی چھوڑ جاتے ہیں

یہ علمیہ ان کے سگے بھائی شکلیل احمد خاں سے جوڑ کر بھی سمجھا جا سکتا ہے جو اس وقت امریکہ میں مقیم ہیں الہذا شاداب کے یہاں یہی قرب اس شعر کے طور پر پڑھنے سننے اور سمجھنے کو ملتا ہے اور یہاں ان کی شاعری علاقائی حدود سے باہر نکل کر عالمی سچائیوں کو قبول کرتی ہے اور اس کا اظہار بڑی ایمانداری سے کرتی ہے۔ الہذا بہ حیثیت مجموعی عقیل شاداب مکمل زندگی کے شاعر ہیں۔ زندگی کے کسی پہلو کو تشنہ چھوڑنا یا اسے قلم کی قید سے آواز رکھنا انہیں پسند نہیں تھا بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنی شاعری کے ذریعہ دنیا کو زندگی سمجھا کر جائے اور اس کو شش میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ ایک سچانہ کار دراصل وہ ہے جو زندگی جیتا ہے اس کو اسی طرح لکھتا ہے۔ عقیل شاداب اس کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ شاداب کی شخصیت کے ساتھ کارنا موں کے ذکر کے تناظر میں ان کی ایک ادبی تالیف جس کا نام ”سرابوں کے سفیر“ ہے بڑا نمایا اور کار آمد کا رنامہ ہے۔ جس کا دیباچہ اپنے عہد کے مقبول ترین

نقاد محترم شمش الرحمن فاروقی نے لکھا ہے اور وہ اس طرح رقم طراز ہیں۔

آنینہ دارِ دش

”شاعری ایک ایسا غیر معمولی فن ہے جس کے مستقبل سے لوگ عموماً مایوس رہا کئے ہیں۔ حال کے شاعر بعد والوں کے مستقبل کو معدوم، ان کی شاعری مشتبہ، اور اگر مشتبہ نہیں تو محرب المعيار گرداتا فریضہ اولین جانتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کوئی دور ایسا نظر نہیں آتا، جب شاعری کا بازار گرم رہا ہوا اور جس میں دوچار غیر معمولی شاعروں اور کم سے کم ایک بڑے شاعر کی دیوقامت پر چھائیاں ماضی سے لے کر مستقبل تک نہ پھیلی رہی ہوں۔ یہ تاریخِ شعر کا ایک دلچسپ مسئلہ ہے لیکن اس کے اسباب و عمل پر بحث کرنے سے کچھ حاصل نہیں، کیونکہ ایسی سچائیاں زبان اور مکان کے قوانین کی پرواہ نہ کرتی ہو، فلسفہ اور نفیات اور تاریخ کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں۔ یہ یقیناً ضروری اور مستحسن ہے کہ ان سچائیوں کو محسوس کیا جائے اور ہم کے ہمہ وقتی وجود کا ذاتی تجربہ کرنے لئے خود کو وقتاً فوقتاً آمادہ کرتے رہیں چنانچہ نیاز فتح پوری کا اظہار تحریک کہ ”اُڑیسہ جیسی سنگلاخ زمین میں احمد نجی کی طرح کا عروج و قافیہ سے لیں، زبان و بیان سے درست اور استوانہ لب و لہجہ سے معمور درخت اُگا،“ کم نہیں اور شاعری کی حقیقت سے بے خبری کے سوا کسی چیز کی دلیل نہیں، شاعر کوئی سلطنت نہیں ہے جو دست بدست آتی ہو (یوں تو سلطنت بھی ہمیشہ دست بدست کھاں آتی ہے وہ تو غالب کا محض ایک انداز تھا) اور نہ اس کے لئے کوئی زمانہ یا جگہ سازگار ہے یا ناسازگار دلتی اور لکھنؤ کے جن ادیبوں اور شاعروں کے بل بوتے پر ہم اردو زبان اور اردو شاعری کے ان دو بڑے مرکز اور ان کے کردار کا

تعین کرتے ہیں، ان میں کوئی آگرہ کا تھا، کوئی فیض آباد کا، کوئی ہریانہ کا، الہڑا اگر آپ اس انتخاب کا دیپاچہ پڑھتے وقت متوقع ہیں کہ میں اس قسم کے معصوم استعجاب کا اظہار کروں گا کہ ہیں! بوندی اور کوٹھ اور اودے پورا اور جدید شاعری؟ تو آپ کو مایوسی ہو گی۔ مجھے اس سے کبھی کوئی غرض نہیں کہ کوئی شاعر کہاں کا رہنے والا ہے۔ میں نہ یک جادہ (Single) ذہن والوں میں ہوں جو شاعری یا جدید شاعری کو چند شہروں یا کسی ایک شہر سے مخصوص سمجھتے ہیں۔ نہ ان جھنڈے بردار نعرہ بازوں میں ہوں جو کسی شاعر کی تعریف کرنے سے پہلے ٹھونک بجا کر دیکھ لیتے ہیں کہ وہ ان کے گاؤں کی بولی بولتا ہے یا نہیں۔ اور نہ ان اکھاڑوں اور شاخاؤں کا رکن ہوں جو صرف اپنی برادری والوں کو شاعر مانتے ہیں۔ شاعر کے سلسلے میں میں نہ جغرافیہ کا قائل ہوں نہ تاریخ کا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شاعری کی سرحد مغل سراۓ اور بکسر کے نقچ میں کہیں ہے جو اس سرحد کے پورب ہے وہ شاعر جو پچھم ہے وہ شاعر نہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ شاعری تو بس ۱۹۱۶ء-۱۹۳۶ء تک ہوئی، اس کے بعد سے بکواس ہو رہی ہے۔

میں صرف شاعری کا قائل ہوں۔ اس لئے آخر شرانی کی شیرہ میں تھڑی ہوئی نظموں کو صرف اس لئے شاعری کا لقب نہیں دے سکتا کہ وہ تاریخی اعتبار سے اہم ہیں۔ تاریخی اہمیت اور شاعرانہ اہمیت ہم معنی یا ہم وقعت سمجھنا ان نیم خواندہ نقادوں کا کام ہے جو ایک طرف توراوت کا ڈھنڈوارا بیٹھتے ہیں اور دوسری طرف الف، ی، ت، رج، ف، کے شاعروں کو مسندِ افراز صرف اس لئے عطا کرتے ہیں کہ انہوں نے تاریخی اعتبار سے کوئی اہم کام کیا تھا۔ تاریخی اہمیت سے انکار کرنا کفر ہے لیکن تاریخی اہمیت اور شاعرانہ اہمیت کو غلط ملط کرنا شرک ہے۔ کافر کی بخشاش ممکن ہے لیکن مشرک کبھی نہ بخشاجائے گا۔ اس لئے جب میں اس انتخاب میں ایسے شعر پڑھتا ہوں،

تو مجھ کو بھولنا چاہے تو بھول سکتا ہے
میں ایک حرفِ تمنا تری کتاب میں ہوں
(خلیل تنوری)

وقت کی گردن کو نیزے پر اچھا لوں
ریگ زاروں میں بھٹکتی چاندی کو مارڈا لوں
(شاہد عزیز)

فاصلوں نے ڈس لیا ہے روح کی آواز کو
خاموشی کے گھاؤ دل میں گھرے ہوتے ہیں بہت
(ظفر غوری)

دھرتی ہلی تو لوگ گھروں سے نکل پڑے
جیسے انہیں گھروں سے کوئی واسطہ نہیں
(عبد الدیب)

نئی نویلی زمینوں کی چاٹ نے مارا
مجھے خود اپنے تحسس کی کاٹ نے مارا
(عقیل شاداب)

محفل میں اس نے ہاتھ ملا یا تو ہے مگر
چہرہ بتا رہا ہے کہ شیشے میں زنگ ہے
(متاز راشد)

تو اس احساس کے باوجود کہ ان میں اور ان کی طرح کے بہت سے
اشعار میں جو اس کتاب کی زینت ہیں کچھ ہم عصروں کا اثر جھلکتا ہے۔
(اسی کی تشریح میں آئیندہ صفحات میں کروں گا) میں خوش ہوتا ہوں
کہ ان شاعروں میں شعر سے ایک غیر مشروط لگاؤ نظر آتا ہے۔ زندگی
کے تجربے سے خوف نہیں، بلکہ دلچسپی جھلکتی ہے۔ اکثر یہ تجربہ شاعری

پرحاوی ہو گیا ہے، لیکن کہیں نہ کہیں شاعری بھی تجویں پرحاوی ہوتی ہے اور وہ سچی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ جسے میں تخلیقی صورتِ حال کہتا ہوں۔ دس بارہ برس کے ادھر ترقی پسندوں کی طرح مجھے شاعری یا ادب میں حمد کا کوئی سکون نہیں ہے۔ نہ میں آج کے اس شکست خور دہ زندگ زدہ، اور حواس باختہ ترقی پسندوں کی طرح ہوں جو اردو کو دیوناگری رسم الخط کا خلعت پاریں پہنا کر بزعمِ خود اس کے بقا کی خمانت لے رہے ہیں لیکن در اصل اس کے پروانہ موت پر دستخط کر رہے ہیں۔ مجھے اس بات پر کوئی شرمندگی نہیں بلکہ فخر ہے کہ زبان میں جو ہے وہ اس قدر اردو ہے کہ دیوناگری میں فب نہیں سکتی مجھے اس پر بھی کوئی خجل نہیں کہ اردو شاعری میں رام، کرشن، راججن اور پرہلاد کا اتنا ذکر نہیں ہے جتنا شیریں مجنوں اور حسین اور رستم کا بھی ہے۔ کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ پنجاب کا مسلمان صوفی ہیرا بخحا کا قصہ پنجابی میں کہتا ہے۔ جائس کا مسلمان عالم پدم ماوت ہندی میں لکھتا ہے، لکھنؤ کا کشمیری بہمن پنج تن کی منقبت اردو میں لکھتا ہے۔ ان باتوں کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ زبان اور تہذیب سے ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اردو جس طرح کے ذہن و تہذیب کا انٹھار کرتی ہے وہ صرف اس لئے اردو نہیں ہے کہ اس میں فارسی کے الفاظ ہیں۔ اور صرف اس لئے ہندوستانی نہیں ہے کہ اس میں کھڑی بولی کے اسماء افعال نہیں۔ اگر صرف چند ناموں کا تذکرہ کسی زبان کو غیر ملکی بنادیتا ہے۔ تو انگریزی سے بڑھ کر غیر انگریزی اور فرانسی سے بڑھ کر غیر فرانسی کوئی زبان نہیں، اگر یونانی اساطیر کا تذکرہ انگریزی کو یونانی کر دیتا تو پوپ کے ترجمہ، الیٹ، کے بارے میں یہ تنقید نہ ہوتی کہ یہ ہومر کی الیٹ، نہیں بلکہ پوپ کی الیٹ، ہے۔ چنانچہ جس سنگھ اور اجیت سنگھ اور سنگرام سنگھ اور مہارانا پرتاپ سنگھ کی زمین سے اٹھنے والے شاعروں سے میں یہ سوال نہیں پوچھتا کہ تمہاری

شاعری میں ان لوگوں کا ذکر کیوں نہیں ہے۔ میں یہ دیکھ کے خوش ہوتا ہوں
کہ اردو شاعری جس تہذیبی ذہن کی تخلیق ہے وہ ان کے یہاں قدم قدم
پر بولتا ہے۔

آئینے لاکھ مگر ایک سی تصویر یہ ہیں
کس کو دیکھوں میں کوئی شکل بدلتا نہیں
(متاز راشد)

چھینٹے پڑیں تو اور بھڑکتی ہے تنگی
میرے وجود میں کسی صحرائی پیاس ہے
(متاز راشد)

تو بدلتے موسموں کا روپ ہے مرے لئے
روز و شب کے آئینوں میں تیری ہی پر چھائیاں
(مخور سعیدی)

ترس رہا ہے زمانے سے یہ دشت پیاسا
کوئی تو ابر کا ٹکڑا یہاں برس جاتا
(فضل الامین)

گویا تھا ایک کانچ کا برتن میرا وجود
ٹکڑا کے پاش پاش ہوا سنگ سخت سے
(عقلیل شاداب)

کل کا تازہ حادثہ ہی زخم جاں عطا کرے
مدّ تین گزر گئی ہیں چشمِ دل کو نم ہوئے
(ظفر غوری)

میں ان شعروں کو پڑھ کر اس لئے خوش ہوتا ہوں کہ یہ اچھے شعر ہیں۔
اور اس لئے بھی کہ انہیں دیونا گری رسم الخط میں کہنا ممکن نہیں تھا اور جب
کہنا ممکن نہیں تھا تو لکھنے کا سوال کہاں اٹھتا ہے۔ میں اس کتاب میں

مندرجہ شاعری میں اقدار کی شکست و ریخت کی لائی ہوئی بے اطمینانی
مشینی دور کے انتشار پر وردہ بے یقینی جدید عہد کے مرگ آمیزہ ذاتے کی
عطای کردہ تلخی وغیرہ کا ذکر نہیں کروں گا۔ ۵۷ دنوں سے یہ فیشن چل پڑا ہے
کہ کسی بھی جدید شاعر یا جدید شاعری کی بات ہو، مطلع اول نہیں ہوتا
ہے کہ بے اطمینانی، بے یقینی، خوف، آرزوئے مرگ، بیزاری، تنہائی
وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان چیزوں کا ذکر اپنے مضامین میں بہت کم کیا
ہے، اس لئے نہیں کہ عناصر نئی شاعری میں نہیں پائے جاتے بلکہ اس وجہ
سے کھپٹ ان عناصر کا وجود یا عناب کسی تحریر کو شاعری بننے کے لئے چند
خصوص شاعرانہ صفات درکار ہے۔ وہ اگر ہیں تو شاعری ہے، ورنہ
نہیں۔ کسی بھی تحریر کی تعین قدر ان صفات کی روشنی میں کی جانی چاہئے جو
اسے شاعری بناتی ہیں۔ بے یقینی، خوف، تنہائی وغیرہ وغیرہ وہ عناصر ہیں
جو بہت سی جدید شاعری میں (بلکہ بہت سی قدیم شاعری میں بھی) نظر
آتے ہیں، لیکن ان عناصر کے بل بوتے پر شاعری کی عمارت نہیں کھڑی
ہوتی، اگر ایسا ہوتا تو ”میں تنہا ہوں، مجھے موت کو خوف ہے“ کی تکرار
کر کے میں ایک اعلیٰ درجہ کی نظم تخلیق کر سکتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں
ہے، افسوس یہ ہے کہ موضوعات کی پسندگی کی بنابر نظم کو پسندیدہ کہنے کی
جور و ایت ترقی پسند نقادوں نے شروع کی تھی، جدید نقادوں کے ذہن کو
بھی دور تک مسموم کر گئی ہے۔ بہر حال میں اس کتاب میں شامل شعراء
سے یہ سوال بھی نہیں کرتا کہ تم نے تنہائی، خوف، سناٹا بے زاری کا ذکر
ان نظموں، غزلوں میں کتنی بار کیا ہے۔؟ یہ سوال میں ضرور پوچھتا ہوں
کہ تم نے شاعری کتنی کی ہے۔؟ اس کے بعد یہ سوال پوچھتا ہوں کہ یہ
شاعری نئی ہے کہ پُرانی۔؟ اس میں آج کا ذہن اور اس کے تجربات
کتنے جھلکتے ہیں۔؟ اور آج کے ذہن اور تجربات کو میں ریلوے ٹرین، بجلی
کی روشنی، تنجیر قمر، کولتا رکی سڑک، دفتر کو جانے والی بے نام بھیڑ کے
ساتھ لازمی طور پر منسلک نہیں کرتا یہ الگ بات ہے کہ جدید شاعروں
کے یہاں ان تجربات کی کثرت ہے لیکن اس کا یہ مطلب نکالنا کہ وہی
شاعری جدید ہے جس میں یہ سب ہو، ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ

چونکہ غالبَ نے رشک کے مضامین کثرت سے باندھے ہیں اس لئے وہی شعر غالبَ کا ہے جس میں رشک کے مضمون ہو یا ہر وہ شعر غالبَ کا ہے جس میں رشک کا مضمون ہے۔ ظاہر ہے کہ نقدِ شعر کا یہ طریقہ نہایت محمل ہے۔ مجھے خوف ہے کہ میری یہ بات سن کر اس کتاب کے مشمولین خفا ہوں گے لیکن حقیقت یہی ہے کہ دو چار نظمیں چھوڑ کر بقیہ سب نظمیں اس قابل نہیں تھی کہ کہیں نما سندہ انتخاب میں جگہ اپائیں۔ غزلیں نسبتاً بہترین۔ اور خلیل الرحمن عظیم کے اس نکتہ کی غمازی کرتی ہے کہ نظم اور خاص کر کے آزاد نظم، غزل کے مقابلے میں مشکل صنف ہے۔ بقول خلیل الرحمن عظیم: ”قافیہ اور ردیف کی برجستگی، زبان کا کوئی پہلو یا مخصوص مشق، مہارت کا اظہار ہی غزل کے شعروں کو رسی طور پر کامیاب بنا سکتا ہے لیکن جدید نظم میں کوئی ایسی دھوکے کی ٹی کام نہیں آتی۔“ چنانچہ اس مجموعہ میں بھی جن شعرا نے اچھی غزلیں کی ہیں، ان کی زیادہ تر نظمیں، غزلوں کے مقابلے میں بالکل نہیں ٹھہر تھیں۔ ممتاز راشد توجہ کو فوراً منعطف کرتے ہیں چونکہ انہوں نے صرف غزلیں کہی ہیں۔ خلیل تنوری کی صرف دو غزلیں ہیں، شاہد عزیز کی ایک بھی نہیں۔ ان دو شعرا نے نظم کو شعوری طور پر اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اور ان کا معیار کتاب کی نظموں کے عام معیار سے بہتر ہے۔ لیکن ترقی پسند اسلوب کی وضاحت، تکرار، غیر جدلیاتی الفاظ کا استعمال، استعارے اور پیکر کی جگہ ”зорِ کلام“ کے حامل الفاظ پر اصرار، یہ مصائب تقریباً تمام نظموں میں کم و بیش نمایاں ہیں۔ شاہد عزیز اور خلیل تنوری کی بعض اچھی نظموں میں (زمِ تمنا، نی زندگی، خودکشی، شاہد عزیز نظم)

لہو کی آواز سوگی ہے: خلیل تنور (خلیل تنور) کے باوجود نظموں کا مجموعی تاثر نثری اور انفرادیت سے عاری ہے۔ نثریت اور وضاحت الزام ان نظموں پر بھی عامد ہوتا ہے جو نسبتاً مختصر یا بہت مختصر ہیں۔ قلم: ابن رفایہ آئینہ: ابن رضا، شہنم: ظفر احمد پرواز، خدا کی موت: عقیل شاداب، وقت:فضل امتنان اور ان پر بھی زر امفصل ہیں غزل تو بذاتِ خود ابہام کی حامل ہوتی ہے اس لئے اس میں شاعر کا ستر ڈھکا رہتا ہے۔ لیکن نظم جو اصلاً ننگی ہے اس کو ابہام کا لباس پہنانا بڑا وقت طلب ہوتا ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں، نظم اصلاً ننگی کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ غزل کی ایک لمبی روایت ہے جس کے زیر اثر اور زیر سایہ غزل کے اسلوب اور الفاظ کی معنویتوں میں از خود اضافہ ہوتا رہا ہے۔ نظم کی روایت بہت مختصر ہے، اور جتنی ہے وہ بھی وضاحت اور تلقین کے ادب کی پروردہ ہے۔ اس لئے جدید نظم کہنا (ابہام جس کی پہلی شرط ہے) جدید غزل کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے۔ ایک بار ایک شاعر نے مجھ سے پوچھا: سُنا ہے آپ نے فلاں شاعر سے کہا کہ آپ کی نظم اچھی تو ہے لیکن جدید نہیں کہوں کہ مبہم نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں جدید کیا ہر طرح کی نظم شاعری بننے کے لئے ابہام کی شرط لگاتا ہوں۔ جس بات کو آپ نظر میں بھلی بھانت کہہ سکتے ہیں اس کے لئے شاعری کا سہارا لینا چہ ضرور!

کتاب میں شامل غزلوں کے بارے میں ایک ہلکا سا اشارہ میں کرچکا ہوں۔ بہت سے شاعروں پر ہم عصر شعراء کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ بعض کے یہاں کئی اثرات کا ٹکراؤ ہے۔ ان میں وہ شاعر زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں جنہوں نے کسی ایسے شاعر سے اثر قبول کیا ہے جس کے اپنے اسلوب میں بھی امکانات موجود ہیں۔

ایسے شعرا کا اثر قبول کرنا اس لئے اچھا ہے کہ اپنے ماؤں کے امکانات کو کھلانا ممکن ہوتا ہے۔ لیکن ایسے شعرا متأثر ہونا جن کا اسلوب چاہے جتنا ہی خوبصورت ہو لیکن امکانات کا حامل نہ ہو، اثر قبول کرنے والے کی رہی سہی تخلیقی قوتوں کو خشک کر دیتا ہے۔ چنانچہ احتشام آخر، بشیر بدر اور محمد علوی کی تقليد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بشیر بدر کا دائرہ عمل خود ہی اتنا محدود اور محمد علوی کا اسلوب اتنا انفرادی ہے کہ ان کی نقل کرنا فضول ہے اس کے برخلاف ممتاز راشد نے بیک وقت ظفر اقبال، شکیب جلالی اور شہر یار کا اثر قبول کیا ہے۔ لہذا ان کا اپنا اسلوب ان تینوں کی یاد دلانے کے باوجود ان کے امکانات کی بھی تقییش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ عقیل شاداب کے یہاں اپنی راہ نکالنے کی کوشش نظر آتی ہے، لیکن ان کا سفرابھی بہت طویل ہے۔ فضل المقتین میں شہزاد احمد کی بازگشت سنائی دیتی ہے، اس لئے برخلاف مخور سعیدی کا لہجہ پختہ اور ماہر انہے۔ اگر انہوں نے کسی شاعر کا واضح اثر قبول نہیں کیا ہے تو ان کا اپنا بھی کوئی منفرد کردار نہیں ہے۔ لیکن سارے مجموعے میں ان کی نظمیں، غزلیں اپنی چاکب دستی اور مہارت کی وجہ سے ممتاز اور مؤثر نظر آتی ہیں۔ عابدادیب پر ظفر اقبال اور شہزاد احمد کا سایہ ہے لیکن ان کے یہاں استحالہ اتنا کامیاب نہیں ہے جتنا ممتاز راشد کے یہاں ہے۔ ظفر غوری کی غزلیں امکانات کے لحاظ سے بہت روشن ہیں لیکن ابھی انہیں زبان پر پورا قابو نہیں ہے۔ مجموعی حیثیت سے سرابوں کے یہ سفیر دراصل نخلستانوں کی مظہر اور آئینہ دار ہیں۔ اب ان میں کتنے پھل میٹھے نکلیں گے اور کتنے درخت دیر تک بھل دیتے رہیں گے۔ اس کا تعین کچھ تو ان لوگوں کی سن کرے گا اور کچھ ان کے سامنے میں پناہ لینے والے جن میں ہم آپ سے زیادہ ہماری آئندہ نسلیں شامل ہیں۔” ۲

اگرچہ عقیل شاداب سائنس کے طالب علم تھے لیکن خدا نے ان کے آب و گل میں شعری خوبیاں تحلیل کر دی تھیں۔

پھر سائنس بھی نیچرل فلسفی کی حامل ہے۔ جو انسان کو سنجیدہ بنادیتی ہے۔ جو انسان سنجیدگی کے اوصاف سے لبریز اور احساس کی شدت سے آگاہ ہو وہ انسان معمولی نہیں۔ غیر معمولی ہوا کرتے ہیں۔ عقیل شاداب بھی کی شخصیت میں بھی یہ عناصر موجود تھے۔“

انتخاب کلام کا امر ایک دشوار مرحلہ ہے لیکن اس میں ذوق کو مشعلے راہ بنانا چاہیے کیوں کہ حسن اور حسن کاری کا معیار مختلف ہوتا ہے آغازِ تذکرے کے مرتب عقیل شاداب سے ہی کرنا بہتر ہو گا۔ ان کے دو مجموعہ کلام ”سرابوں کے سفیر“ (۱۹۷۱ء) اور ”بے آب سمندر“ (۱۹۹۹ء) منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ جدید حیثیت کی تازگی ندرتِ الفاظ اور نادر استعمال ایسی خصوصیات ہیں جو ان کے کلام کے مطالعہ سے فوراً ہن میں آتی ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

خشک ہیں آفیت کی جھلیں بھی
سر پے منڈ راہی ہیں چلیں بھی

زندگی نے بھی مار کھا ہے
وقت نے ڈال دی ہیں نیلیں
بھی

تشنگی بھی گزر گئی حد سے
دستر س میں نہیں سبیلیں بھی

میرے اندر چھپا تھا میر احریف
خود سے ڈرتا نہیں تو کیا کرتا

زندگی کا تھام سماں شاداب

میں جو مرتا نہیں تو کیا کرتا ہے

شاداب صاحب کی ادبی خدمات میں ایک بہت بڑا حصہ ۱۹۷۲ء میں ان کے ذریعہ کروایا ایک ادبی پروگرام ہے جو جید شعر و ادب پر سینما اور کل ہند مشاعرے کے طور پر منعقد کروایا گیا۔ دو روزہ پروگرام سینما اور مشاعرے کا بڑی شان و شوکت سے انعقاد کیا گیا۔ ہر خطے سے شرکت کرنے کے لئے شاعر اور ادیب آئے دو دن تک امید کلب نیا پورہ کے ہال میں سینما اور سپوزیم اور دوسرے دن کوٹہ اسٹیڈیم میں ایک عظیم مشاعرہ ہوا جس میں شراء کے چند نام یہ ہیں۔

محمد الوی، بشیر بدر، محمود سعیدی، کمار پاشی، بانی بکل سعیدی، انور مرازا پوری، کمار بارہ بکنی، خلیل نوری، شاحد عزیز، فضل ایمام، جلال سیوطی، باقر مہدی، ممتاز راشد وغیرہ متعدد معروف مشہور شعراء نے حصہ لیا یہ پروگرام ادبی سمجھا کے ماتحت عمل میں آیا۔ اس کے کنویزوں میں عقیل شاداب اور سرپرستوں میں اونکار لال چوہان کلدیپ شری و استونیز معاوین میں ظفر غوری، ظفر احمد پرواز وغیرہ تھے۔ ایک زخمی، سودنیر ادبی سمجھا کے نام سے مرتب کیا گیا جوار دو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوا اس کے مرتب عقیل شاداب تھے۔ تمام شعراء شہر کے مشہور ہوٹل نورنگ میں ٹھہرائے گئے تھے جو شانتی کمار دھاریوال ہوٹل کے مالک اور معروف سیاست داں نے بلا معاوضہ شعر و ادب کی خدمت کے جذبے کے تحت اس بیش بہا خدمت سے نوازہ۔

عقیل شاداب میں سیاسی سوجھ بوجھ بھی تھی اور قائدانہ صلاحیتیں بھی، مگر ان چیزوں سے انہوں نے ذاتی فائدہ بھی نہیں اٹھایا وہ فی نفسہ خدا انسان اور بڑے باپ کی اولاد تھے، ان کے والد ابراہیم خاں اپنے زمانے کے ایک کامیاب اور آسودہ حال وکیل اور زمیدار بھی تھے۔ چنانچہ عقیل شاداب نے زندگی بھر اردو سے کچھ کمایا نہیں، بلکہ اس کے لئے لاکھوں روپے خرچ بھی کئے۔ البتہ کوٹہ میں اردو کے فروع اور بڑے مشاعرے اور سینما کرانے کے لئے انہوں نے (ذاتی تعلقات کی بنیاد پر) بڑے لوگوں سے کام ضرور لیا۔ یوں تو کوٹہ دشہرہ میں ۱۹۵۳ء سے پابندی کے ساتھ منعقد ہونے والے کل ہند مشاعرے میں عقیل شاداب نے ملک کے بڑے سے بڑے شاعروں کو بلوایا اور بقول ان کے ”وہ اور کرشن گوپال دادھیج تقریباً تین سال تک اس مشاعرے کے روح رواں تھے۔“ ۸

عقیل شاداب کو مطالعہ کا شوق عام شاعروں کی طرح کا نہیں بلکہ محققوں اور فقادوں کی مانند تھا۔ علی گڑھ سے آنے کے بعد سے آخری دم تک شاداب نے دنیاۓ ادب کے بیشتر ادبی رسائل و کتب خرید کر پڑھتے اور اپنی لائبریری کی زینت بناتے رہے۔ ان کے برادر خود شکیل احمد صاحب اور کئی احباب پاکستان (کراچی،

لاہور وغیرہ) میں رہتے ہیں، چنانچہ ان کی معرفت شادا بَ صاحب وہاں کی کتابیں پابندی سے منکوata تر ہے۔ وہ خود بھی ایک بار اپنی اہلیہ اور بیٹی فخر ندیم کے ساتھ پاکستان گئے تھے۔ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں اپنے آبائی مکان میں مولانا آزاد لاہوری قائم کی، جس کا افتتاح جمعیت علمائے ہند کے صدر جناب مولانا عتیق الرحمن عثمانی نے کیا۔ اس لاہوری میں ظفر غوری، ظفر پرواز اور وکیل احمد بخش وغیرہ نے بھی قلب و رسائل فراہم کئے۔ شادا بَ کی رہائش اسی لاہوری سے متصل ایک بیٹھک بھی تھی جہاں ان کے چاروں طرف کتب و رسائل ہوتے تھے۔ اور دو تین لوگوں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ اپنے والد کے زمانے کے اس بڑے مکاں کا ایک ہال نما بڑا کمرہ مولانا آزاد لاہوری کے لئے مخصوص کیا ہے۔ اس میں عقیل شادا بَ کے ذاتی سرمایہ سے خریدی ہوئی لاکھوں روپیوں کی کتب رسائل جمع ہیں۔

عقیل شادا بَ کے حلقة احباب میں مختلف مذاہب، فرقوں اور سیاسی جماعتوں کے لوگ شامل تھے۔ اردو والوں میں کچھ لوگ انکے مخالف (عقیل شادا بَ کے گرم مزاج کے باعث) ضرور ہونگے۔ مگر ہندی حضرات میں ان کا مخالف شاید ہی کوئی رہا ہو۔ ہندی کے بہت سے ادباء و شعراء عقیل شادا بَ کے مخلاص دوست تھے۔ ہندی والے انہیں ہندی کا قدر دان بھی سمجھتے تھے۔ چنانچہ اردو کے پیشتر ادبی پروگراموں کے اہتمام و انعقاد میں ہندی ادب، شعراء اور باحیثیت لوگوں کی شادا بَ صاحب کو پوری معنویت حاصل رہی۔ شادا بَ صاحب مزا جا بھی صلح گل کے امین تھے۔ کسی کی کوئی بات کام یا کوئی تحریر عقیل شادا بَ کو ناگوار گزرتی تو ان کی ناراضگی و برہمی شروع ہو جاتی، مگر پڑھے لکھے لوگوں سے وہ زیادہ دنوں تک ناراض نہیں رہتے تھے، چنانچہ کچھ دنوں (مہینوں) بعد حالات معمول ہو جاتے۔ اس سلسلے میں پیش رفت شادا بَ صاحب کی طرف سے ہوتی تھی۔ کوٹھے میں رہنے والوں کو شادا بَ کے مزاج کا بخوبی اندازہ ہوگا، ڈاکٹر فاروق بخشی بھی شادا بَ صاحب کے مزاج سے واقف ہیں۔ اختشام اختر صاحب پہلے پہل کوٹھا لج میں اردو کے استاد مقرر ہو کر آئے تو عقیل شادا بَ کے یہاں ہی سکونت پذیر ہے۔

شادا بَ صاحب جوڑ توڑ کے آدمی نہیں تھے۔ ایسی باتیں ان کے مزاج کا حصہ نہیں تھیں۔ نہ ہی کبھی بن سکتی تھیں۔ آج کے دور میں کسی بھی شاعر کا اس قدر غیور اور خدا رہونا ظاہر ہے کہ اقتصادی نقطہ نظر سے خسارے کی بات ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں اردو (یادب) سے جتنے بھی (پانچ پچاس ہزار) کمائے ہوئے ہوں گے اس سے کئی زیادہ اپنی ڈاک اور شعروادب کی بزم آرائیوں میں ہی خرچ کر دئے ہوں گے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پر اگنده طبع لوگ

شادا بَ صاحب کل وقت شاعر تھے۔ اردو سے ایسی محبت، کتابوں کا ایسا چرکا، مطالعے کی ایسی دیوانگی

راجستان میں ان کے معاصرین میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ ہندوستان بھر میں بھی شاید بہت کم شعراء کرام کے حصے میں نیعت آتی ہو۔

چھوڑ آیا ہوں اپنے نقشِ قدم
نقشِ ہستی مٹانے نکلا تھا
زندگی کا تھام منا شاداب
میں نہ مرتا تو اور کیا کرتا

میری پر چھائیاں زمین پر ہیں
اور میں آسمان میں رہتا ہوں
تیری چاہت نے برآمد کر لیا
میں پڑا تھا گوشہ نسیاں میں ۹
(شاداب)

عقلیل شاداب تادم حیات لکھتے اور پڑھتے رہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ وہ اپنی کمیوں سے مایوس ہوتے تھے نہ خوبیوں پر بجا فخر کرنے کے لئے رکتے تھے بلکہ مسلسل برسِ عمل رہنا ہی انہوں نے زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ اس لئے ان کا تحریری ادب جو شائع ہو کر کتابی شکل میں ہمارے سامنے آیا وہ تو شایدان کے کل کام کا ادھورا حصہ بھی نہیں ہے کیوں کہ جو شخص صرف اور صرف کام پر یقین رکھے اُسے یہ مہلت کم ہی مل پائی ہے کہ وہ خود کو ٹھہر کر کرے کیوں کہ اسے تو ایسا کرنا بھی وقت کو بر باد کرنا جیسا محسوس ہوتا ہے۔ الہنا شاداب صاحب نے تو پوری زندگی ایک ہی راہ پر بسر کی۔ اور وقتِ رخصت بڑی شان سے دنیا کو خیر باد کہا۔

عقلیل شاداب کو شعر گوئی کے ساتھ ساتھ شعروادب کی محفلیں آراستہ کرنے کا بھی شوق تھا۔ ۱۹۷۴ء میں انہوں نے کوٹہ میں سہ روزہ کل ہند سینما نارا اور مشاعرے میں ہندوستانیے جدید لب ولبج کے پیشتر شعرا، حضرات اور تمام نئے نقاد، مثلاً شمس الرحمن فاروقی، باقر مہدی، وارث علوی کوٹہ آئے۔ کوٹہ دشہرے کا مشاعرہ جواب محلہ سلطخ کا مشاعرہ بھی نہیں رہا، اس زمانے میں برصغیر کے ممتاز شعراء کے ناموں سے جگمگاتا تھا اور ہر شاعر یہاں آنا باعث فخر سمجھتا تھا۔ عام طور پر عقلیل شاداب کے مشورے اس میں شامل رہتے۔
شاداب صاحب سادگی کا مظہر، پر خلوصِ دوست، حساس طبیعت انسان ادبی محفلوں کا ناظم، ثابت قدم،

دھن کا پکا انسان تھے جو اپنے ساتھ ایسی بزمِ انجمان اور شعری مخالفین لے کر چلتے تھے کہ ان کی شخصیت کا اثر اور تربیت سے ایک پورا ہجوم ان کا ہم سفر ہوتا تھا۔

”عقلی شاداب کی زندگی کا سب سے بڑا سرمادہ ان کی اہلیہ طاہرہ بیگم تھی۔ ان کے انتقال کے بعد وہ بھجوں سے گئے تھے ڈھنی رفاقت کا سلسلہ ٹوٹے تو جینا کتنا دو بھر ہو جاتا ہے، یہ بات سب نہیں سمجھ سکتے۔ آخر وہی ہوا، جس کا اندیشہ تھا۔ کیم جنوری ۲۰۱۴ء کی شام کو انہوں نے اس دار فانی سے اچانک کوچ کا اعلان کر دیا۔ وقتِ رخصت بھی یہ محسوس ہوا کہ پھول کی طرح آئے اور خوشبو کی طرح لوٹ گئے اور تخلیق کی طرح زندہ جاویدر ہے۔“

ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا

شہر میں چراغ تھا، نہ رہا ॥

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقلی شاداب نے تازندگی سستی شہرت اور تعصی سیاست سے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔



ختم شد

حوالا جات

(باب دوم)

نمبر شمارہ	نام کتاب / رسالہ	مصنف / مرتب	صفحہ نمبر سے اشاعت
۱.	انتخابِ کلام عقیل شاداب (مونوگراف)	اختشام آخر	۱۹۹۳ء
۲.	رنگ سہ ماہی رسالہ شمارہ (۲۱)	راشد انور راشد	۲۰۰۳ء
۳.	رنگ سہ ماہی رسالہ شمارہ (۲۱)	راشد انور راشد	۲۰۰۳ء
۴.	آدمی نما	عقیل شاداب	۲۰۱۱ء
۵.	بے آب سمندر	عقیل شاداب	۱۹۹۹ء
۶.	سرابوں کے سفیر - آئینہ دارانِ دشت دیباچہ: شمس الرحمن فاروقی	عقیل شاداب، ظفر غوری کرشن گوپال دادھیج	۱۹۷۶ء
۷.	تذکرہ شعرائے کوٹہ	عقیل شاداب	۲۰۰۱ء
۸.	ہماری زبان (رسالہ) اردو ہندی	محمد شاہد پٹھان	ماрچ ۲۰۱۱ء
۹.	ہماری زبان (رسالہ) اردو ہندی	محمد شاہد پٹھان	ماрچ ۲۰۱۱ء
۱۰.	معانی و مطالب	فاروق بخشی	۲۰۱۲ء
۱۱.	معانی و مطالب	فاروق بخشی	۲۰۱۲ء



باب سوم

عقلیل شاداب کے ہم عصر شعراء

عقلیل شاداَب کے ہم عصر شعراء

عقلیل شاداَب یوں تو اپنے عہد میں بلاشبہ ممتاز شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا طرزِ تحریر نے پن سے عبارت ہے اور لب و لہجہ بھی ہم عصر شعراء سے مختلف اور بہتر ہے۔ لہذا انکے ساتھ ان کے ہم عصر شعراء کا تذکرہ بڑی احتیاط کا مستحق ہے۔ عقلیل شاداَب عہدے ساز شاعر ہیں ان کے لئے تعداد کے لحاظ سے زیادہ تر شعراء ان ہی کے مزاج کے ہیں۔ یعنی جن کا رجحان پرانی شاعری کے مقابلے میں نبنتائی شاعری کی طرف ہے جیسا کہ شاداَب ذکر کرتے ہیں کہ ان کے عہد کے استاد شاعروں میں ان کے علاوہ پیش منظر میں ثابت لکھنوی اور مفتون کوٹوی کے نام خاص طور قابل ذکر ہیں۔ ان کے کئی تلامذہ بھی ہیں اور بعد کے شاعروں میں کیوں کہ شاداَب نے اپنے عہد کی ادبی فضا کو تبدیل کر دیا تھا لہذا ان کے خصوصی ہم عصر شعراً مخمور سعیدی، س۔ ک۔ نظام، ظفر غوری، ظفر احمد پرواز، مولانا قمر واحدی، ابن رضا، امین عصر، احتشام اختر، فرخ ندیم، روف اختر، آزاد ارمی، اکھلیش انجمن، بہار صدیقی، توفیق کوٹوی، تو قیر اجلال تو قیر، جاوید (جمال سنگھ)، جاوید کنور جاوید، حیراں (عبد الحمید) دوست، یقین (محمد یقین الدین یقین)، شکور انور، ندیم (ستار ندیم)، فاروق بخشی، روشن کوٹوی، توفیق کوٹوی، نیعم اختر داش، احمد سراج فاروقی، صابر کیتھونوی، جبار راہی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں خصوصاً ظفر غوری کا طرزِ اسلوب عقلیل شاداَب ہی کی طرح منفرد قدر ہوں کا حامل ہے۔ فرخ ندیم نے اپنا راستہ بنالیا ہے۔ فاروق بخشی کی تعمیر بھی وجود حاصل کرچکی ہے۔ احتشام اختر کا لب و لہجہ بھی نیا ہے۔ شکور انور کی جھٹپٹا ہٹ بھی منزل کے حصول کی طرف گامز ہے۔ سید محمدی کامل فن ہیں۔ احمد سراج فاروقی کا لب و لہجہ بھی جدت سے نزدیک ہے۔

لہذا ایک فضا عقلیل شاداَب کے ان ہم عصر شعراء میں موجود ہے جو نئے پن کی نشانیوں سے کامیابوں سے اور خوش حالیوں سے سرفراز ہے۔ استاد شعراء میں جو عقلیل شاداَب کے ہم عصر میں بعض کا انداز روایتی ہے اور بعض کے یہاں تازگی جدیدیت کے عناء صرمو جود ہیں۔ استاد شعراء میں توفیق کوٹوی کے یہاں زیادہ تر روایتی لب و لہجہ کی جھلک ہے لیکن بالخصوص نظم پر موصوف کو خاص قدرت حاصل ہے۔ قابل غور بات یہ بھی ہے کہ عقلیل شاداَب کے عہد میں شاعری کا تناسب جدید اور قدیم شاعری دونوں رنگ کا رہا ہے۔ اور کہیں کہیں کسی کسی کا لب و لہجہ یا موضوع ترقی پسندی کے نزدیک بھی ہے اب یہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ عہد کی نمائندہ شاعری تو نئے پن کی

طرف ہی سفر کرتی ہے۔
بقول عقیل شاداب۔

روایتوں کی لکسریوں کو پینے والوں

یہ کائنات عبارت ہے انقلابوں سے

عقیل شاداب کی جدت بھی ان کی زیادہ تر شاعری میں بے راہ روی اختیار نہیں کرتی بلکہ ایک سدھے ہوئے اسلوب کے تحت ہمارے معاشرے کی بہتر قیادت کرتی ہے وہ دراصل جدید شاعر تو ہیں لیکن جدت ان کی شاعری کا محض مزاج ہی ہے نصب العین نہیں۔ کیوں کہ کہیں کہیں وہ یہ بھی کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ۔
”جدیدت کا میرے ذہن پر بخار نہیں“

الہذا ہم عصر شعراء سے ہم آہنگی قائم کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ہم عصر شعراء میں ظفر غوری کی شاعری کارنگ ، آہنگ انگریزی جدیدیت سے نزدیک تر ہے۔ موصوف کی غزلوں میں کئی بار تشبیہات، اشتعارات، علامت اتنی دھندلی ہو جاتی ہے کہ ہرقاری یا سامع کا ان کے مفہوم تک پہنچنا بہت آسان نہیں ہوتا۔
مثلاً ظفر غوری ایک جگہ کہتے ہیں

فاصلوں نے ڈل لیا ہے روح کی آواز کو

خاموشی کے گھاؤ دل میں گھرے ہوتے ہیں بہت

عقیل شاداب کی جدت مشرقیت کے قریب تر ہے لیکن ظفر غوری کی جدت مغربی لب و لہجہ اسلوب اور انجام سے بے حد متاثر ہے۔ دوسرے شعراء میں زیادہ تر کہ یہاں بات کہنے کا انداز یکساں ہے لیکن فرخ ندیم کی طرزِ سخن تبدیلیوں کی کوشش سے عبارت ہے اور انہیں اپنے ہم عصر شعراء میں الگ درجہ عطا کرتا ہے۔

مزاجیہ شعراء میں ایک شاعر خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان کا نام ڈم ڈم کوٹوی ہے یہ کہتے ہیں

عشق بھی چلتا رہے دکان بھی چلتی رہی

وقت ہو ڈم ڈم بسرا آدھا ادھر آدھا ادھر

اس طرح سے اردو شاعری کا ایک بڑا متوازن ما حول شعری موضوع کے اعتبار سے قائم رہتا ہے جو تمام ہم عصر شعراء کے ساتھ عقیل شاداب کی موجودگی کو تحکم کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ان سبھی کی شخصیات و کلام کا جائزہ ہم آگے کے صفحہ میں درج کر رہے ہیں۔

سرتاج رحمانی:-

عقلیل شاداب کے بزرگ معاصرین میں سب سے پہلا نام سرتاج رحمانی کا ہے ان کا اصل نام عبد الرشید تھا۔ ابتداء میں حشی تخلص اختیار کیا والد کا اسم گرامی عبد الرحمن تھا اس لئے سرتاج رحمانی کے نام سے ادبی سفر جاری رکھا۔ شاعری کی تربیت ثابت لکھنؤی سے حاصل کی۔ مختلف انجمنوں کے سرگرم کارکن رہے۔ غزل، قطعہ، رباعی، نظم ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کی شاعری صرف حسن و عشق تک محدود نہیں تھی کلاسکی روایت سے آغاز کر ک انہوں نے جدید ہیئت تک اپنے فن اور شاعری میں نکھار پیدا کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل تیرے عشوؤں میں غمزروں میں اشاروں میں رہا
ایک بندہ سینکڑوں پروردگاروں میں رہا
دوستو ہم سے ملو دل کو کشاہ کر کے
یوں بھی دیکھو کبھی گنجائش پیدا کر کے
دیکھ کر تیری جلوہ آرائی
ہر نظر بن گئی تماشائی

قیس کوٹوی:-

نور محمد نام اور تخلص قیس تھا۔ ۱۹۰۴ء میں کوٹہ میں پیدا ہوئے تھے ابتداء ہی سے شعرو شاعری کا شغف رہا اور شعرو شاعری کا ایسا دامن پکڑا کہ عمر بھرا س کے اسیر رہے۔ بزمِ ادب کی نشتوں میں شرکت کرتے تھے۔ مفتون کوٹوی اور سرتاج رحمانی سے انکی اکثر صحبت رہتی۔ قیس ایک فطری شاعر تھے۔ عقلیل شاداب اور سرتاج رحمانی اور دوسرے احباب نے مل کر ۱۹۶۵ء میں جشنِ قیس کی شاندار تقریب منعقد کی دو دن تک کل ہند مشاعرہ چلا جس میں قیس صاحب کو اعزاز سے نواز گیا اس میں شرکت کے لئے آندن نارائن حلا، سردار جعفری، بال کوی ییراگی، انڈیور، نگار سلطانہ، شاداب لاہوری جیسی متعدد ادبی ہستیوں نے حصہ لیا۔

نمونہ کلام کے طور پر ان کا مشہور زمانہ شعر درج ہے۔
مری زندگی ایک مہم فشانہ
مری موت ہے ایک مہمل کہانی

جوہر کوٹوی:-

اسمِ گرامی لعل محمد اور جوہر تخلص ہے۔ ۱۹۰۲ء میں کوٹہ میں پیدا ہوئے۔ آبائی عمری سے ہی شعروشاعری کا شوق رہا۔ غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کے ہے اور کلاسکی روایت غزل میں اپنا نام پیدا کیا ہے۔ نمونہ کلام پیش ہے۔

مشکل سمجھ رہا تھا میں الفت کی منزلیں
ہر کام جذبِ عشق نے آسان کر دیا
ہم ان سے ربطِ محبت بڑھائے جاتے ہیں
قضا سے پہلے قضا کو بلائے جاتے ہیں
میں یوں کھویا ہوا آجکل رہتا ہوں اے جوہر
کسی پردہ نشیں کو ڈھونڈتا ہوں بے خبر ہو کر

عبدادیب:-

عبدادیب فارسی، عربی اور ہندی میں اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ اکادمی سے نکالنے والی کتابوں میں ان کا خاص رول رہا۔ عبدادیب کی کوشش سے ہی راجستان اردو اکادمی کا اردو سہ ماہی رسالہ ”نگاشان“، اردو رسم الخط میں جاری ہوا۔ شروع شروع میں اس کے ایڈیٹر عبدادیب رہے ۱۹۰۳ء میں عبدادیب کا شعری مجموعہ ”شواظ“ کے نام سے شائع ہوا۔

عبدادیب کے متعلق خلیل توریا پنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”عبدادیب نے اپنی غزلوں میں اپنے تجربات اور اپنے اطرافِ رونما ہونے والے حادثات کا اظہار راست لہجہ میں کیا۔ اس طرح ان کی غزلوں کا سلسلہ ناسخ کی بجائے آتش لکھنؤی اور یگانہ کی غزلوں سے ملتا ہے جس میں کسی طرح ابہام نہیں پایا جاتا۔“ ۱

نمونہ کلام پیش ہے۔

اب راستہ ہی ڈھونڈیئے اپنے بچاؤ کا
دریا چڑھا یا تیز ہے دھارا بھاؤ کا

پھر ہوں سخت جان ہوں پر موم کی طرح
ہونٹوں کی تلخیوں سے پکھلتا رہا ہوں میں

متاز راشد:-

اردو غزل کا ایک اور نام راجستھان کے حوالے سے متاز راشد ہیں۔ یہ بھی عقیل شاداب کے ہم عصر شراء میں سے ہے۔ عقیل شاداب سے خط و کتابت اور ملاقات کا سلسلہ قائم رہا ہے۔ متاز راشد کا شعری مجموعہ ”بھیگا ہوا کاغذ“ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا ہے۔ نمونہ کلام پیش ہے ۔۔

میں تیرے ہاتھ کی ریکھا ہوں مجھے غور سے پڑھ
کم ہوا تیرا تجسس تو بدل جاؤں گا
نہ چھین مجھ سے میرے روز و شب کے ہنگامے
میں جی رہا ہوں مجھے یہ گمان رہنے دے
تو روایا ہے میری نس نس میں حرارت بن کر
تجھ سے پھر ا تو اسی آگ میں جل جاؤں گا

شاہد عزیز:-

رجستان کے منظر نامے میں عقیل شاداب کے ہم عصر وہ میں شاہد عزیز بھی ہیں۔ یہ عقیل شاداب کے شریک سفر ہے اور اپنی شعری کاوشوں سے لوگوں کو متاثر کرتے رہے۔ تاریخی مجموعہ شراء ”سرابوں کے سفیر“ میں بھی ان کا کلام شامل ہے۔ انہوں نے خصوصاً اپنی پہچان نظموں میں بنائی ہے لیکن غزلیں بھی کہی ہیں۔

چند شعر ملاحظہ ہوں ۔۔

میرے گیتوں میں میرے غم کے سوا کچھ بھی نہیں
تم میرے گیت سنا وہ نہ بہت رات گئے
اتنی حیرانی کیوں ان آنکھوں میں پانی کیوں
اس کے جیسا کوئی نہیں ڈھونڈ رہے ہوئانی کیوں

شاہد میر:-

ہم عصر کے سلسلے میں ایک کڑی شاہد میر بھی ہیں۔ ۱۹۶۵ء کے آس پاس شاعری شروع کی۔ ان کی ابتدائی شاعری پر قدیم رنگِ سخن کا گہرا اثر ہے۔ شاہد میر نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن وہ بنیادی طور پر

غزل کے شاعر ہیں۔ وہ فنِ موسیقی سے بھی واقف ہے اس لئے ان کی غزل میں ایک نغمگی پائی جاتی ہے۔ شاہد میر شعری مجموعہ ”موسم زرد گلابوں کا“ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ کچھ عرصے سے پہلے اکادمی نے ایک کتاب شائع کی اعزاز سے بھی نوازا۔ ترجم میں کلام سناتے ہیں آواز میں کشش ہے۔ نمونہ کلام پیش ہے۔

کوئی پیکر کوئی پھر کوئی پرچھائی نہیں
آئینہ خالی پڑا ہے آنسوؤں کی جھیل کا
ایک جذبہ میرے اُس کے درمیان پل بن گیا
فاصلہ طے ہو گیا آخر کروڑوں میل کا ۳

مخور سعیدی:-

عقلیل شاداب کے معاصرین میں راجستان کے حوالے سے علمی اردو شاعری کے پس منظر میں ایک اہم ترین نام مخور سعیدی کا ہے۔ مخور سعیدی مشہور و معروف شاعر، تبصرہ نگار، مضمون نگار اور ادبی صحافت کے ایک ستون کی حیثیت سے اردو دنیا میں پہنچانے جاتے ہیں۔ ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور متعدد کتابیں انہوں نے بھی شائع کروائی ہے۔ مخور سعیدی کا پہلا شعری مجموعہ ”گفتگی“ تھا۔ جس میں ترقی پسند شاعری کے اثرات نمایاں تھے۔ مخور سعیدی نے نظمیں، غزلیں اور رباعیات بھی کہے ہیں۔ لیکن وہ نظم نگار کی حیثیت سے اپنی پہنچان بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ نظم کے مقابلے میں انہوں نے غزل کم کی ہے۔ نمونے کے طور پر چند شعر پیش ہیں۔

ہر قدم سمت، سفر اپنی بدلتا کیوں ہیں
چلتے رہنا ہے تو رُک رُک کے سنبھلتا کیوں ہے
جز و حال ہونے دے شاید امرت بن جائے
زہر غم پی ہی لیا ہے تو اگلتا کیوں ہے ۵

ظفر غوری:-

ظہیر الحق نام اور تخلص ظفر غوری ۱۲ ارفوری ۱۹۳۵ء بروز جمعرات کو راجستان کی ایک صنعتی تجارتی، تعلیمی اور خوبصورت شہر کوٹ کے محلہ ”سرائے کا یتھاں“ میں پیدا ہوئے۔

آپ کے والد محمد مظہر الحق ایک تعلیم یافتہ شخص تھے۔ ماں مشتری بیگم بھی بہت ہی متقدی تھیں اور عربی بخوبی جانتی تھی۔ ظفر غوری نے ادبی ماحول میں پروش پائی اور ابتدائی تعلیم اردو فارسی اپنے دادا محمد ابراہیم صاحب سے

حاصل کی۔ ۱۹۵۶ء میں بی۔ اے۔ کا امتحان پاس کیا۔ ”ہتھ کاری کا لج کوٹھ“ سے بی۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۳ء میں گورنمنٹ کا لج کوٹھ سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے۔ کیا۔ اور مدرس کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۷۸ء میں آپ نے اردو ادب میں ایم۔ اے۔ کیا۔ ۱۹۵۶ء میں ظفر غوری نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ ملازمت کی وجہ سے ظفر غوری اپنے گھر سے اکثر دور رہے۔ آپ نے اس خیال کو شاعرانہ انداز میں بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مجسم اب بھی ہیں آنکھوں میں اس کے خصتی کلے
دعا کرنا کہ میں پر دلیں سے اچھی خبر لاوں

۱۹۶۰ء میں حافظ غلام حسین کی صاحزادی رشیدہ بیگم سے آپ کا نکاح ہو گیا۔ رشیدہ بیگم کے بطن سے اولاد ہوئیں۔

بقول عقیل شاداب:

”غوری نے بچپن میں ایک عشق کیا تھا جو مرتبے دم تک اس نے
نبھالیا، یعنی آپ کی ۱۹۶۰ء میں ایک شادی تو گھر والوں کی
رضامندی سے ہو گئی۔ لیکن آپ نے اس شادی کے ایک سال بعد ہی
عشقیہ طور پر مشتری بیگم سے نکاح ثانی کر لیا۔ اس نکاح سے آپ کے
والدین ناراض تھے اس کے باوجود بھی آپ نے دونوں رشتہوں کو بخوبی
نبھایا۔ لیکن اس نکاح نے گھر میں اختلاف پیدا کر دیا۔ آپ نے دو
شادیاں کی لیکن آپ کامیاب اور آسودہ زندگی گزارنے سے محروم
رہے۔ دونوں بیویوں کے دل میں رقبابت کی آگ تیز ہو گئی۔ یہ آگ
آگے چل کر جہنم بن گئی۔ جس میں آپ کا سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔“

ظفر غوری نے خود اس بات کا اظہار کچھ اس انداز میں کیا ہے
باہر باہر پھول کھلے تھے جسموں پر
اندر اندر چلتی دوشمشیریں تھیں

آخری وقت میں اپنے شاگرد فاروق نجینر سے گفتگو کرتے وقت شاعرانہ انداز میں کچھ یوں کہا۔

”وقت آگئیا ہے اب جانا ہی پڑے گا“

۲۲ نومبر ۱۹۹۵ء بروز پیر کا سورج طلوع ہوا تو اردو شاعری کا ایک آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ صبح ۶ رنج کرمنٹ پر آپ نے عالم فانی کو خیر باد کہا۔

اپنے سائے کا تعاقب عمر بھر کرتے ہوئے

تھک گیا سانسوں کے پل پر اک مسافر اے خدا ۵ (ظفر غوری)

آبادخرا بے ظفر غوری کی منتخب غزلیات کا مجموعہ ہے۔ اسے راجستان اردو اکادمی جس پور نامنے ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔ اس مجموعہ میں تقریباً (۱۱) غزلیات ہیں۔ حسب روایت اس مجموعہ کا آغاز محمد باری تعلیٰ سے کی گیا ہے۔ انتخابِ کلام سے پہلے جنابِ معظم علمی سکریٹری، راجستان اردو اکادمی کا ”پیش گفتار“ فاروق نجینر کے تاثرات اور ظفر غوری کے دوست جناب عقیل شاداب کا تاثراتی مضمون ”آبادخرا بے کاساکن“ کے عنوان سے شامل ہے۔

جناب فاروق نجینر نے ظفر غوری کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”ظفر غوری کے مشاہدہ کا دائرہ وسیع اور تجربہ گہرا ہے۔ یہی وجہ سے کہ ان کے یہاں جولیاتی الفاظ خصوصاً تشییہ و استعارات کا استعمال بہت خوبصورت انداز میں ہوا۔ ظفر غوری کے یہاں جذبہ کی فراوانی، احساس کی شدت اور خیال کی وسعت سے ایک خوشگوار شعری فضا کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہ فضا پوری شاعری میں ایک جیسی رہتی ہے۔ اچھوتے ماضی میں، پیکر تراشی اور علمتی عناصر ظفر غوری کے فکری اور فنی شعور کے اہم اوصاف ہیں۔“ ۲

بقول ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ

”فن شخصیت کے اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ شخصیت سے سرفراز کا نام ہے اور شاعر اپنی شخصیت کا نہیں بلکہ میدیم کا اظہار کرتا ہے۔“

حالانکہ یہ بھی بیچ ہے کہ فنکار اپنے گرد و پیش کے ماحول اپنی ڈھنی کیفیت رنج و غم، درد، خلش، اور اپنے عہد کے سماجی، سیاسی اور معاشری حالات سے متاثر بھی ہوتا ہے لیکن وہ یہ اثر کس طرح قبول کرتا ہے اور اپنے تخلیقی عمل میں اسے کیسے اجاگر کرتا ہے بہ یک وقت الگ الگ فنکاروں کے لئے یہ تخلیقی تجزیہ الگ الگ ہو سکتا ہے۔ ظفر غوری بھی ان تمام حالات سے دوچا ہوئے ہیں لیکن وہ جس دنیا کا خواب دیکھتے ہیں اس میں نامیدی اور شکستگی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے وہ سماج کے ٹوٹتے بکھرتے اور بنتے رشتتوں اور انسان سے انسان کی دوری پر افسوس تو کرتے ہیں لیکن مایوس نہیں ہوتے۔

ظفر غوری کے بیہاں داخلی خیالات، احساسات کے اظہار کا طریقہ نہایت مہذب ہے وہ اپنے قاری سے ٹھنڈے ٹھنڈے، دھیمے دھیمے لبھج میں بات کرتے ہیں۔ شاید اس لئے ان کے طرزِ بیان میں ڈرامائی عنصر بہت کم ہے۔ لیکن ان کی شعری زبان ان کی عام بول چال کی زبان سے بہت قریب ہے۔ وہ ڈکشن جدید ترین ظفر غوری کے مشاہدے کا دائرہ وسیع اور تجربہ بہت گہرا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے بیہاں جولیاتی الفاظ خصوصاً تشبیہ اور استعارے کا استعمال بہت خوبصورت انداز میں ہوا ہے۔ ظفر غوری کے بیہاں جذبے کی روانی، احساس کی شدت اور خیال کی وسعت سے ایک خوشگوار شعری فضا کا احساس ہوتا ہے اور یہ فضا پوری شاعری میں ایک جیسی رہتی ہے۔ اچھوتے مضمایں پیکر تراشی اور علامتی عناصر ظفر غوری کے فکر اور فنی شعور کے اہم اوصاف ہیں۔

ظفر غوری کا اسلوب سنجیدہ ہے۔ لیکن جو پیرائے اظہار انہوں نے اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے ان کی شاعری کہیں بہم ہو گئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس ابہام کی پر تیس چھٹتی نہیں بس قاری کی توجہ درکار ہے اور پھر یہی ابہام ایک وصف کی طرح نظر آنے لگتا ہے۔ ظفر غوری کی شاعری کی یہ تمام خصوصیات ان کی انفرادیت کی حاصل ہے۔

مجموعی طور پر کالی داس گپت لکھتے ہیں :

” ظفر غوری دھڑ کتے ہوئے دل اور سلکت ہوئے

دماغ کے شاعر ہیں ”۔

ظفر غوری، عقیل شاداب کے قریب ترین دوستوں میں ہیں۔ عقیل شاداب اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ظفر غوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

” ۱۹۶۲ء کی بات ہے میں علی گڑھ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ آیا تھا۔

بیہاں مجھے ظفر غوری کی رقبت حاصل ہوئی جس کی وجہ سے میری

زندگی اور شاعری پر دور دور تک اس کے اثرات مرتب ہوئے
مجھے ظفر غوری کی صورت میں ایک منظبوط سہارا مل گیا تھا۔
اس کی شاعری مرے مزاج کی ترجمان تھی۔ ظفر غوری نے اپنی
پہچان سب سے الگ بنائی تھی اس کو جدید شعراء کی فہرست میں
مرتبہ حاصل ہے۔ اس کو ملک کے بڑے بڑے مشاعروں میں
عزة کے ساتھ بُلا یا جاتا تھا۔ آج بھی جب راجستان میں جدید
شعراء کی بات ہوتی ہے تو وہاں ظفر غوری کا نام سب سے پہلے
آتا ہے۔ ۵

ظفر غوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ آپ نے آزاد غزلیں، نظم معری نیز آزاد نظمیں کافی تعداد
میں پیش کی ہیں۔ شاعری میں آپ نے اپنے تجربات احساسات، خیالات پیش کئے ہیں، آپ کی شاعری میں
جدّت طرفگی کے عناصر بھی شامل ہیں۔ اسی سبب سے پروفیسر عنوان چشتی جو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے دانشور اور
حکمت عملی کے بحث پیکراں تھے تحریر فرماتے ہیں۔

”جدّت روایت کے بطن سے نمودار ہوتی ہے۔ مگر روایت پرستی
سے انحراف کرتی ہے۔ یہ انحراف کرتی ہے۔ یہ انحراف فن کی داخلی
اور خارجی دونوں سطحوں پر ہوتا ہے، ایک طرف اس میں نئے
موضوعات اور اسالیب شامل ہیں۔ دوسری طرف پرانے
موضوعات اسالیب خارجی، داخلی پہلوؤں کے مخفی امکانات کی
دریافت اور ان کی از سرِ نونظم شامل ہے۔ جو قاری کو استحجان اور
سرخوشی عطا کرتی ہے“ ۵

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری میں روایت اور کلاسیکیت سے یکسر بغاوت
ملتی ہے۔ آپ کی شاعری میں عہد جدید کا کامل حیثیت ملتی ہے۔ آپ کے اسلوب اور فضا میں ایک نیاضاً قہ محسوس
ہوتا ہے۔ آپ زندگی کے ہر مسئلے کو شعری جامہ پہنانے میں ماہر ہیں۔

ظفر غوری کی طبیعت پچپن سے شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں صحبت اور ادبی
ماحول نے آپ کے دل میں شعر کہنے کا شوق پیدا کر دیا۔ انہوں نے شاعری کی شروعات ۱۹۵۲ء سے ہی کر دی

تھی۔ لیکن شاعری کے میدان میں ان کی پہچان ۱۹۵۵ء سے بنی۔ ظفر غوری نے اس وقت تک کسی بھی ادبی محفل میں شرکت نہیں کی تھی۔ اسی وجہ سے کوٹھ کے بیشتر شعراء ان سے واقف نہیں تھے۔ آپ نے کسی سے تلمذ نہیں کیا۔ آپ کے بارے میں یہ قصہ مشہور ہے کہ آپ شروعات میں اپنی شناخت چھپانے کے لئے ”ظفر بانو“ کے فرضی نام سے ”شمع“ میں شائع ہوتے ہے۔

جب کوٹھ کے شاعروں نے یہ نام کئی مرتبہ سناتے انہوں نے ”ظفر بانو“ نام کی شاعرہ کا پتہ لگا، ہی لیا کہ کوئی شاعر نہیں، بلکہ ظفر غوری ہی تھے۔ اس سلسلے میں ظفر غوری کے قربی دوست رہے۔ عقیل شاداب کہتے ہیں

”ایک بار ان کے دوستوں نے ان سے کہا آپ ”شمع“ رسالہ میں شائع ہو کر بتاؤ“

”شمع“ جو اس وقت بہت مشہور اور اعلیٰ درجہ کا رسالہ تھا اس میں شائع ہونا کوئی آسان بات نہیں مانی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ رسالہ عورتوں کے ہی کام کو شائع کرتا تھا۔

اسی وجہ سے ظفر غوری نے اپنا کلام ”ظفر بانو“ کے فرضی نام سے بھیجا اور شائع ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد آپ اپنے حقیقی نام ”ظفر غوری“ کے نام سے ہندوستان کے سبھی بڑے اخبارات اور رسائل جیسے ”شبِ خون“، ”شکر“، ”آج کل“، ”سرسبز“ اور ”جوائز“ وغیرہ میں خصوصیت سے شائع ہوتے رہے۔

ظفر غوری کا گھر یلو ماحول شروع ہی سے علمی اور ادبی رہا ہے۔ آپ کے والد بھی ایک بہترین ادیب تھے۔ آپ کے والد جناب مظہر الحق (مرحوم) اپنے زمانے کے گمنام افسانہ نگار رہے ہیں۔ جنہوں نے ایک ناول ترتیب دیا۔ جو بعد میں لوکل پر لیس میں دیونا گری پھی میں شائع ہوا۔ لیکن اب وہ گمنامی کے اندر ہیروں میں گم ہے۔ اس طرح آپ کا گھر ادبی فضائے معمور تھا۔ ایسے دینی، اصلاحی اور نیکوکاروں کے گھرانے کے چشم و چراغ ظفر غوری رہے ہیں۔ آپ کو بچپن سے ہی شعر گوئی کا شوق تھا۔ بقول ظفر احمد پرواز :

”ظفر غوری بھی اپنے والد کی طرح گمنامی میں ہی گزر کرتے اگر ان کو عقیل شاداب اور ظفر احمد پرواز جیسے دوست نصیب نہ ہوتے۔“

ظفر غوری نے جب شعر گوئی کا آغاز کیا اس وقت بزمِ ادب کی نشستیں با قاعدہ منعقد ہوتی تھیں۔ اور ان میں صریعہ طرح پر غزلیں کہی جاتی تھیں۔ اگر اس گھنٹن کے ماحول میں کوئی تازہ ہوا کا جھونکا تھا تو وہ ظفر غوری کی جدید شاعری تھی۔ اگر دیکھا جائے تو کوٹھ کے دیگر شعراء بھی تازہ شاعری کرتے تھے۔ مگر آپ کی بات کچھ الگ تھی۔ اس کے بعد حلقة مسلسل مضبوط ہوتا گیا اور جدت پسندی کی طرف دوسرے ہم عصر شعراء بھی راغب ہو گئے۔ جن میں سعید احمد مجوی، بشیر احمد لطفی، عابد اختر جے پوری، مظفر صدیقی اور امین نشاٹی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ظفر غوری اپنے دوستوں کے بے حد اصرار کے بعد بزمِ ادب اور گیر شعری نشستوں میں شرکت فرمائے گے۔ آپ نے جن اہم مشاعروں میں شرکت فرمائی ان میں پشن قیس اور ”ہندی اردو سُنگمشاعرہ، ۱۹۶۵ء“ یوں غالب کی صد سالہ تقریب، ”جدید شعروادب پرسینا را اور کل ہندمشاعرہ“ ۱۹۷۵ء وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں کہ ظفر غوری کی شاعری میں جدیدیت وجودیت کا گھر اثر پایا جاتا ہے۔ آپ کی غزلوں میں ایک نئی زندگی کا احساس ہوتا ہے جدت پسندی آپ کی شاعری کا جو ہر ہے اور زندگی کی ترجمانی اور نئے حالات کی عکاسی ہے۔ آپ اپنے دور کے مہذب شاعر تھے ان کی شاعری اپنی شخصیت کا مکمل اظہار ہے۔ ظفر غوری کے کلام میں ان کی زندگی کے مختلف روپ ملتے ہیں اور یہ ان کے مزاج کا صحیح آئینہ دار ہے۔

بقول عقیل شاداب:

”ظفر کے یہاں پیکروں کی فراوانی ہے، اس کے مزاج کی طرح اس کی شاعری میں بھی ٹھہراؤ اور فکر و احساس کی کئی تھیں ہیں۔ پرت در پرت اس کا کلام قاری پر منکشف ہوتا چلا جاتا ہے، اور ہم اس کے ساتھ ایک ایسے جہاں میں پہنچ جاتے ہیں جو اس نے بڑے فکاری اور بصیرت سے تخلیق کیا ہے۔“

”اس نے اپنا رشتہ ایک طرف پرانی تشبیہات، استعارات اور لفظیات سے قائم رکھا ہے تو دوسری طرف نئی زبان، نئے پیکر، نئے اشارے کنائے، نئے تلازمات، انسلاکات اور نئے مضامین سے اپنی غزل کو مزین کیا ہے۔ اسے سرسری طور پر ڈھا جا سکتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے ہر لفظ میں معنی کی متعدد تھیں کار فرماں ہیں۔ جو اس کے قاری کو دھیرے دھیرے اپنی گرفت میں لئے لیتی ہے۔ اس کی شخصیت کی دل آویزی اس کی شاعری میں بھی منعکس ہوتی ہے وہ ہمارے دور کا ایک باشور شاعر ہے۔ اس نے صرف قافیہ پیائی نہیں کی ہے بلکہ معنی آفرینی کے جو ہر دکھائے ہیں۔“ ۹

ظفر غوری کو ٹھہرے کے ممتاز شعرا میں جدیدیت کے حوالے سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں ۱۹۹۰ء کی دہائی میں حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا۔

ظفر غوری کی شاعری اور ان کی ادبی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فاروق جنشتی فرماتے ہیں:

”جہاں تک ظفر غوری کی شاعری کا تعلق ہے اور اگر شاعری کو شخصیت کے اظہار کے آئینے میں دیکھا جائے تو یہ کہنا حق بے جانب ہو گا کہ جس طرح ان کی شخصیت میں نہ داری تھی کم آمیزش تھی بالکل اسی طرح آپ کا کلام بھی معنوی تہ داری سے بھرا ہوا ہے۔ جذبات و احساسات کے اظہار کا سلیقہ اپنے ہم عصر وں میں ظفر غوری کے یہاں ہے۔ اس کی مثال ذرا مشکل ہی ملے گی۔ کبھی کبھی ان کی زبان ابھی ہوئی ضرور محسوس ہوتی ہے مگر یہ ان کے کثرتِ مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ ان کے قاری کو ان کی بات سمجھنے کے لئے تھوڑا سا ٹھہر کر سوچنا پڑتا ہے اور یہی ظفر غوری کی انفرادیت بھی ہے اور ان کے شعری اسلوب کا حسن بھی“ ۱۰

ظفر غوری کسی بھی ادارے کے پابند نہیں ہے۔ وہ جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں انہیں شاعری کے سانچے میں ڈھال دینے میں مہارت رکھتے ہیں۔ آپ ایک سنجیدہ شاعر تھے اور آپ کی شخصیت برداشتی۔ آپ کو شاعری کا شوق فطری تھا۔ ان کے کلام میں پختگی پائی جاتی ہے۔
بقول ظفر غوری :

”میں نے بدلتے ہوئے زمانے میں آنکھ کھولی ہے۔ نئی سوچ رکھتا ہوں، زندگی اس کی کڑواہٹ اور درد محسوس کرتا ہوں۔ کسی ”عزم“ کا پابند نہیں ہوں۔ دل پر اڑ کرنے والی بات سے متاثر ہوتا ہوں اور اس سے شعر کہنے کی سیکھ ملتی ہے مجھے“ ۱۱

ظفر غوری نے اپنی نظموں کی صداقتوں اور تقاضوں کا تاریخی تناظر و حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آپ کے یہاں اگرچہ ابتدائی دور میں فیض کے آہنگ کی آہٹ سُنائی دیتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اپنے انفرادی اسلوب کی تغیر و تشكیل کی شعوری کوشش بھی کار فرمانظر آتی ہے۔
وحید اختر جدیدیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھے ہیں:

”اپنے عہد کی زندگی کا سامنا کرنے اور اسے تمام خطرات و امکانات کے ساتھ برتنے کا نام ہے۔ ہر عہد میں جدیدیت ہم عصر زندگی کو سمجھنے اور برتنے کے مسلسل عمل سے عبارت ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے ہر عہد میں ان لوگوں نے جو حقیقی طور پر زندہ رہے ہیں اس عمل میں حصہ لیا ہے۔ انہوں نے فکر و فن کی سطح پر فرسودہ اقتدار کے خلاف جنگ کرنے کے نئی قدروں کی پرورش کی اور عملی زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ اسی مفہوم میں ادب کو روحِ عصر کہا جاتا ہے“۔ ۲۱

ظفر غوری نے جہاں بھی اپنے گرد و پیش کے مسائل و مصائب کا ایک نئے احساس و انداز سے مشاہدہ کیا ہے وہی اپنے خیالات و تجربات کے اظہار و بیان کے جدیدیت کو بطورِ فیشن نہیں اپنایا بلکہ اس کی ادبی تخلیقات اور موجودعاتی وسعت کا فائدہ بھی اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ غرض کہ ظفر غوری نے اپنا اسلوب رکھا ہے۔ جس میں خود کلامی بھی ہے اور جذبات و احساسات میں شعریت عطا کرتی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

چُپ ہیں کیوں حرف و نوا کے شیشہ گر، کچھ اس طرح
دل لہو کرنے کا فن اور بے ہنر، کچھ اس طرح
کنارے شب پہ مجھ کو چاند تنہا چھوڑ دیتا ہے
یہ منظر آنکھ سے خوابوں کا رشتہ توڑ دیتا ہے
دولوں کو فاش ہوئے راز حرف و معنی کے
کچھ اسے لبھج میں مجھ سے خطاب اس نے کیا
مجھے آواز دینا دشتِ جاں کی تشنہ لب یارو!
میں ایک جوئے تمنا ان بھجھی آنکھوں میں بھر لاؤں
رقص کرتی رہ گئیں بے نام سی پر چھائیاں
وقت ہر کردار کی زندہ کہانی لے گیا
چلو اک بار پھر خوابوں کو اس پتھر سے ٹکرائیں
ذرد دیکھیں کہ پھر کن ہفت خوابوں سے گزرنا ہے

اُٹھتے جذبات برستے رہے طوفان کی طرح
غم میں ڈوبے ہوئے احساس پہ تالا دیکھا
سوچ کی بوسیدہ دیواریں توڑ کے باہر آئیں گے
خاموشی کا زہر پیئے کچھ دو شیرہ تقریریں ہیں

اختشام آخر:-

اختشام آخر کی پیدائش اجیر شریف خواجہ کی نگری میں ہوئی یہ اولاد خواجہ کے قریبی ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں اجیر کالج سے بی اے۔ پاس کیا۔ ۱۹۷۱ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے۔ کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں سرکاری پوسٹ گرینجویٹ کالج کوٹھ میں استاد کے عہدے پر تقرر ہو گئے۔ اور کوٹھ ہی میں اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دیتے رہے۔ فی الحال رٹائر اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں مصروف ہیں۔ آپ کو شاعری کا شوق طالب علمی کے زمانے ہی سے تھا، ابتداء میں اپنے ماموں سید علیم الدین علیمی سے اصلاح لی جو اپنے دور کے مشہور و معروف شاعر تھے۔ علی گڑھ کے قیام نے آپ کے ذوق و خن کو جلا بخشی چنانچہ آپ کی شاعری کا سفر باقاعدگی سے ۱۹۶۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ ویسے آپ کی شاعری کا آغاز اس زمانے سے ہوتا ہے جب آپ ہائی سینڈری کے طالب علم تھے۔ آپ کی سب سے پہلی غزل ہائی اسکول میگزین میں شائع ہوئی۔ جس میں ایک شعر کی آپ کے ماموجان علیمی صاحب نے خوب تعریف کی اور سراہا تھا۔ وہ شعر یہ ہے

محسوس ہو رہا ہے کہ صدیاں گزر گئیں!

حالانکہ ہجریار بھی کل کی بات ہے !!

اختشام آخر کل ہند سلطھی شاعر ہیں۔ انہوں نے غزل اور نثری نظم دونوں میدانوں میں طبع آزمائی کی۔ آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں تاہم ان کی نثری نظمیں اپنے موضوع اور فی خوبیوں کی بدولت دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ نظم کے علاوہ جو صنف اختشام آخر کی خارجیت سے زیادہ داخلیت سے بھر پور ہے۔ تو کائنات سے زیادہ ذات اور کل سے زیادہ جزءِ کو مسلم حیثیت حاصل ہے۔ آپ کی شاعری میں اپنی زندگی کی تمام ترشکست و ریخت اور حسین خوابوں کی ناکامی کا رنج والم ملتا ہے۔ ساتھ ہی کسی شستے کو پانے کی امیدوں اور آرزوؤں کا اضطراب بھی نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ بطور نمونے چند اشعار تحریر ہیں:

اسی امید پر فٹ پا تھے پرسوتے رہے برسوں
کبھی اس شہر میں اختر ہمارا بھی مکاں ہوگا
بہت یوں تو شکستہ ہے یہ اختر
مگر دیوار کا سایہ بہت ہے
میری غزلوں میں میری نظموں میں سارے عشق کے قصے
کسی دل بر کو پانے کی ادھوری کامنا کے ہیں

اختشام اختر کی شاعری کے اب تک چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ”راکھ“ ہے جو غزل نشری نظم پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں غزل کی دنیا میں جاندار اسلوب و فکر و خیالات ہیں تو دوسرا مجموعہ ”نیلا آکاش“، شائع ہوا۔ اس میں خالص نشری نظمیں شامل ہیں۔ اور تیسرا مجموعہ ”صح کا ستارہ“ شائع ہوا اور یہ ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا جو خالص غزلوں پر مشتمل ہے ”نیلا آکاش“، چوتھا مجموعہ ”اندازِ نظر“ ۲۰۱۰ء پانچواں دریا کے کنارے ہے۔ ۲۰۱۳ء میں طبع ہوا۔ نشری نظم کے تعلق سے راجستان کے اولین نظم نگاروں میں آپ کا شمار کیا جاتا ہے۔ اختشام اختر کے نزدیک ادب صرف ادب کے لئے ہے اور شاعری کی اہمیت ان کے بقول....

”شاعری کی افادیت یہی ہے کہ وہ قاری کے ذہن اور
دل کو آسودگی اور بالدگی عطا کرتی ہے۔ شاعری کا مقصد
شاعری کے سوا کچھ نہیں۔۔۔ اگر شعر میں شعریت نہیں
ہے تو وہ شعر نہیں،۔۔۔

ہر اعتبار سے اختشام اختر کا شمار اردو شعراء کے اس صفت میں ہوتا ہے جو جدیدیت کو شعری پیکر میں ڈھانے کا ہنر جانتے ہیں۔ چند نشری نظمیں بطور نمونہ حاضر ہیں:

”آزاد“ دشت زندگی میں رکا ش کوئی مسافر آئے رمحے ڈھونڈ نے رمحے پائے ر میں چشمہ آب ہوں ر میں زیر سنگ ہوں۔

”ناکامی“ روز و شب آتے ہیں ر گزر جاتے ہیں ر اور میں یونہی کھڑا ہوا ہوں ر میں ابھی تک غم کی رہڑک پار نہیں کر سکا۔

”ایک شخص“ ایک اکیلے بلب کی طرح ر میں ویران کمرے میں ر تھا جل ر ہا ہوں ر کمرے کی ساری روشنی ر

صرف ایک شخص کے لئے ہے جس کے انتظار میں آنکھیں بے نور ہوئی جاتی ہیں اس سے پہلے
کہ میں بلب کی طرح فیوز ہو جاؤں رکاش وہ آجائے“ ۳۱

آپ کے اس بیان سے ان کا شاعری سے متعلق نقطہ نظر صاف ہو جاتا ہے کہ شاعری میں فنی اور جمالیاتی
قدروں کو ان کے یہاں مقصدیت فکر و نظر اور تعمیری، اصلاحی رجحانات سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جہاں ان کی
نشری نظموں کا تعلق ہے انہوں نے اپنے خیالات و تجربات نیز داخلی کیفیات کے فنی اعتبار سے ان میں پوری طرح
سمونے کی کوشش کی۔ ان کی نشری نظموں میں ایک طرف معنویت اور داخلیت ملتی ہے جس میں ان کی آرزوؤں اور
ارمانوں اور خواہشوں کی ناکامیوں اور زندگی کی ناراسائیوں کا درد و کرب بھی شامل ہے۔ الغرض انہوں نے سبھی
میں اپنی ذات کو سمونے کی شعری مسائی کی ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے ان نشری شاعری جدیدیت کی لفظ
بازگیری اور فیشن پرستی سے مبڑا ہے۔ مجموعی طور پر احتشام اختر کا شمار اردو شعراء کی اس صفت میں ہوتا ہے جو
جدیدیت کو شعری پیکر میں ڈھانے کا ہنر جانتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہوں
بعوانِ ”آرزو“

دشتِ زندگی میں

کاش کوئی مسافر آئے

مجھے ڈھونڈنے

مجھے پائے

میں چشمہ آب ہوں

میں زیر سنگ ہوں

احتشام اختر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں تاہم ان کی نشری نظمیں اپنے موضوع اور فنی رکھ رکھاؤ کے
اعتبار سے دعوت فکر و نظر دیتی ہے۔ وہ کوٹہ کی شاعری میں اچھے نظم و نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ نظم کے لیے
جو صنف ان کی شاعری کو اہمیت کی حامل بناتی ہے وہ غزل ہی ہے۔ ان کی غزل یہ شاعری میں خارجیت سے زیادہ
داخلیت ہے۔ ان کی شاعری کے پس منظر میں ایک ایسا فنا کارا بھرتا ہے جس کے یہاں عصری آگی اور سماجی شعور کا
فقدان ہے۔ اس سے وہ کھلی فضا کے نسبت اپنی ذات کے خول میں قید ہو کر رہ گیا۔ اس کی خلوت اور تہائی میں اس
کے نزدیک پوری دنیا اجاگر ہے۔ بقول غالب

”ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو“ ۳۲

۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۰ء کا بکل سعیدی انعام، اگر از راجستھان اردو اکادمی سے حاصل ہو چکا ہے۔ معروف جرائد و رسائل میں کلام اور مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ریڈ یو اور ٹوی سے بھی دلنشگی ہے۔ ۱۵

”اختشام اختر کی شاعری کو پڑھ کر (نیلا آکاش کے حوالے سے) ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں ہمزاد سے مل رہا ہوں یا اپنے جیسے انسانوں سے مل رہا ہوں۔ انہوں نے ایک ادائے خاص کے ساتھ آج کے انسان کی نفسیاتی الجھنوں اور اس دور کے مجموعی آہنگ کو جمالیاتی زبان عطا کرنے کی کوشش کی ہے یہ ایسی خصوصیت ہے جس سے ان کی شاعری دریتک اور دور تک جگدگاتی اور جاگتی رہے گی۔“ ۱۶

نمونہ کلام ملاحظہ ہوں۔

غزل

کبھی زمیں پہ کبھی نیلے آسمان میں ہوں
ہوا کی طرح میں ہر پل نئے مکان میں ہوں
تیرا وقار تو میرے ہی دم سے قائم ہے
میں مثلِ آب گیر تیری آن بان میں ہوں
لبوں سے اس کے نکل کر ہوا ہوں آوارہ
میں ایک لفظ ہوں ہر دم نئی اڑان میں ہوں
تو سمجھ کو ذرا میری قدر کر ناداں!
میں آسمانی صحیفہ تیری زبان میں ہوں ۱
مرے حصا ر میں تھی ساری کائنات کبھی
ستم ہے قید میں خود اپنے ہی مکان میں ہوں
بجھے تو گھرے سمندر سے جا کے ملنا ہے
ابھی میں رُک نہیں سکتا، ابھی ڈھلان میں ہوں

شگفتہ پھول پریشاں ہوا تو غم نہ کرو
کہ وہ تو یوں ہی ہوا میں بکھرنے والا تھا
میں بے قصور ہوں یہ فیصلہ ہو ورنہ
میں اپنے جرم کا اقرار کرنے والا تھا
بلند یوں میں جو اڑتے ہیں ان کو کیا معلوم
گھنے بنوں کی ہیں ہم آگ، جلتے رہتے ہیں
تم اپنے جسم کے ملبوس بچائے رکھو
غلیظ پانی ہے ہم تو اچھلتے رہتے ہیں

کل

نظمیں: (سعی رائیگاں)

گھٹی گھٹی سی فضا
سرک بھی کچھ خوش تھیں
اندھیرا پھیلنے لگا تھا ہر طرف
گھروں سے جھانکنے لگی تھی یوں
اُداسیاں
کہ جیسے کوئی مر گیا ہوراہ میں
تھکن سے ٹوٹتا ہوا بدنا
پکارتا تھا نیند کو
نظر کی پیاس بڑھ رہی تھی دم بدم
کسی حسین خواب کا یقین
کبھی کامر چکا تھا مارے ذہن میں
گماں کی دھول اڑ رہی تھی ہر طرف
سمندروں کے پار سے

بلارہی تھی اک صدا

میں اس صداسے بھاگ کر

اس جنپی دیار میں

پناہ لینے آیا تھا

نظم (پڑانے خواب)

ٹوٹے قصے، ٹوٹی باتیں

جوڑ رہی ہے کالی رات

آج کوئی ہمراز نہیں ہے

آج کوئی بھی پاس نہیں ہے

پچھلے جنم میں جن خوابوں کو

می بنا کر

یادوں کے اہرام میں میں نے

دن کیا تھا

وہی پڑانے خواب

ماگ رہی تھی

میری آنکھیں

کس سے کھوں میں، کس کو بتاؤں

آج کوئی بھی پاس نہیں ہے

شاہد عزیز اخشم اختر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”اخشم اختر غزل اور نظم دونوں اصناف پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ اخشم

کی غزل اور نظم دونوں ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ میں نے

جب جب بھی اخشم اختر کے کلام کا مطالعہ کیا ہے مجھے لگا ہے کہ اخشم

اختر کو صرف راجستان کے ادبی منظرنامے میں محدود نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اخشم اختر کی شاعری بین الاقوامی حدود کو پار کر چکی ہے۔

اختشام کے ساتھ جن لوگوں نے اپنا سفر شروع کیا تھا وہ لوگ تھگ
گئے ہیں۔ یا اب اپنے آپ کو دو ہمارے ہیں مگر اختشام اختر کے
کلام میں آج بھی تازگی کا احساس برقرار ہے۔ اختشام نہ صرف
راجستان کے جدید شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں بلکہ انہوں نے
جدید شاعری کو فروغ دینے میں بھی ایک اہم رول ادا کیا ہے اور
ان کا ادب موضوع کی کیسانیت سے بھی پاک رہا ہے۔ ۱۸

اب اُن کا پانچواں شعر مجموعہ ”دریا کے کنارے“ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کے کلام میں شعریت بھی ہے اور
لفافت بھی وہ اکیسویں صدی کے نمائندہ شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

ان کا درج ذیل شعر بہت خوب ہے۔

زندگی بھر قلم سے لکھتا رہوں

مجھ پا تنا کرم خدار رکھنا ۱۹

نمودنہ کلام ملا حظہ ہوں۔

غزل

کیا ملا آگ میں تپانے سے
کھو دیا اس کو آzmanے سے
اس کو نسبت ہے یاد سے تیری
دل بھی ہے درد کے گھرانے سے
دوستی ہو گئی ہے پھولوں سے
باغ میں آشیاں بنانے سے
دوست کوئی نہیں یہاں میرا
یوں تو ہے دوستی زمانے سے

کیسے دیتے ہیں دوستوں کو فریب
ہم نے سیکھا فریب کھانے سے
دور حاضر کے یہ حسین اختر
پاس آتے ہیں دور جانے سے

منقبت

نخساں اک دیا ہوں اجمیر والے خواجہ
آنڈھی میں جل رہاں اجمیر والے خواجہ
میرا نہیں ہے کوئی بس آپ کے علاوہ
بے بس ہوں بے نواں ہوں اجمیر والے خواجہ
ٹوٹی ہوئی ہے کشتنی دے دو اسے سہارا
طوفاں میں گھر گیا ہوں اجمیر والے خواجہ
یہ آپ کا کرم ہے میں اپنے دشمنوں سے
تنهائی لڑ رہا ہوں اجمیر والے خواجہ

لغتیہ قطعہ

نام جب بھی لیا مصطفیٰ مصطفیٰ
مل گئی ہر بلا مصطفیٰ مصطفیٰ
آپ ہی کے کرم سے ہیں بھارت میں ہم
یار رسول خدا مصطفیٰ مصطفیٰ

۲۵

بقول ڈاکٹر فیروز احمد

”اختشام اختر مکی شخصیت میں پوشیدہ نقاد جس انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے اس کا اندازہ ”سرسیڈ کی مذہبی رواداری اور سیکولر نظریہ، غالب کے کلام کا فکری تجزیہ، ابلاغ کی ادب میں اہمیت، ترقی پسند تحریک: ایک جائزہ، اور قابل اجمیری کے فن اور شخصیت پر ایک نظر جیسے مضامین سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔“ ۱۲

فرخ ندیم:-

نام فرخ ندیم، قلمی نام بھی یہی ہے۔ والد کا نام عقیل شاداب ۱۹۶۳ء کو اپنے نانا کے یہاں علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ نانا پنڈت حبیب الرحمن شاستری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں استاد تھے۔ اور عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، اردو زبانوں کے عالم تھے۔ دادا مشیٰ محمد ابراہیم خاں اپنے وقت کے بے جوڑ وکیل اور فارسی، اردو ہندی میں بے بہا علم رکھتے تھے۔ والدہ طاہرہ بیگم اردو میں ایم۔ اے۔ اور ادیب کامل کی سند یافتہ تھیں۔

گویا فرخ ندیم کی تربیت و پرورش ایک علمی و ادبی گھرانے میں ہوئی۔ ۱۹۹۰ء میں گورنمنٹ کالج کوٹھ سے امتیازی حیثیت سے فرست ڈویژن میں اردو میں ایم۔ اے۔ کیا۔ ۱۹۹۷ء میں اوپن یونیورسٹی کوٹھ سے بے ایڈ کی سند ۱۶۔ ۱۷ ارسال کی عمر سے شعر کہہ رہے ہیں۔ غزل، نظم و گیت کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ نعت بھی کہتے ہیں۔ کسی سے اصلاح نہیں لی۔ اپنے ذوق و شوق و مطالعہ ہی کو رہبر بنایا، شاعری میں کسی خاص مسلک سے وابستہ نہیں ہوئے۔ موزوں طبع ہیں۔ خوش فکر ہیں، اپنے حلقات میں الگ پہنچان رکھتے ہیں، درمیانہ قد، سوچتی آنکھیں اور جاذب نظر ہے۔ ملنے والوں سے جلد متاثر ہوتے ہیں اور دوسروں کو متاثر کرتے ہیں۔ اپنا کلام ترجم سے سناتے ہیں۔ مگر تحت اللفظ بھی اچھا پڑھتے ہیں۔

غزل کے بند ملاحظہ ہوں۔

ترے ملنے کی خوشی میں بھی غزل ہوتی ہے

اور تو چھوڑ کے جائے تو غزل کہتا ہوں

اور متاثر کرتے ہوئے نشر و اشاعت سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ غزل میں عشق کے جذبہ کو بنیادی قرار دیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔ بند ملاحظہ ہوں۔

جذبہ عشق ستائے تو غزل کہتا ہوں

دردوا حساس رُلائے تو غزل کہتا ہوں

مشائیرِ ادب کی رائے میں (فرخ ندیم)

فرخ ندیم کا شمار کوٹھ کے نوجوان شعراء میں ہوتا ہے۔ فرخ ندیم کے والد عقیل شاداب بھی معروف اور قادر الکلام شاعر تھے۔ فرخ ندیم کو شاعری سے بچپن ہی سے ہی لگا تو تھا۔ ویسے بھی شاعری انہیں وراشت میں ملی ہے۔ فرخ ندیم کے والد عقیل شاداب میرے قریبی راسم ہیں اس وجہ سے جس فرخ ندیم کو ان کے لڑکپن سے جانتا ہوں اور پھر ندیم میرے طالب علم بھی رہے ہیں انہوں نے گورنمنٹ کالج کوٹھ سے میری نگرانی میں ایم۔ اے

کیا اور فرست ڈویژن سے پاس کیا۔ اس اعتبار سے فرخ ندیم تعلیم یافتہ باشمور اور حساس شاعر ہیں۔ وہ اپنے مشاعرے میں رونما ہونے والے واقعات پر وہ اپنا رِ عَمَل بھی ظاہر کرتے ہیں۔

ان کی شاعری زمینی صداقت کی عکاسی ہے ان کی غزلوں میں زمین اور دھرتی کی بوباس ملتی ہے ان کی شاعری میں عصری آگاہی ہے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی لاطافتیں، رعنائی، دلکشی بھی نظر آتی ہے اس طرح ان کی شاعری میں تہہ داری، گہرائی اور تنوع بھی ہے۔ بہت تھوڑے عرصے میں انہوں نے اردو کی دنیا میں اپنی پہچان قائم کر لی ہے کہ وہ کوٹہ کے منفرد اور البلے شاعر ہیں۔ رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے اس کے علاوہ انہوں نے مشاعروں میں بھی اپنی الگ پہچان قائم کی ہے۔ وہ جب ترجم سے اپنی غزل سناتے ہیں تو سامعین لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ابھی فرخ ندیم کا شعری سفر جاری ہے۔ ابھی انہیں بہت دور تک جانا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اپنا نام روشن کیا ہے بلکہ اپنی شاعری کے ذریعہ کوٹہ کا بھی نام روشن کیا ہے۔ ۲۲

کوٹہ کے نوجوان شعرا کی شعری خدمات، مقالہ برائے ایم۔ فل۔ پیش کردہ: شاہین پروین ص۔ ۱۰۱-۱۰۵

چند شعر ملاحظہ کیجئے

جسم کاروپ سنوارا ہم نے
روح کوشاد کیا ہے ہم نے

اس کے چہرے کی زرد نگت میں
کتنی مجبوریوں کے سائے تھے

غزل:

میرے خیال کی گہرائیوں میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے تہائیوں میں رہتا ہے
کہنی بھی اُس کی خلش کا کوئی علاج نہیں
جو دشمنوں میں نہیں بھائیوں میں رہتا ہے
میری تلاش میری زندگی کا حاصل ہے
وہ ایک نام جو رسوائیوں میں رہتا ہے

کبھی بھی جب کوئی جگنوںی چال چلتا ہے
عجیب خوف سا پر چھائیوں میں رہتا ہے
سزاۓ عشق سے بدنام تو ہوا مجنو
مگر جنوں تماشایوں میں رہتا ہے

نظم:

میری آرزوؤں کی مانند کہاں ہے
کہاں میرے سپنوں کا ہندوستان ہے
کہیں آنسوؤں کا سمندر سفر میں
کہیں زندگی رنج کی رہگزرا میں
خوشی اب کہاں دوستی اب کہاں ہے
کہاں میرے سپنوں کا ہندوستان ہے
ہر اک سو تباہی کا منظر منظر میں
جنوں پل رہا ہے محبت کے گھر میں

گیت:

سمیٰ سمیٰ اچھاؤں کا دل میں میلا گلتا ہے
دنیا سے ڈر کے جینا بھی اس دم اچھا گلتا ہے
ہنس دیتے ہو جب تم میں پروائی میں کھو جاتا ہوں
دیکھو ہم دم کتنی محنت سے میں گیت سناتا ہوں
پلکوں سے لفظوں کے موٹی چبن کر تم تک لا جاتا ہوں
دیکھو ہم دم کتنی محبت سے میں گیت سناتا ہوں

ابن رضا:-

نام محمد اشراق، والد صاحب کا نام مشی عبدالعزاق (رضا) ایڈوکیٹ اور تخلص ابن رضا ہے۔ ۳ ستمبر ۱۹۳۲ء کو بمقام باراں میں پیدا ہوئے۔ مذکور کلاس باراں سے میٹر ک اور فرسٹ ایکوٹھ سے اور بی اے جامعہ ملیہ

اسلامیہ دہلی سے کیا۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی کی سند مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کی۔ آبائی پیشہ وکالت اختیار کیا۔ دورانِ قیام علی گڑھ ۱۹۶۳ء سے شاعری کا آغاز ہوا، کسی سے اصلاح نہیں لی۔ نظمیں کہیں اور غالب حصہ نشری نظموں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۷ء میں جدید شعراء کا انتخاب ”سرابوں کے سفیر“ میں شامل ہیں۔ ملیٰ خدمات خصوصاً بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ سیاسی اور سماجی کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ مطالعے کے شوقین ہیں، ابھی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔

قد لمبا، ناک تیکھی، چہرہ گول، آنکھیں روشن، رنگ گورا اور پروقار خصیت کے حامل ہیں۔

نظمیں: (رات)

رات اک برہن بے چاری
دن ڈھلتے ہی آ جاتی ہے
آس لگائے پیامن کی
جانے کب سے جاگ رہی ہے
(صحیح)

صحیح خوشبو کا پیر ہن پہنے
دل کی گہرائیوں میں آتی ہے
اک حسین خواب سے جگاتی ہے
اور سرگوشیوں میں کہتی ہے
چل تجھے کائنات دکھلائیں!
زندگی کا ثبات دکھلائیں!!

(تہما)

بیچارہ بد قسمت سورج
روز سویرے آ جاتا ہے
شام ڈھلنے واپس جاتا ہے
خود غرضوں کی اس بستی میں
شايداں کا کوئی نہیں ہے

(آئینہ)

میری خودستائی نے

عظمتِ خداوندی

بے نقاب کر ڈالی

(سکریٹ)

دوسروں کے سکون کی خاطر

خود غرض لوگو! میں نے اپنا وجود

اپنی آنکھوں سے جلتے دیکھا ہے

(ایک نظم)

زندگی تجربوں کی دنیا ہے

یا توقع کی کوئی بستی ہے

کیا بندی ہے، کیسی بستی ہے

کیا اندر ہیرا ہے، کیسا ستاٹا

جیسے جنگل کوئی خاموشی کا!

کوئی بھاگے تو کس طرح بھاگے

دور تک راستہ نہیں ملتا

کوئی اپنے سوانحیں ملتا

(ایک نظم)

تمہارے لمس کا احساس مجھ کو ایسے ہوا

کہ جیسے ہکے سے بادِ صبا گزر جائے

چھوٹی موئی کا وہ پودہ وہیں سمیٹ جائے

(ایک نظم)

یہ خاموشی، یہ اندر ہیرے، یہ خوف کے جنگل

یہ سرد سردی آہیں، یہ روح کے نشتر

یہ میرے طمتوں کے کھنے دشت میں رواں بیدل

تلائی نور میں صد یوں سے کراہا ہوں پکار

نقابِ رُخ سے اٹھاؤ بڑا اندر ہیرا ہے، ۲۳

ظفر احمد پرواز:-

نام ظفر احمد، تخلص پرواز۔ والد کا نام عبدالعزیز، ۷ اگست ۱۹۳۹ء کو ضلع کوٹھ میں پیدا ہوئے۔ نانا جناب عبدالعزیز رضا باراں میں وکالت کرتے تھے۔ چونکہ والد کو ۱۹۴۲ء میں عارضہ قلب سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس لئے نانا نے ہی کفالت فرمائی۔ نانا اردو اور فارسی کے عالم تھے۔ اور شعر و ادب نیز مذہبی رواداروں میں اپنے علاقے میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ اس لئے ظفر احمد پرواز بھی ان کی سرپرستی میں پروان چڑھے اور علمی و ادبی ماحول میں پورش حاصل کی۔

ظفر احمد پرواز کوئی۔ اے اور ایم۔ اے کی تعلیم کے وقت ظفر غوری صاحب نے کافی مدد فرمائی اور مسلسل انگریزی ادب کی تربیت بڑی فراخ دلی سے دیا کرتے تھے جس کا ذکر وہ تمام احباب کے درمیان بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔ ظفر احمد پرواز ۱۹۵۹ء میں پہلی ملازمت ترک کر کے محلہ ریلوے کوٹھ میں ٹلک سے ترقی کر کے ۱۹۹۰ء میں چیف ٹرین کنٹرولر میں کی پوسٹ سے ۱۹۹۶ء میں سبد دوش ہوئے۔ باوجود سبد دوش کے آرام و سکون میسر نہیں آیا اور گھر کی کفالت کی غرض سے ۲۰۰۲ء تک کوٹھ سو پر ٹھرمل پاور پروجیکٹ میں یارڈ ماسٹر کی ذمداری نبھاتے رہے۔ آپ اپنے بچوں کی تعلیم یافتہ ہونے پر بھی ایک بھی اولاد سرکاری نوکری حاصل نہ کر سکا۔ اسی لئے آخری عمر میں بھی چین و سکون نصیب نہیں آیا۔

ظفر احمد پرواز کا قد اوسط، پیشانی کشادہ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن چہرہ کتابی رنگ گندومی اور آواز میں تیزی مگر کبھی کبھی لکنت آ جاتی ہے۔ آپ بڑی حساس طبیعت کے مالک ہیں۔

ظفر احمد پرواز کو شعر و خن کا شغف چونکہ بچپن ہی سے تھا اور شہر میں ہونے والے مشاعروں میں شوق سے شرکت فرماتے ہیں۔ مطالعے کے بے حد شوqین رہے ہیں۔ ساٹھ اور ستر کے دہے میں وہ ہندوستان کے سبھی چھوٹے بڑے ادبی جرائد کے سالانہ خریدار رہے ہیں۔ نوکری کی ذمداری کے سبب فرصت نہیں مل پانے کی وجہ سے رسائل میں کمی کرتے رہے۔ پھر بھی ابھی کچھ رسائل وغیرہ منگواتے ہیں۔

ظفر احمد پرواز فرسودہ روایت پرستی کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔ چونکہ پرواز، عقیل، غوری دونوں سے عمر میں چھوٹے تھے اس لئے زندگی بھر دونوں کا ادب کرتے رہے اور دونوں بزرگ شانہ بہ شانہ کوٹھ کی تمام تر ادبی سرگرمیوں میں ہم سفر بھی رہے۔ جو بھی شاعری پرواز نے کی ہے وہ بہ شعر نظم کئے ہیں جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ابھی تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ آنے والے نظمیں بھی کہیں ہیں اور تمثیلی نظموں کو بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ ان کی ایک نظم "کی حالات حاضرہ کی عکاسی اور ہنی کشیدگی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اسی طرح ان کی دوسری نظمیں "احتجاج" ، "شبہنم" ، "عرفان کی روایت" وغیرہ قاری پر بھی بھر پور تاثر چھوڑتی ہے۔ ۱۹۶۲ء چین کے ناپاک حملہ سے متاثر ہو کر مسدس کی طرز پر "ایک شکایت" ، "ہالیہ" کے نام سے لکھی مقبول ہوئی ہے۔ آپ کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

کب سے کھڑا ہوا ہوں در پچ کے سامنے
گر تو نہیں تو سایہ ہی چلتا دیکھائی دے
گر ہے نظر بلند، تجسس ہو اوچ پر
چشمہ اسی زمین سے ابلتا دیکھائی دے

تیرے خیال تیرے بھر کے ویلے سے
تصورات میں ہم سے ملی ہے تنہائی
جمال یار میں کھویا ہوا ہے سناٹا
خیال یار میں ڈوبی ہوئی ہے تنہائی

اُسی کے شوخ بدن کی ضرورتوں کی طرح
تمام رات سُلگتی رہی ہے تنہائی

جدید لمحے میں جذبات و حالات کی عکاسی پر عبور ہے۔ رومانیت اور عصری حیثیت مزاج میں رچی بسی ہے۔ نظمیں اور غزلیں دونوں کہتے ہیں۔ اب کم سے کم اور ٹھہر ٹھہر کر شاعری کر رہے ہیں۔ مصروفیت دم نہیں لینے دینی کلام نشر اور شائع ہوتا رہا ہے۔ ”^{۲۵}

غزل:

شہر ہوں لباس بدلتا دکھائی دے
تیرے بغیر ہوا کا جسم بھی جلتا دکھائی دے
کب سے کھڑا ہوں در تچے کے سامنے
گر تو نہیں تو سایہ ہی چلتا دکھائی دے
اکثر لگا ہے ایسا شب یار میں مجھے
ہمراہ میرے جیسے وہ چلتا دکھائی دے
گر ہو نظر بلند، تجسس ہوا وجہ پر
چشمہ اسی زمین سے اُبلتا دکھائی دے
شکوہ ہے دوستوں کو مرے کرب کا وجود
سیماں کی طرح سے مچلتا دکھائی دے
پرواز جب بھی شعر کہے یوں لگا مجھے
الفاظ کا وجود پکھلتا دکھائی دے

نظمیں (شبہم)

رات کی حسین دیوی

بادلوں کا رتحہ لے کر

نور کی یہاں اور ہے

چاند کا دیا تھا مے

اپنے پیت سے ملنے

دن ڈھانکتی ہے

درد بھر کی ماری

بستیوں میں صحرائیں

ڈھونڈتی ہے پتیم کو

جو بھی نہیں ملتا

صح دم وہ جب تھک کر

پیٹھتی ہے ستانے

تب صبا کی نزاکت سے

دل میں ٹھیس اٹھتی ہے

اور وہ حسین دیوی

زار زار روتوی ہے

(لنبہ)

دیواروں کے اس جنگل میں

سب بے حس، سب بے مصروف سے

اپنے اپنے حال میں گم ہیں

لیکن ہر دیوار کا رشتہ

اک درجے سے بندھا ہوا ہے

توفیق کوٹوی

نام بشیر احمد، تخلص توفیق۔۔۔ ارمارچ ۱۹۲۹ء کو جمال راپاٹن ضلع جھالاواڑ میں پیدا ہوئے۔ ضلع جھالاواڑ ہاڑوتوی کھلاتا ہے، کچھ عرصے بعد والد صاحب کی ملازمت کے سلسلے میں نقل مکانی کر کے اہل خانہ کے ہمراہ کوٹہ آگئے۔ ہر برس کانج کوٹہ سے ۱۹۵۰ء میں بی۔ اے۔ کیا اور جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل کی سندی۔ حاجی محمد شکور صاحب ۱۹۳۲ء میں حکماء پی۔ ڈبلو۔ ڈی میں ملازم ہوئے اور کوٹہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ توفیق کوٹوی کی پوریش یہی ہوئی اور ریلوے میں اسٹینٹ اسٹینشن ماسٹر کے عہدے پر فائز ہوئے اور ملازمت کا اختتام ۱۹۸۴ء میں بطور اسٹینشن سپرننڈنٹ ہوا، اسی سال جب بیت اللہ سے مستغیر ہوئے۔ دوبارا ۲۰۰۱ء اور ۵۰ کو ج کے لئے پھر رخت سفر باندھا۔ طبیعت مذہب کی طرف زیادہ مائل ہے۔ قدر درمیانہ، ناک اوپنجی، بھوئیں گھنی،

چہرے پر ڈاڑھی کا اضافہ اور تجسس آنکھیں ہیں۔ آوازِ ذرا باریک ہے، سادہ لباس اور قیافہ شناس ہیں۔ شعر و شاعری کا شوق زمانہ طالب علمی میں پیدا ہوا۔ مشورہِ سخن حضرت مفتول کوٹوی سے کیا۔ اب خود ان کا شمار استاد شاعروں میں ہوتا ہے۔

شخصیت میں زاہدانہ اور عطانہ صفات کی کارفرمائی ہے۔ ادب میں ان کا مسلک پند و نصائح سے عبارت ہے۔ غزل اور نظم دونوں اصناف پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ طنی اصلاح اور روایتی شاعری کے قائل ہیں۔ مقصد یہ ان کا شیوه ہے، زبان اور فن پر عبور حاصل ہے۔ مگر جوش میں کبھی کبھی حد سے گزر جاتے ہیں۔ ۲۶ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسas طبیعت کے ساتھ ساتھ ایک دور مندل بھی عطا فرمایا ہے۔ آپ ظلم و تشدد کا شکار ہونے والے مظلوم اور حالات و حادثات سے متاثر ہونے والے مجبوروں و بے بس انسانوں کے درد کو محسوس ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ اپنے اشعار کے ذریعہ انہیں جرأت ہمت کے ساتھ زندگی گزارنے اور مظالم کی سخت چٹانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی دیتے ہیں۔

جب توفیق کوٹوی نے بی۔ اے میں انگریزی ادب اختیاری مضمون میں لیا تو انہوں نے ٹالٹائے، فریڈرک، اینگلش جیسے مفکر شخصیتوں سے ناولوں اور افسانوں کو بھی پڑھا تو شیکھ جیسے مفکر کے انداز بیان سے بھی واقفیت ہوئی جیسا کہ ترقی پسندادیبوں کا نظریہ ہے کہ ”ترقی پسند تحریک کے رخ ملک کے عوام کی جانب مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ طبقے کی جانب ہونا چاہیے۔ ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حرکت، جوش عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور ان تمام آثار و بحثات کی مخالفت کرنا جو بمود، رجعت اور پست ہمتی پیدا کرتا ہے۔“ ۲۷

تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ توفیق کوٹوی پوری طرف اردو زبان و ادب کے ساتھ ہی میں حصہ لینے کے ساتھ انگریزی ادب سے بھی واقف تھے اور ترقی پسندوں کے ناولوں اور افسانوں کو پڑھا تو توجہ پوری طرح ترقی پسندیت کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ اور آگے چل کر یہ ان کی شاعری کا ایک عنصر بن گئی۔

توفیق کوٹوی کا گھر بیلو ماہول تو شعری اور ادبی ماہول نہیں تھا۔ ان کے والد سرکاری (پی ڈبلوڈی P.W.D.) ملازم تھے۔ ان کے دادا شعوری طور رجھا لراپاٹن کے ذمہ دار عزّت دار انسان تھے۔ تو ان کے بھائی بھی اچھی تعلیم حاصل کر کے اچھے عہدوں پر فائز رہے۔ یہ ضرور ہے کہ توفیق کوٹوی بذاتِ خود ہی دل چھپی لینے لگے اور مشورہ شاعر بزرگ مفتول کوٹوی کو استاد تسلیم کرتے ہوئے اصلاح سخن میں کامیاب رہے۔ جبکہ مفتول کوٹوی کے مشورے سے کئی دوسرے اہم شاعر جیسے اقبال، حافظ، ساحر لودھیانوی، علی سردار جعفری اور کیفی عظیٰ وغیرہ کے

کلام نے آپ کو بے حد متأثر کیا۔ تو اپنے ہم عصر شعراء سے بھی استفادہ کیا۔ اور آپ نے ان خوبیوں کو تو اپنی شاعری میں شامل کیا ہی ہے اس کے علاوہ اپنی ذاتی زندگی میں عملًا ان چیزوں کو شامل کر لیا۔

”یہ زمانہ توفیق کوٹوی کا غالباً ۱۹۲۹ء سے ۱۹۸۵ء کے درمیان کارہا ہوگا۔ جس نے توفیق کوٹوی کو شعرگوئی کی طرف مائل کیا۔ اب یہاں یہ بات غور و طلب ہے کہ جس وقت توفیق کوٹوی کی توجہ شعرگوئی کی طرف ہوئی تو کوٹہ کا ادبی ماحول کیسا تھا۔ اور اس وقت یہاں کون کون سی تنظیمیں موجود تھیں جن سے ان کی شاعری متاثر ہوئی۔“ ۲۸

کوٹہ کے شعر و ادب میں بزمِ ادب کی امتیازی شان ہے۔ ۱۹۳۵ء تا حال یہ بزم سرگرم اور متحرک ہے اس بزم کے صدر عقیل شاداب اور بعد میں توفیق کوٹوی بھی رہے ہیں۔ توفیق کوٹوی کا یہ دستور تھا کہ ہر ماہ مقرر تاریخ پر اپنے گھر پر طرحی نشستوں کا پروگرام رکھتے تھے۔ بزمِ سخن جومڑک کے اردو نوجوانوں کا طالب علموں تک کی ایک بزم تھی جس کا قیام ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۷ء کی عمل میں آیا اور پہلا مشاعرہ ۱۳ برداشت اور منعقد ہوا۔ اس کے بعد ہفتہ وار پابندی سے طرحی مشاعرے ہوتے رہے۔ سلیم کوٹوی اس کے صدر رہے یہ بزم بھی کچھ عرصے تھی۔ اس بزم سے توفیق کوٹوی و کوٹہ کے اہم بزم ادب کے رکن کو شاعری پروان چڑھانے کا موقع ملا۔

میلہ دشہرہ کوٹہ جس میں ملک گیر شہرت کے شعرائے کرام تشریف لاتے ہیں۔ اس موقع پر کئی کلچرل ادبی پروگرام کا انعقاد ہوتا ہے۔ ان پروگرام کا سلسلہ ۱۹۵۵ء سے شروع ہوا جس میں ہندی، پنجابی زبانوں کے الگ الگ مشاعروں کی بنیاد رکھی گئی اردو کا پہلا مشاعرہ جناب شاداب میر گھنی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ تب سے آج تک حسبِ معمول دشہرے کے موقع پر مشاعرے کا انعقاد ہوتا ہے۔ جس میں ملک گیر شہرت کے شعرائے کرام تشریف

تمام عمر رہا موت کا خیال مجھے
عروج پر بھی ہے اندیشہ زوال مجھے
پار کرنا ہے مجھے آگ کا دریا لیکن
پار یہ پاؤں کی لرزش نہیں ہونے دے گی

جب توفیق کوٹی کی غزل گوئی کا جائزہ عمیق انداز میں لیتے ہیں تو وہ نہ صرف جدید عہد کی ناہمواریوں اور جذبوں تک محدود ہیں بلکہ ان کے یہاں روایتی موضوعات پر جب نظر ڈالتے ہیں تو ان موضوعات میں بھی دلکشی اور رعنائی سے لبریز اثر انداز خیال کو لطف انداز نہیں پیش کرتے ہیں کہ قاری ان کو روایتی اور کلاسکی شاعر تسلیم کرنے لگتا ہے۔ عشق اصلیہ اور عشق نقلیہ میں ان کے عشق میں حقیقتِ نگاری کے جلوے موجود ہیں۔ کیوں کہ جس کا ہر انسان قائل ہوتا ہے اور یہ ہماری شاعری میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، عموماً شعراً کے کلام میں اس کا ذکر ہوتا ہے۔ کوئی شاعر ایسا شاید ہی ملے جس نے عشق کو استعمال نہ کیا ہو۔ جس کا کلام حسن و عشق کے جذبات سے خالی ہو تو مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ عشق ایک فطری جذبہ ہے جس کا اعتراف سمجھی کرتے ہیں اور کرنا بھی چاہیے۔ اسی سبب سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں تحریر فرماتے ہیں:

”جس طرح انسانی خواہشوں اور تمدناؤں کی تازگی میں کبھی کمی نہیں
آسکتی اسی طرح عشق و محبت کے لوازمات اور ان کی دلچسپیاں اور
رنگینیاں انسانوں کو ہمیشہ اپنی طرف مائل کرتے رہیں گے“ ۲۹

لیکن توفیق کوٹی میں عشقِ حقیقی ہے۔ وہ اپنی غزلیات کو دنیاوی محبت میں نہیں بلکہ خدا نے وحدہ لاشریک کے جلوے کو نمایا کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کسی شعر میں عشق کی بواسطہ محسوس کر سکتے ہیں جبکہ تمامی غزلیات کے اشعار پر و نصیحت اور خدا کے جلوے کو سمجھانے میں کافی ہیں، محبوب کی خوبصورتی کا بیان، محبوب کے وصال کی یاد یا محبوب سے جدائی کا غم محبوب سے شکوہ وغیرہ کا ذکر دلچسپ انداز میں نہیں کیا ہے بلکہ ایمانی محبت کے دیوانے اور جذبات نور خدا میں سرشار نظر آتے ہیں۔ ان کا ہر شعر کسی نہ کسی حقیقی صفت سے لبریز ہی پاتے ہیں۔ ان کے مجموعے ”سنہرے خوابوں کی تعبیریں“ کے غزلیات کو دیکھنے پر کوئی نہ کوئی ایسا عکس محسوس کرتے ہیں جس میں ایمانی کیفیات ضرور موجود ہے اور وہ بھی اس رنگ میں کہ سمجھی با آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نامحبوب کی یاد میں ڈوبے نظر آتے ہیں بلکہ محبوب حقیقی یاد کرنے کا راستہ بھی سمجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان کی غزلوں میں وطن پرستی، ملک میں بپا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات، جہیزی کی لعنت اور مناظر

بحسن خوبی کے ساتھ
م روشن کیا ہے۔ بطور

بالا نظم میں زندگی سے
ری میں فنا کاری رکھتے
لی پیش کیا ہے۔ ابتدا
لجم ”اللہ، بہت بڑا ہے،“

کہا جاتا ہے۔ توفیق کوٹوی کی نظم نگاری درد و غم، کرب و سک کے ایسے تیر را ہوں سے ہو کر گزرتی ہے جس کے تصور سے بھی عام انسانوں کے دل کا پنے لگتے ہیں۔ جیسی صفات توفیق کوٹوی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی سبب عوامی شاعر قومی شاعر کے خطاب سے نوازے گئے۔

توفیق کوٹوی کو تجربہ بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ وہ زندگی کا تماشہ دور سے کسی خاموشی تماشائی کی طرح نہیں دیکھتے بلکہ خود زندگی کے جھمیلوں میں دچپسی لیتے ہیں۔ ان کی قوتِ مشاہدہ اتنی تیز ہے کہ ان کی جزئیات تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ وہ جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اُسے اپنی روح میں جذب کر کے اپنی شاعری کے ذریعہ دنیا کو لوٹا دیتے ہیں۔ انہیں خیال پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

”دنیا کو کتاب سے پڑھا اور استاد سے سیکھا بھی جاتا ہے مگر دل زندہ ہو تو آنکھوں سے اور کانوں سے پیا بھی جاسکتا ہے۔“ ۳۵

توفیق کوٹوی اپنی نظموں میں ماحول، حالات اور دور حاضر پر تبصرہ کرتے ہیں تو فرضی اور خیالی سماں پیش کرنے کی بجائے وہ ہندوستانی روایت کی پچی تصور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کی نظموں کے مطالعہ سے زمانے کی معاشرت اور سماجی حالات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

”اپنی نظموں اور غزلوں میں انہوں نے بہت آسان زبان استعمال کی جو ہر خاص و عام کے آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے، توفیق کوٹوی کا پہلا شعری مجموعہ ”خیال و جمال بھی دیوانہ گری“ بہت مقبول ہوا۔ اور امید ہے کہ مجموعہ جوار دور سم الخط ”سنہرے خوابوں کی تعبیریں“ میں ہیں بڑی شهرت کا حامل ہو گا۔ اس میں خاص طور سے نظمیں مجھے بچالو، کون ہوتم، جہیز، امن اور جنگ، خدا کے بندے دہشت گرد نہایت پاکیزہ، پڑھنے کے قابل نظمیں ہیں۔“ ۳۶

توفیق کوٹوی ایک کامیاب شاعر ہیں نظموں اور غزوں میں اپنا ایک منفرد نگ پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ تو فکر و فن دونوں کو کیجا کر کے شاعری کو خاص مقام عطا کرتے ہیں۔ وہ تصنیع و تکلف سے پاک ایک پڑھنے خلوص شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت کا عکس ہمیں ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں تصنیع اور تکلف کی جگہ ایک فطری بے ساختگی اور ملابغہ کی جگہ حقیقت پسندی کا احساس ہوتا ہے۔ طرزِ بیان میں دلکشی اور

مضامین کو بھی بڑے دلش اور شگفتہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں میں اعلیٰ درجے اور منظر کشی کے نمونے ملتے ہیں۔ ہندوؤں کے تاریخی واقعات اور مذہبی تصورات کو بیان کرتے جذبات میں ڈوبی ہوئی اپنی نظموں کی وجہ سے ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔ ۳۲

چمک رہے ہیں زمین آسمان آنکھوں میں
یہس کا عکس ہے ان کی جوان آنکھوں میں
تمہاری دید کا طالب ہوں دیکھ لو آ کر
مریض ہجر کی باقی جان آنکھوں میں
حیا سے اوڑھ لی چادر کسی نے یہ کہہ کر
کھٹک رہا ہے کھلا آسمان آنکھوں میں
میں ان کے موچ طلام تم میں ڈوب جاؤں گا
کہاں سکون کہاں اطمینان آنکھوں میں
وہی فساد وہی ذات پات کے جھگڑے
ابھی بھی ہیں وہ سلکتے مکان آنکھوں میں
خوشی سے سب کو دما حوصلہ مگر تو قیق

اور مشاعروں کی اسٹچ پر کامیاب و کامران رہے۔ پہلا شعری مجموعہ ”پکوں کے سائے“، دیوناگری رسم الخط میں ۱۹۷۴ء میں شائع ہو گیا تھا اور ایک شعری مجموعہ بعنوان ”اداس لمحوں کے موسم“، ۱۹۸۰ء، ”وہ چاند چہرہ سی ایک لڑکی“، ۱۹۸۲ء اور ”تلقیدی مضامین کا مجموعہ“، ”تلقید اور تاثر“، زیر طبع ہیں۔

مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن غزل سے خصوصی رغبت ہے گو کہ ترقی پسند انجمن سے والبستگی رہی ہے اور احباب بھی ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ان کے کلام میں جدید حسیت کی کارفرمائی ہے۔ دراز قد، گول چہرہ، روشن آنکھیں، لمبی ناک اور گندومی رنگ کے پرکشش انسان ہیں۔ فروعِ اردو کے لئے کوشش رہتے ہیں۔ ۱۹۸۶ء سے گورنمنٹ کالج کوٹہ میں پیکچر رہوئے۔ کئی ادبی اور علمی انجمنوں سے وابستہ ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں راجستان اردو اکادمی سے اعزاز و انعام حاصل ہو چکا ہے۔ ۳۳

آپ کا گھر یلو ماہول شروع سے ہی ادبی رہا۔ آپ کو شاعری سے بے پناہ محبت ہے۔ ان کے استاد محترم ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین مرحوم جب پیکچر کے دورانِ نظم پرنٹر کو فو قیت دیتے ہوئے دلائل پیش کیا کرتے تھے تو ان کی سحرانگیز شخصیت اور طرزِ کلام کی وجہ سے ان کا دل نشر کی طرف مائل ہوا اور شاہین صاحب مرحوم کی تربیت کی بدولت ان کو نشر نگاری سے شفف پیدا ہوا۔ اس سبب ان کا خیال ہے کہ ادب پارے کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہیئے اور ادیب کو اپنی سماجی زمہ داری کا احساس بھی ہونا چاہیئے۔ ان کے والد بنیاد علی خان نے ان کی تربیت کی خاطر زندگی کے چالیس برس تہاگز اردو یئے۔ اور بہتر تعلیم دلانے میں کوئی قصر نہ چھوڑی یہی وجہ رہی کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ پیکچر اردو بنے۔ اور گورنمنٹ پی جی کالج کوٹہ کے صدر شعبہ اردو سے صدر بھی رہے۔ فاروق بخشی نے ایک جگہ تحریر کیا ہے :

”میں نے جس گھر میں آنکھ کھوئی، اس کے درود یوار پر تہائی اور اداسی کی چادر تھی

بھوئی تھی، مضموناً دواز دا، اونچا دیوار، وا، اون، بڑھ رہا، الانوا، وا، والو،

فاروق بخشی اور احتشام اختر دونوں کوٹھ کا لج میں دوستانہ مراسم رکھے ہوئے سر زمین کوٹھ کے ادبی فضا کو ہموار کرنے میں دل و جان نچھا ور کیا۔ یہاں کے مشاعروں میں آپ کی شرکت ہوتی رہی تو شاعروں سے بھی بہتر مراسم رکھتے ہوئے۔ ”حسین خوابوں کی تعمیر“، میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ ”پکوں کے سائے“، ”اُداس لمحوں کے موسم“، ”تلقید و تاثر“ کے علاوہ تلقیدی مضامین کا مجموعہ ”مفاہیم“ ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا ہے ”ساغر نظمی حیات اور کارنامے“، تحقیقی مقالہ ۲۰۰۴ء، ”راجستان میں جدید اردو غزل“، زیر طبع ہیں۔

اس کے علاوہ دودر جن سے زائد کتابوں کی ترتیب و تدوین میں معروف ہماتر رہے ہیں۔ ۳۵
اردو کا معروف نام اور فاروق بخشی کے استاد پروفیسر بشیر بدر نے انہیں اپنے الفاظ سے اس طرح نوازہ ہے۔

”فاروق کے اچھے شعروں میں نغمگی ہے۔ یہ نغمگی حقیقتِ منتظر کی قوالي ہے، نہ جگر جلے کی سرمستیوں کا رندانہ ترنم، نہ غالب کے فارسی زدہ اشعار کا دفعہ چنگ پر ہنگامہ ہے، بلکہ ہر دل کے اندر بہت چکپے سے گنگنا نے والا روح کانغہ ہے۔“ ۳۶

فاروق بخشی نے ان مرحومیوں اور اداسیوں کو شعری پیکر میں ڈھال کر جو نغمگی عطا کی ہے وہی ان کی غزل کا سرمایہ ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

میرے بزرگوں کا لہجہ میری و راست ہے
میں چپ رہوں بھی تو بولے زبان کی خوشبو

زندگی کی دھوپ میں تپتا ہوا صحراءوں میں
اس کی آنکھوں کے سمندر میں مگر رہتا ہوں میں

رشته زمیں سے ٹوٹ نہ جائے خیال رکھ
آخر یہیں پہ آنا ہے اوپھی اڑان سے

شب بھر کسی کی یاد کے سائے جوں رہے
 سورج اُگا تو کوئی مرا آشنا نہ تھا
 فاروق بخشی کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے استاد بشیر بدرا ایک جگہ لکھتے ہیں:
 ”فاروق بخشی نے آج کے نوجوان کی نگاہ سے دنیا کو قبول کیا ہے۔
 اس بُری اور مکار دنیا کے خلوص اور حُسن کو تلاش کیا ہے۔ ان کی
 شاعری میں پیغامی، اصلاحی اور کتابی زندگی کے نظریات کا
 نہیں ہے، بلکہ وہ زندگی کے ایک پھول کی Versification
 طرح ہوا کی کوشبو سے ملے ہیں۔ تمام محرومیوں، ناکامیوں،
 اندیشوں کے ساتھ زندگی اور اُس کے حسن کو دھڑکتے دلوں کے
 نغمات بنانے میں جس دھوپ چھاؤں کو فاروق بخشی نے الفاظ
 میں اسی رکیا اس سے ان کی غزل لاکھوں دلوں کا نغمہ بن جاتی ہے۔ ۳۷

”ایک نوجوان، اس کا تصوراتی محبوب، خوبصورت گھر، گھر کی ماں وسخوبو،
 گھر کے مسائل کی دھوپ سب اپنے اندر حسن رکھتے ہیں۔ خوابوں میں
 حسن ہے مگر جا گئے اور جدوجہد میں بھی حسن ہے۔ اس راز کو فاروق بخشی
 نے چپکے سے جانا اور آہستہ سے کہا ہے،“ ۳۸

فاروق بخشی ایک ایسا خموشی نام اور ایسی خموشی شخصیت ہے جس کے اندر یا جس کے آس پاس
 کوئی ہچل وابستہ نہیں، اس میں طوفان کے بعد آنے والی خموشی ہے۔ سنجیدگی اور سادہ روی میں ہی
 انہوں نے اپنے شعری مزاج کی تربیت کی ہے۔ لبھ کا دھیما پن، زبان کی سادگی نے فاروق کی
 شاعری کو یک سوز عطا کیا۔ ان کی شاعری کی یہ اہم خصوصیات ہے۔ ”پلکوں کے سائے“ اور
 ”اداس لمحوں کے موسم“، دونوں شعری مجموعے نہ صرف اپنے عنوان، بلکہ اور اق بھی اس کی گواہی
 دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۳۹

شور کیسا ہے یہ کہ ہواؤں میں
 کون روتا ہے ان فضاوں میں

جن شعروں پر دنیا والے جاں دیتے ہیں سرد ہنتے ہیں
اے جاں غزل! کیا ان کو خبر ہم کس کو پکارا کرتے ہیں

لکھ رہی ہے دھوپ میرے جسم پر اپنی کتاب
سب پڑھیں گے شوق سے جس کو وہی قصہ ہوں میں
فاروق بخشی کی شاعرانہ شعور پر تنقیدی تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حسن آر لکھتی ہیں:
”فاروق بخشی کے شعروں میں عصری شعور بھی ہے، مسائل زمانہ کا عکس
بھی، نوجوان جذبات اور نئی حیثیت بھی ہے۔ غمہ نے کائنات کے باوجود
زیرِ لب تبسم بھی، زندگی سے متعلق پڑامید اور رجائی نظریہ ہے۔
صداقت، جرأت اور بے باکی اور اپنے احساس کو منفرد انداز میں بیان
کرنے کا سلیقہ بھی ہے۔“ ۵۰

ڈم ڈم کوٹوی:-

نام محمد بخش تخلص ڈم ڈم م۔ می ۱۹۱۷ء میں کوٹہ شہر میں پیدا ہوئے لیکن بدشمتی رہی کہ کم عمری کے زمانے میں والدین کا سایا ان کے سر سے اٹھ گیا۔ پھر بھی ڈم ڈم کوٹوی نے خود کو حالات کے دھارے میں بہنے نہیں دیا۔ بلکہ آلام، مصائب کا سامنا کرتے ہوئے جہاں کی طرح مردانہ وار مقابلہ کیا۔ آپ کے پھوپھا اور پھوپھی نے صغر سنی میں ہی گود لے لیا، پروش و پرداخت کی اور اپنی وراثت سے نوازا۔ بارہ سال کی عمر میں پھوپھا پھوپھی کے ساتھ بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے اور ہمیشہ حاجی ڈم ڈم کوٹوی کہلائے۔ ایک جگہ پر فسیر فاروق بخشی لکھتے ہیں:

”انسان کے مصائب اور اس کے دکھ رہی اس کی شخصیت کے پوشیدہ جو ہر کو نمایاں کرتے ہیں۔ ڈم ڈم صاحب نے خود کو حالات کے دھارے میں بہنے نہیں دیا۔ چمبل کو اپنا آئندہ میں بنایا اور جہاں کی طرح حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔“ ۵۱

جب ہر بڑ کالج کی دھوم چاروں طرف تھی۔ دور دور سے علم سیکھنے کے لئے کوٹھ آنے والوں کی تعداد کی خوب تھی۔ اور راجستان بھر میں ہر بڑ کالج کی دھوم تھی، اس وقت اردو فارسی حافظ حکمت علی تھے، اس محمد بخش نے تعلیم حاصل کی۔ اس وقت کے استاد تعلیم کی منازل طے کراتے تھے تو طالب علموں میں بکا شعور بھی پیدا کرتے تھے۔ محمد بخش کو حافظ حکمت علی نے ایسا نوازا کہ راجستان کے درخشنده اردو طنز معزز شاعر بن کر ابھرے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ڈم ڈم کوٹوی کی دلی خواہش تھی کہ جب فیل ہو جائیں گے تو دینے۔ اس سبب وہ مٹرک فیل ہوتے ہی پڑھائی کو الواقع کہکر صابن سازی کرنے لگے۔

ن کی طبیعت سنجیدہ تھی۔ سنجیدہ شاعری کرتے بھی تھے، لیکن کچھ مدت بعد اپنی زندگی میں مصائب کم نہیں طنز و مزاح کی کتابوں کے حوالے اور دیگر شاعروں کے کلاموں کا سہارا لیکر طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کی مرکھا۔ اپنی پہچان بنانے میں کامیاب بھی رہے۔ مزاحیہ شاعری میں اکبر کو ہمشہ فو قیت حاصل رہی، کیونکہ بہتر اور اچھو تے انداز میں اکبر اللہ آبادی نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کی ترجیحی کی سے سہلے کوئی کرسکا اور نہ ان کے بعد آنے والے مزاحیہ شاعر اس سے بہتر مثالیں پیش کر سکیں۔

وقت لگتا نہیں تعمیر مکاں میں ڈم ڈم
 ہاں اجازت میں تو چھ سال گزر جاتے ہیں
 جو چھلے سال صابن لے گئے دوکان سے میری
 وہ کرنے لگ گئے ہم سے کنا راسن تر سیٹھ میں

وہ صرف مقام کوٹھ ہی کے مسائل کو نہیں پیش کرتے بلکہ ڈم ڈم کے کلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ملکی اور عالمی مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ ملک کوکس طرح کے مسائل درپیش ہیں، اور چاہتے ہیں کہ صرف نعروں سے نہیں بلکہ مسائل کا حل دیانت داری اور خلوص سے ہوگا۔ جیسے فرماتے ہیں۔

ایک لیڈر سے کہا میں نے کہ عالمی مرتب
 مجھ کو قومی ایکتا کا مدعا سمجھا یئے
 ہنس کر بولے یہ ہمارا کام ہے بس آپ تو
 ووٹ دیجئے اور لمبی تان کر سو جائیے

”قطع صنف سخن کو ڈم ڈم کوٹھی محبوب جانتے ہیں۔ چار مصروعوں میں ڈم ڈم صاحب بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں اور اس طرح کی خوبی توفیق کوٹھی کے کلام میں بھی موجود ہے۔ جیسے ڈم ڈم صاحب فرماتے ہیں۔ ۲۳۵

میں ٹماڑ ہوں عجب سرخ ہے رنگت میری
 دانا سمجھنے مجھے لوگ کہنا دا ان ہوں میں
 اپنی عیاری و مکاری و پروفن کے سبب
 ہوں تو نا اہل مگر صاحب دیوان ہوں میں

”موضوع شاعری کی جان ہوتا ہے۔ خاص طور پر مقصودی شاعری کے لئے یہ بات اور بھی ضروری ہے لیکن کبھی کبھی فن پارے کی ہیئت بھی اس کی نشوونما میں معاون ہوتی ہے۔ مثلاً ڈم ڈم صاحب اپنی نظمیں غزل کے فارم میں کہتے ہیں۔ مگر ان کی غزلوں کی ردیفوں کا انتخاب ان کی سلیقہ گوئی کی مثال ہے۔

ردیف خود بولتی ہے اور مزاح پیدا ہوتا ہے۔“ ۲۳۶

۱۹۹۷ء میں راجستان اردو اکادمی سے اعزاز و انعام حاصل کر چکے ہیں۔ اور وظیفے سے بھی مستفید ہوئے ہیں۔ اکادمی نے ایک شعری مجموعہ "شگوفہ" حال ہی میں شائع کیا ہے۔ ۲۲
چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جھولتا ہوں رات بھر آدھا ادھر آدھا ادھر
آشیاں ہے شاخ پر آدھا ادھر آدھا ادھر
صورتِ شداتِ حرمت ہی میں گر کر مر گیا
غیر باب پار پر آدھا ادھر آدھا ادھر

عشق بھی ہوتا رہے چلتی رہے دکان بھی
وقت ہو ڈم ڈم بسرا آدھا ادھر آدھا ادھر

آج کل ایمانداروں کا لقب ہے یوقوف
اسے اُلٹے دور میں رشوٹ نہ کھائے وہ گدھا

کاش مل جائے تو پی لیں آج ہی آبِ حیات
چھوڑ کر دنیا جو دنیا سے جائے وہ گدھا

آزادِ ارمی:-

نام شریف حسین خاں۔ والد کا نام شرافت حسین خاں شائق اور قلمی نام آزادِ ارمی ہے۔ ۱۹۸۰ء تک تعلیم اتنا ضلع باراں میں پیدا ہوئے۔ ہوش سننچا لتے ہی کوٹہ میں سکونت اختیار کی۔ تعلیم ہائر سینکڑی اور ادیب ماہر تک حاصل کی۔ سرکاری مدرس بطور پیشہ چھتی۔ حضرت ارم عمر پوری سے تلمذ ہیں۔ شاعری کا آغاز ۱۹۶۲ء میں ہوا۔

میانہ قد، گندمی رنگ اور مناسب ناک و نقشے کے انسان ہیں۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر غزلیں کثرت سے کہیں ہیں۔ ادبِ انجمن "بزمِ سخن" کے صدر رہے۔ اس کے تحت کل ہند مشاعرہ کراچے ہیں۔

سووینیر ”صدائے چمبل“ کے عنوان سے مرتب کئے ہیں۔ شاعری میں رنگ قدیم و جدید کا امتزاج ہے، غالب رجحان روایتی ہے، مذہبی مزاج رکھتے ہیں۔ اردو اور مذہب کی خدمت میں وقت گزرتا ہے۔ شاعری میں سادگی ہے، کوئی الجھاو یا بہام نہیں ہے۔ ۱۹۹۹ء میں ایک مجموعہ غزلیات بعنوان ”اضطرار“ دیوناگری رسم الخط میں شائع ہو چکا ہے۔ ۵۵

غزلیں:

دور کی رشتہ داری رکھنا
پاس نہ یہ بیماری رکھنا
باہر ہیں بے رحم ہوا تین
دروازوں کو بھاری رکھنا
کیا جانے کیا کام پڑے کل
وہ من سے بھی یاری رکھنا
رہبر ساتھ چلے یار ہرن
رستے میں ہوشیاری رکھنا
لازم ہے اس دور ہوس میں
دل رکھنا ولداری رکھنا
بچنامت آزادِ قلم کو
حسن سخن معیاری رکھنا

☆☆☆

ہے کون شہر میں جو مجھے جانتا نہیں
لیکن وہ ایک شخص ہی پہچانتا نہیں
ہوتا ہے زندگی میں وہی شخص کامیاب
جو زندگی سے ہار کبھی مانتا نہیں
منزل مجھے ملنے ملے یہ میرا نصیب
میں در بدر کی خاک مگر چھانتا نہیں
آزادِ ایسے وقت سے محطا ط ہی رہو
جودوستی کی لاج کو گردانتا نہیں

اکرام راجستانی:-

نام اکرام الدین، والد صاحب کا نام ماسٹر علاؤ الدین خان اور قلمی نام اکرام راجستانی، ۸ رجولائی ۱۹۷۶ء بمقام چومو (راجستان) پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے ہسٹری میں کیا، اور بی ایڈ کی سندی، ہندی اردو راجستانی تینوں زبانوں میں شعروادب کی خدمت کرتے ہیں۔ ریڈ یو اسٹیشن میں ایڈیشل اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔

قد بالا، چہرہ لمبا، آنکھیں تیز، ناک اوپھی، نتھنے چوڑے، رنگ سانولا اور متاثر کن شخصیت کے مالک ہیں۔ اچھے انا و انسر، اچھے گا یک اور بہت اچھے شاعر ہیں۔ طبیعت میں انکساری ہے، ملنسار انسان ہیں۔ قرآن مجید کے اکیسویں پارے کا ہندی اور راجستانی میں شعری ترجمہ کر چکے ہیں۔ اردو میں غزل سے رغبت ہے۔ ”دور کے رنگ“، مجموعہ غزلیات اور ”سکون“، غزل کا انتخاب ۱۹۹۸ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ دونوں کتابیں دیوناگری رسم الخط میں چھپی ہے۔ کسی سے تلمیذ نہیں، اپنی افتادِ طبع کے اسیر ہیں۔ متعدد کیسٹ اور رکارڈ ان کے گیتوں کے نکل چکے ہیں، ان کا تعارف چند جملوں میں کرانا مشکل ہے۔ یہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، ان کی غزلوں میں وقت کا دل دھڑکتا ہے۔ اور سماج کی پرچھائیاں لرزتی ہیں۔ ایک عرصہ سے آ کا شوانی کوٹھ میں سہا یک نردیشک رہے ہیں۔ ۲۶

غزلیں:

جن کے کچے مکان ہوتے ہیں
ان کے دل آسمان ہوتے ہیں
اہلِ زر کے طویل زخموں کے
پیڑھیوں پر نشان ہوتے ہیں
اُن کے چہرے نہیں ہوا کرتے
جن فصیلوں کے کان ہوتے ہیں
صرف ماں باپ کی دعاوں سے
گھر میں بچے جوان ہوتے ہیں

درد مزدور کا بچھونا ہے
اور غم سائیبان ہوتے ہیں
جو بھی مر ٹھتے ہیں محبت میں
ان کے قصے بیان ہوتے ہیں

جسم کا غذ کا جان کا غذ کی
زندگی داستان کا غذ کی
قلم بھی خرید سکتا ہے
کتنی اپنی اڑان کا غذ کی
حکمرانوں سے جب کبھی ملنا
منہ میں رکھنا زبان کا غذ کی
ان کا دھندا دیا سلامی کا
اور اپنی دکان کا غذ کی
تم بھی اکرام کیا نبھاؤ گے
جھوٹی یہ آن بان کا غذ کی

شکور انور:-

نام عبد الشکور الانصاری ہے۔ والد صاحب نام چھوٹے خاں الانصاری۔ قلمی نام شکور انور ہے۔ ۸ مارچ ۱۹۵۲ء کو کوٹھ میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے۔ کے دوسرے سال تک تعلیم حاصل کی۔ اور بعد میں ادیب کامل کی سند لی۔ تلمیذ کسی سے نہیں ہیں۔

سرکاری اسکول میں درس و مدرس کے پیشے پروفیسر ہیں۔ شاعری اور ملازمت کا آغاز ۱۹۷۷ء سے ہوا۔
مشاغل: کیرم، شطرنج، سیر و سیاحت اور کتب پر منی ہیں۔ غزل کے بند ملاحظہ ہوں:

پھول پتے، پیڑ، شاخیں، چاندنی میں
سب کے سب جیسے نہاتے روشنی میں

قد نکلتا ہوا، چہرگول، خوبصورت آنکھیں، ذہین شخصیت، ناک اوپھی اور گندومی رنگ کے حامل ہیں۔
نظمیں اور غزل دونوں کہتے ہیں۔ مگر طبیعت غزل کی طرف زیادہ مائل ہے۔ عصری زندگی کی عکاسی اشعار کی
خصوصیت ہے، فارسی کی بوجھل تراکیب سے گریزاں ہیں، ہمیشہ نئے موضوعات اور مضامین کی تلاش میں رہتے
ہیں۔ جدید شعری روایت سے قریب ہیں، ان کا کلام پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ رسائل، ریڈیو اور ٹی وی سے نشر
و اشتاعت کا سلسلہ رہا ہے۔

ہندی میں ایک کتاب ”ہم سمندر سمندر گئے“ ۱۹۹۲ء میں راجستھان ساہیتہ اکادمی کے تعاون سے غزلوں کا مجموعہ
شائع ہوا۔ ۲۰۰۲ء میں ولپ پرکاش کے ذریعہ ”مختصر مجموعہ کلام ”محوسف“ کی اشاعت عمل میں آئی۔
غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

مفلسی میں سکون ہے انور
اپنے دن بھی کوئی بُرے تو نہیں

آپ کی ولپ انجمن، شعر و ادب اور ہم سخن جیسی ادبی تنظیموں میں حصہ داری رہی ہے۔ اردو ہندی کے
مختلف رسائل میں تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں جن میں ”شبِ خون“، ”شاعر“، ”نخلستان“، ”ایوان اردو“،
”توازن“، ”جدید فکر و فن“، ”اسباق انشاب“، ”قومی محاذ“، ”پیش رفت“ اور ”شیش مدھوتی“ کاویہ“،
”سیمودھن“، ”ساہتیہ“، ”بھارتی“، ”ابھی ویکتی“، ”غیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۹۹۳ء میں ماجیہ، سگرہ، ”دریا، لہریں اور کنارہ“، ”شائع ہوا۔ ”آندھیوں سے مقابلہ ہی رہا“، ”پھر یلی
جھیلیں“، ”گنمam ساجزیرہ“ اور ”ہم سے قلم نہیں نکلا“، ”یہ تیری گھرائی ندی“ کے عنوان سے غزلوں کے فولٹر
شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ ”بادل کے رتھ“، ”شیشے کامکاں ٹھیک نہیں“، ”روشنی کانیا ستارہ“، منزلوں کا نشان
ہونا تھا کے عنوان سے بھی غزلوں کے فولٹر شائع ہو چکے ہیں۔

بقول شکوانور:

اردو زبان و ادب سے مجھے بچپن تی ہی دچپسی رہی ہے۔ شعری
نشستوں میں جانا بیٹھنا، مشاعروں کو سنتنا، اردو سے متعلق
جلسوں میں شرکت کرنا میرا معمول تھا۔ ۲۱۹۷ء میں

کوٹھ میں ادبی سجھا کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان کل ہند
مشاعرہ منعقد ہوا۔ یہ پروگرام محترم عقیل شاداب صاحب نے
منعقد کیا تھا۔ اس میں ملک کے نامور شاعروں، ادیبوں،
نقادوں نے حصہ لیا تھا۔ ایسے اعلیٰ درجے کے اردو والوں سے
ملکر میرے اندر بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ اور طبیعت اس
طرف راغب ہوئی۔“ ۲۵

غزل:

بنے گا اس کا ستارہ تو جنت چمکے گا
رکھے گا تاج وہ سر پر تو تخت چمکے گا
اگر چہ راہ کا پتھر ہوں تم چھوڑ تو سہی
تمہارے لمس سے یہ سنگ سخت چمکے گا
فلک پڑھتے تارے کی روشنی دیکھو
پڑھی چوت تو دل لخت لخت چمکے گا
مٹانہ پائے گی بھلی میرے نشمن کو
اگر یہ کر بھی گئی تو درخت چمکے گا
ستارے اصل میں پتھر کا جسم رکھتے ہیں
کبھی تو میرا وجودِ درخت چمکے گا
تمہاری یاد کا جگنو ہی ساتھ چلتا ہے
اندھیرہ ہوتا ہوا نور یہ رخت چمکے گا

خوش نصیبی سے دم نہیں نکلا
ورنہ قاتل بھی کم نہیں نکلا

لوگ نکلے ہیں لے کے تلواریں
 اور ہم سے قلم نہیں نکلا
 اس کی باتوں میں ہے غرور بہت
 اس کے لمحے میں ”ہم“، ”نہیں“ نکلا
 جن کی دانشوروں میں گنتی تھی
 ان کی باتوں میں دم نہیں نکلا
 ہم نے کوشش تو کی تو بہت انور
 دل سے دنیا کا غم نہیں نکلا

شکور انور کی کتاب جس کا عنوان ”دریالہریں اور کنارہ“ ہے ماہیوں پر مشتمل کتاب ہے۔ مثلاً

ماہیہ

اقرار ادھورا ہوں
 میں ان کی کہانی کا
 کردار ادھورا ہوں

ملنے بھی نہیں دیتے
 دوپھول محبت کے
 کھلنے بھی نہیں دیتے

نم دیکھ رہے ہیں کچھ
 قاتل کی نگاہوں میں
 ہم دیکھ رہے ہیں کچھ

کیا آنکھ میں جالا ہے
 کیوں صاف نہیں دیکھتا
 یہ کیسا اجala ہے

آرام طلب کیوں ہو
خود اپنی تباہی کا
خود تمہی سبب کیوں ہو

کشتشی کو بچالا وہ
یوں حوصلہ کھونے سے
بہتر ہے کہ لوٹ آؤ

منزل کی خبر رکھو
لوٹے نہ کوئی رہن
رستے پر نظر رکھو

دریا کی روائی کیا
سیلا بند لائے تو
برسات کا پانی کیا

وہ گزرے زمانے تھے
اشکوں نے کئے ظاہر
جودل کے خزانے تھے

سحراؤں میں گھر رکھا
قسمت نے صدامیرے
پاؤں میں سفر رکھا

حیوان و چرندے بھی
انسانوں سے بہتر ہے
جنگل کے درندے بھی ۲۸

نظمیں:

آسمانوں، زمینوں، سمندر کے مالک بتا
تیری دنیا میں کیوں اتنا اندھیرے
تیرے انسانوں کو تیرے انسان سے
کس قدر بیڑہے
پھیرہی پھیرہے

آسمانوں، زمینوں، سمندر کے مالک بتا
کیوں تیرے نام پر
لوگ لڑتے رہے
کتنے مرتے رہے

دوسرے ہی خلیفہ تھے حضرت عمر
شہر میں گشت کرتے تھے جورات بھر
دیکھتے تھے رعایا کی تکلیف کو
جو مسائل بھی درپیش آئے انہیں
حل نکالے کئی اپنی تدبیر سے
فرق اچھے بُرے میں کیا سوچ کر
اور فاروق اعظم لقب پا گئے
کیا ہمیں یاد ہے

فاروق انجینئر:-

نام محمد فاروق خاں نربان، والد صاحب کا نام ذوالقدر علی خاں نربان اور قلمی نام فاروق انجینئر ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۰ء کو سیکر (شیخاوائی) میں پیدا ہوئے۔ بی اے (انجینئر نگ کی ڈگری، الیکٹرونک کمیونی کیشن) میں لی، پہلا تقریباً رہنمای پاور پروجیکٹ کوٹھ میں بحیثیت جو نیر انجینئر ہوا۔ اور ۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۵ء کوٹھ میں، ہی سکونت رہی ہے۔ ایک معزز گھرانے میں شادی ہوئی۔ شاعری کا شوق شروع ہی سے تھا۔ مگر بحیثیت شاعر اپنے آپ کو کوٹھ میں دریافت کیا۔ کسی سے اصلاح نہیں لی، اپنے ذوق و شوق کی رہبری میں ہی شعری سفر طے کیا، ۱۹۹۵ء کے بعد سے جو پور میں قیام ہے۔ نظم و غزل دونوں کہتے ہیں۔ دو ہے اور دیگر اصناف میں بھی کچھ نہ کچھ کہا ہے لیکن بنیادی طور پر غزل کے ہی شاعر ہیں۔

قد میانہ، آنکھیں پڑکشش، چہرہ بیضوی اور خوبصورت اور رنگ کھلتا ہوا ہے۔ غزلوں میں عصری حسیت کی جلوگری ہے۔ کلام نادر تشبیہات اور استعارات سے مبہم ہے۔ قریب قریب اپنی ایک الگ پہچان بنالی ہے۔ اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں روای دواں ہیں، ایک فعال شخصیت کے مالک ہیں، اردو و ہندی کے موقع جرائد میں کلام چھپتا رہا ہے۔ ۱۹۹۷ء میں راجستان اردو کادمی سے اعزاز و انعام حاصل ہوا۔ ریڈ یو اور ٹیلی ویژن سے بھی کلام نشر ہوتا رہا ہے۔ ایک مجموعہ غزلیات ”صحرا میں گمندی“، ۱۹۹۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ۲۹

غزلیں :

ادھوری ہے غزل نغمہ ادھورا
ابھی ہے درد کا نشہ ادھورا
ابھی کچھ دیر اُس کو اور سوچوں
ابھی ہے ذہن میں خاکہ ادھورا
ترے کردار کا ہے سب کرشمہ
فسانہ دل کا تھا ورنہ ادھورا

چمک سی آگئی آنکھوں میں اسکی
میرے لب پر تھا جب جملہ ادھورا
ابھی سے کس لیے تم خوش ہوا اتنے
ہوا ہے طے ابھی رشتہ ادھورا
ہوا کی تھی نظر فاروق اُس پر
ہوا تھا سبز جو بثتہ ادھورا

رکھا بھی اُس کو میں نے سدا اپنے دھیان میں
مصروف بھی رہا ہوں میں اپنے جہان میں
ایک راستہ ملا تو کئی راستے کھلے
کتنے نشان پالئے ہیں اک نشان میں
اب تو بھی بچ نکلنے کی صورت تلاش کر
تیرا بھی نام آئے گا اس کے بیان میں
زندگی کی سمت آئے گی با دصبا ضرور
کب اسیر ہوں اسی وہم و گمان میں
کردار سارے آکے جہاں قتل ہو گئے
یہ کیسا مود آگ کیا ہے داستان میں
اب دل میں تیری یاد بھی آئے گی کس لیے
رہتا ہے کون آکے شکستہ مکان میں ؟

فضا جو کالوی

نام دوارکا ناتھ شرما، والد صاحب کا نام چودھری بندرابن جی شرما۔ اور قلمی نام فضا جو کالوی ہے۔ کیم ستمبر ۱۹۳۹ء میں جوکیاں (حالیہ پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم میٹرک تک حاصل کی اور ۱۰ ارجمنوری ۱۹۴۷ء کو راولپنڈی

(پاکستان) میں فوجی ملازمت اختیار کر لی۔ تقسیم ملک کی وجہ سے ۵ نومبر ۱۹۷۱ء کو ترک وطن کر کے جاندھر (ہندوستان) آگئے۔ فوجی ملازمت برقرار رہی جس سے ۱۷ ۱۹۷۱ء میں سبکدوش ہوئے۔ اپریل ۲۰ ۱۹۷۱ء میں کوٹھ کو اپنا ہمیشہ کے لئے مسکن و مستقر بنالیا۔

قد مائل بہ فراز، پیشانی روشن، آنکھیں غلافی، چہرہ لمبا اور خدوخال دل آویز ہیں۔ شعروشاعری کا شوق بچپن ہی سے ہے۔ زبان و ادب کے رمز شناس ہیں۔ اور سید مظفر احمد ظفر باشمی سے شرفِ تلمذ حاصل رہا ہے۔ کئی اضافِ سخن زیر مشق رہی ہیں۔ مگر غزلیں زیادہ کہتے ہیں، رنگِ سخن کلاسکل اور روایتی پنجابی زبان ادب سے بھی گہرہ تعلق ہے۔ شعروادب کی خدمت میں عمر بسر ہوئی ہے، نشر و اشاعت سے وابستگی قائم ہے۔ مضامین بھی کہتے ہیں، تین شعری مجموعے اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ پہلا "حسنِ تغزل" کے ۱۹۸۷ء، "حسنِ نظر" ۱۹۹۱ء میں اور تیسرا جو حضرت بلحیثے شاہ کے کلام کا شعری ترجمہ ہے۔ ۱۹۹۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ "رموز عرفان" کی رسم اجراء ۸ جنوری ۱۹۹۶ء میں صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں راشٹر پی بھون میں ہوئی ہے۔ راجستان اردو اکادمی کا ۱۹۹۹ء کا چاند بہاری لال صبا انعام و اعزاز بھی انہیں حاصل ہو چکا ہے۔ ۵۰

جس طرح جوش ملیح آبادی نے اپنی خود نوشت سوانح "یادوں کی بارات" کے عنوان سے لکھی ہے اس طرح فضائجوکالوی نے "یادوں کا جنگل" لکھی ہے۔ جوان کی سوانح حیات ہے اس میں آپ نے ذکر کیا ہے کہ آپ کی پیدائش کیم ستمبر ۱۹۱۹ء کو ایک گمنام گاؤں جوکالوی، تحصیل پھالیہ، ضلع گجرات (حال پاکستان) کے ایک جاگردار گھرانے میں ہوئی۔ ۵۱

آپ ابتدائی عمر سے اردو فارسی کے طالب علم رہے ہیں اس لئے ان کی طبیعت شعرگوئی کی طرف مائل تھی۔ شاعری کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہی ہو گیا تھا۔ جب نوی جماعت میں بڑھتے تھے یہ وہ وقت تھا جب اقبال کی شاعری بامِ عروج پر تھی۔ اقبال کی شاعری کی مہک سے متاثر ہو کر ان کے اندر سے اشعار پھوٹنے لگے۔ جب شروع میں شعر کہہ کر اپنے ساتھیوں کو سُناتے تو سمجھی ہنسی اڑاتے تھے، کبھی یہ اپنا شعر کسی بڑے شاعر کے نام منصوب کر کے کہتے تو بڑی دادلٹی، لیکن جب بعد میں اصیلیت ساتھیوں کے سامنے رکھتے تو سمجھی اُن کی شاعری کے معترف ہو جاتے۔ ان کے ساتھ وید پر کاش (جو ہندی کے طالب علم تھے) اور انہوں نے ۱۹۳۶ء میں ایک کتاب پچھے بعنوان "گل دستہ" شائع کیا، جس میں آپ کی دو نظمیں بھی شائع ہوئی۔ ۵۲

فضاصاحب کی خاصیت ہے کہ اگر وہ کسی مسئلہ یا بحث میں کوئی سوال کھڑا (پیدا) کرتے ہیں تو اس سوال کا جواب بھی خود ہی دیتے ہیں۔ وہ اپنی دلیلوں اور بحث کے ذریعہ اس کی وضاحت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ خوبی

بہت کم ادبیوں میں نظر آتی ہے۔ آگے وہ ہندوستانی زبان کے مسئلہ پر رومانی صاحب کے انٹریو کا حوالہ دیتے ہیں۔ ”جن فلموں کے سنسنسر ٹینکٹ پر زبان ہندی لکھی جاتی ہے ان فلموں کے لگ بھگ سبھی ڈائلگ اور گانے اردو زبان میں ہی ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آزادی سے پہلے بنی فلموں کی اردو کافی ثقیل تھی اور آج کی فلموں کی زبان کی بہت سادہ اور عام فہم ہے۔ آپ چاہیں تو اسے ہندوستانی بھاشابول چال کی زبان کہہ سکتے ہیں۔“^{۵۳}

اسی موضوع پر مشتمل ایک اور مضمون ”بھگڑا اردو اور ہندی کا“ میں بھی فضاصاحب نے ہندوستانی زبان کو عمل میں لانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔

”ابھی حال ہی میں شائع ہوا آپ کا مضمون“ جادو وہ جو سرچڑھ کر بولے“ میں بھی آپ ہندوستانی زبان کی طرف قاری کے توجہ دینے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ وہ بار بار کہتے ہیں ”میں ہندوستان کو ایک زبان دے جاؤں گا وہ ہندوستانی زبان“^{۵۴}

”فضا جو کالوی نے کئی مسائل پر مضمایں لکھے ہیں جس میں کچھ شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً ”سالِ نو“، ”ڈگر پنگھٹ کی“، ”ماہیے یاماہیا“ وغیرہ۔ اور جو مضمایں اشاعت کے لئے منتظر ہیں مثلاً ”ہندو دھرم کی شان خالصہ پنچھے“، ”میں اور میر اخط“، ”اگر میں وزیرِ اعظم ہوتا“ وغیرہ ہیں۔

فضاصاحب نے چند افسانے بھی لکھے ہیں۔ جن میں آپ کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ فضاصاحب نے چند افسانے ہی لکھے ہیں مثلاً ایک حسین دھوکا، ”ڈاکو“، ”سوئی کلائی“، ”اور رینا“ وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ ایک اور افسانہ ”آسمانی رشتے“ جو ابھی اشاعت کے لئے منتظر ہے ان کے افسانوں کی دو اہم خاصیتیں جو ہمیں نظر آتی ہیں۔ اول ہے آپ کی سادگی و سلاست اور صاف گوئی و بے باکی، اور دوسرا خاصیت ہے ان کا اسلوب بیان^{۵۵}

فضا جو کالوی کی تصنیف ”بے میوار“ ایک تاریخی تصنیف ہے جس میں مثنوی در صفت اودے پور درج ہے۔ ان کی اس تصنیف کی تحریر مکمل ہو چکی ہے اور اشاعت کے لئے منتظر ہے۔

”بے میوار“ کے مقدمہ میں ڈاکٹر فاروق بخشی صاحب فضاصاحب کا لکھتے ہیں کہ:

”فضاصاحب کا نیا کارنامہ، ”بے میوار“ دیکھ کر ان کی وطن سے والہانہ محبت اور مہارانہ پرتاپ سے ڈھنی وابستگی یوں بھی اجاگر ہوتی ہے کہ وہ خود سپاہی پیشہ رہے ہیں۔

جنگوں کی کہانی انہوں نے محض سنی نہیں بلکہ وہ خود کئی بار جنگوں
میں شریک رہے ہیں۔ لہذا ”بے میواڑ“، محض سنی سنائی نہیں
بلکہ انہوں نے پرتاپ کی شجاعت اور ان کی شخصیت کی عکس کو اپنی
روح سے محسوس کیا ہے۔ لہذا ”بے میواڑ“ کو ایک سورما کے
لئے دوسرے سورما کا خراج عقیدت کہیں تو بے جانہ ہوگا۔ ۵۶

فـضاجوکالوی کے علمی اور ادبی کارناموں پر مختلف حضرات کی آرائش خدمت ہے۔

۱. سـاحرـسـیـاـلـکـوـئـیـ:-

”فضا صاحب ایک فطری شاعر ہیں۔ شعر کہنا ان کی فکری طبیعت کا
تقاضا ہے۔ موزوںی طبع اور بلندی فکر انہیں ودیعت ہوتی ہے۔ لہذا
ان کے اشعار میں روانی ہے۔ ساختگی ہے، سوز ہے، تاثر ہے اور ان
کا بیشتر کلام قتنی معايب سے پاک ہے۔“

۲. پـرـشـوـتـمـ لـیـقـینـ:-

”فضا صاحب میں ایک خاص قسم کا بـانـکـپـنـ پـاـیـاـ جـاتـا~ ہـےـ جـوـ انـہـیـںـ عامـ شـعـرـاءـ سـےـ الـگـ کـرـ دـیـتا~ ہـےـ“

۳. جـنـابـ کـنـدنـ لـالـ شـرـمـاـ (ـمـرـحـومـ) (ـجـزـلـ مـیـنـجـبـرـ پـرـتـاـپـ جـاـلـنـدـھـرـ:-

”فضا صاحب خود ساخت شخصیت ہیں۔ جس نے اپنی زندگی کو خود بنایا اور سنوارا ہے۔
اور باہمی راہ رسم، خط و کتابت اور رابطہ کو اس رنگ میں بیان کیا ہے۔“

بات باتوں سے بنتی ہے قاصد

اپنی جانب سے کچھ کہا ہوتا ۵۷

۳. آزادگـلـانـیـ:-

”فضا جوکالوی ایک فوجی افسر رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے بقول خود
”رزم میں بزم“ کی باتیں کہیں۔ اور ساتھ ہی بلحہ شاہ کے کلام سے
ان کی وابستگی اس قدر گہری رہی کہ انہوں نے عام فہم زبان میں اس
کا ترجمہ کر کے اسے مقبول عام کرنے کی مستحسن کوشش بھی کی۔

ان کا مقصد بھلے شاہ کے کلام کو اس کی معنویت، موسیقی اور
جادوئی کیفیت کے ساتھ قاری تک پہنچانا تھا اور وہ اس
مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔“

۵

"S.M. Ghanzanfar (Professor and Chairman of Idaho University Moscow) March 15, 2000, to his cousin brother's kundan Lal Jokalwe.

"P.s. Thank You very much For presenting me that book of poetry" Ramooz-e-Arfaan" Kafiaan Hazrat Bullhe Shah translated by your cousin brother Fiza jokalwi (Major Dawarka Nath Sharma) I read parts of it and especially the literary man ! and your urdu notation to me, from "Kundan Lal Sharma" also tell me much about your love for urdu Poetry"

غزلیں:

مجھ کو ڈرا رہا ہے پھر اُس گھر کا آدمی
جیسے کہ مر گیا ہے اندر کا آدمی
واعظ! میرے گناہ پر رکھتے ہو کیا نظر
تاکے ہے رات دن بھجے اندر کا آدمی
اس اجنبی سے شہر میں سب اجنبی ملے
ملتا کبھی تو کوئی برابر کا آدمی

گھر گھر میں آگ کس نے لگا دی ہے دوستو
آیا نہیں یہاں کوئی باہر کا آدمی
سجدہ ہی ہے ایک در پر جو ہو فضا
در در پ سجدہ کرتا ہے در در کا آدمی

کوئی فرزانہ کرے گا کیا کوئی تدبیر عشق
ہاں کوئی دیوانہ ہی کر سکتا ہے تقصیر عشق
عقدہ لفظانا الحق خود بخود کھل جائے گا
کھول کر آنکھیں جو تو دیکھے کبھی تصور عشق
بھول جائیں گے یقیناً آپ اپنے آپ کو
ہم جو کر بیٹھے کسی دن آپ سے تفسیر عشق
جا بجا جلو نما ہیں حسن کی رعنایاں
گردشِ دوراں بدل ڈالی ہے کیا تقریر عشق
جان دی محفل میں پروانے نے اُف تک نہ کی
شمع رو کر رات بھر کرتی رہی تشهیر عشق

نظم: ”لتا کے نام“

(یہ نظم اپنی رفیقة حیات کے نام چین کی جنگ کے بعد بیفا کی سرحد سے لکھ کر بھیجی گئی تھی)

بس یہی کہ آج تم سے کس لئے میں دور ہوں

آہ! لیکن وقت کے ہاتھوں سے میں مجبور ہوں

چاہتا ہوں رو برومیرے ہو تو جلوہ فروز

پرمیری قسمت میں لکھا ہے فقط اندوہ و سوز

کاش میرے دل کی حالت تم پر ہو جاتی عیاں

کاش میرا راز غم تم سے نہ رہ سکتا نہاں

کاش تو بھی جانتی کچھ میرے دل کا ماجرا

کام ہیں کچھ اور بھی دنیا میں الفت کے سوا
 تیری خوشیوں کے لئے سارا جہاں تجھ پر شمار
 پر لٹا سکتا نہیں تجھ پر بھی اپنی ماں کا پیار
 اُس طرف تیری محبت اس طرف ماں کی پکار
 کوئی کہتا ہے یہ میرے دل میں آ کر بار بار
 بر ملا اس سے محبت ہے مگر یہ تو بتا
 قوم کی خدمت سے بڑھ کر کام ہے تو کونسا؟
 چھوڑ جاؤ گے ہمالہ کو یوں زخموں سے نڈھاں
 کیا نہیں کرنا تمہیں سرحد کی اب دیکھ بھال
 تاوانگ کی وادی سے بکھرے خون کی مجھ کو قسم
 جب تک ہے جاں میں جاں ہٹنے نہ پائیں گے قدم
 آج تک آتی ہے سیلا سے شہیدوں کی صدا
 چھوڑ کر یہاں ہم کو تو کس طرف ہے جارہا
 ٹینگا ویلی اور چاکو تک ہیں دشمن کے نشان
 کہہ رہا ہے ذرہ ذرہ اے وطن کے نوجوان
 آج وقتِ امتحان ہے باندھ لے اپنی کمر
 گامزن ہوئے منزل کھیل جاتو جاں پر
 مرمریں باہوں میں تیری راحیں ہیں بے بہاں
 لطف ہے آغوش میں ماں کی مگر اس سے سدا
 گرملی فرصت تو آؤں گالتا میں تیرے پاس
 جانِ جاں جانِ فضاظ تو مسکرانہ ہو اداں

بہار صدیقی بدایوں:-

نام قاضی محمد جلیل احمد صدیقی، والد محترم کا نام محمد احمد صدیقی، قلمی نام بہار صدیقی بدایوں، کیم جولائی ۱۹۳۴ء کو پیسل پور ضلع پیلی بھیت یوپی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم انٹرک حاصل کی نیز ۱۹۵۳ء میں ویسٹرن ریلوے کوٹھ میں ملازم ہو گئے۔ تب سے کوٹھ کو ہی اپنا وطن ثانی بنایا۔ چونکہ والد بھی شاعر تھے اور وفا تخلص کرتے تھے لہذا انہیں سے شعری ذوق و رثے میں ملا۔ شروع میں عروج زیدی کو اپنا کلام دکھایا اور ان کے انتقال کے بعد آبراحمنی گنوڑی سے سلسلہ تمذہ استوار کیا۔

بہار کشیدہ قامت، چورس چھرے، اُبھری ہوئی آنکھیں، مناسب ناک اور دبتے ہوئے گندمی رنگ کے شخص

58-

بہار نے غزل، نظم، قطعہ اور رباعی میں طبع آزمائی کی۔ ان کے یہاں بیگانگی نہیں ملتی۔ قدیم علامت، استعارات اور تشبیہات کا استعمال انہوں نے شعوری طور پر کیا ہے لیکن ان کے پیرائے میں کسی حد تک جدید مسائل حیات کو بیان کرنے میں کامیاب رہے۔ ان کی شاعری کا خاص موضوع اخلاقیت، مساوات اور انسانیت ہے۔ وہ ماضی کے اخلاقی سماجی قدرتوں کے پُجھاری ہیں۔ ان کے یہاں خلوص و محبت کے پھولوں کی خوشبو مہکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ زندگی گزارنے کا واضح اور ثابت پہلوان کی شاعری میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

سرمایہ اخلاق نہ کھونے دیں گے
نفرت کا کہیں تج نہ بونے دیں گے

بن جائیں گے ہم برقِ مظالم کا شکار

بر بادِ محبت کونہ ہونے دیں گے

بہار کے یہاں دورِ جدید کی اخلاقی پستی اور ٹھیک ہوئی انسانیت کا احساس موجود ہے۔ ملک کی سیاسی خلفشاں اور بحران کے اثرات ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔

اپنوں نے ظلم ڈھائے ہیں ہر گام پر بہار
لوٹا گیا ہوں خوبِ محبت کے نام سے

غزل کے علاوہ بہار نے کثیر تعداد میں نظمیں بھی لکھیں ہیں۔ ان کی مشہور نظموں میں ”شکوہ“، ”پیمان وفا“، ”تشنہ تحریر“ ہیں۔ ان کی اکثر نظموں میں رومانیت کی فضائیت ہے۔ ”انشا“، ان کی مشہور نظم ہے۔ جس میں انہوں نے تہذیب و تمدن کو تباہ کرنے والے اور خلوص و محبت اور انسانیت کا خون کرنے والے کی سخت مخالف کی ہے۔ اور اخوت و مساوات کا پیغام دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نگاہ و دل میں تعصب کی شعلہ افشاری
جنون فرقہ پرستی وہی ہے شور و شر
رہے گا تیرا مقصید یہ بدُنی کب تک
کہاں تک آگ میں جلتا رہے گا تیرا گھر

۵۹

غزل:

تمہارے گیسوئے پر پچ کے کھلے جب بل
دل الم زدہ پر چھائے رنگ کے بادل
حسین وہ شام، وہ دورِ شرابِ رقص و سرور
کھنکتے جام جھنکتی ہوئی تری چھاگل
چھلک نہ جائے کہیں یونہ دیکھ تو مجھ کو
بھرا ہے نین کٹوروں میں تیرے نرمل جل
خرامِ ناز میں رعنائی زمانے کی
نظر ہے کو ندتی بجلی ادا، ادا چنجل
کہاں ہوتم مرے بیتے دنوں کے اے لمحو!
پکارتا ہے تمہیں دل گھڑی گھڑی پل پل
وہ حشر خیز کسی کے شباب کا عالم
شراب کہنہ سے جیسے بھری ہوئی بوتل

کسی کی آنکھ میں پوشیدہ شوق کے آنسو
 خیالِ بھر مسلسل سے دل مرا بیکل
 شعاعِ مہر، دہن چوتی ہے پھولوں کا
 گلوں پہ ڈال دیا کس نے شبینی آنچل
 وہ عارضوں پہ ترے پھولتی حیا کی شفق
 رسیلے نینوں میں جادو بھرا ہوا کاجل
 ستارے اشکوں کے پلکوں سے اپنی ڈھلکا کر
 یہ کس نے توڑ دیے میری آرزو کے محل
 قبائے ہوش کے ٹکڑے بہار کر ڈالے
 کسی کے پیار میں دل اس قدر ہوا پاگل

چاند شعری:-

نام چاند محمد اور قلمی نام چاند شعری۔ والد کا نام رُکن الدین اور والدہ کا نام محمودہ پیدائش ۸، جولائی ۱۹۶۶ء کو گاؤں جھر موڑی، ضلع جھالاواڑ (راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ ہائی سیکنڈری تک تعلیم حاصل کی۔ اسیل فرنیچر کا کاروبار کرتے ہیں کرکٹ، فلم اور مطالعے کے شووقیں ہیں۔ آر۔ پی شرما مہریش صاحب سے شاعری کافن سیکھا، رنگ دیتا ہوا ہے، چہرہ گول، آنکھیں چمکیلی، جسم فربہ اور قد مختصر ہے۔ شعرو شاعری میں دلچسپی اور اکل عمری سے ہے خصوصاً غزل کا شوق رکھتے ہیں ان کی شاعری میں عصری زندگی کی پرچھائیاں لرزتی ہیں۔ زبان سادہ صاف اور ہندی آمیز ہے، سہل ممتنع کی روشن اختیار کی غزل کے بند ملاحظہ ہو:

قتل معصوم ہو گئے لاکھوں

بھربھی خجر کی دھار باقی ہے

اُردو کے رسائل میں چھتے ہیں کئی ہندی اردو کی ادبی انجمنوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ مشاعروں اور نشستوں کے علاوہ ریڈ یو پر بھی بلائے جاتے ہیں
 غزل کے بند پیش ہے:

سودی سود میں بکا سب کچھ

جو لیا تھا ادھار باقی ہے

زبان اضافتوں، علامتوں، شیوهوں، واستعاروں سے بوجھل نہیں ہے۔ کلام میں ایہام وابہام کا دخل نہیں ہے سادگی و پُر کاری شیوه سخن ہے۔ ایک کتاب دینا گری رسم الخط میں ۲۵، دسمبر ۱۹۹۹ء کو شائع ہو چکی ہے۔ جس کا نام ”زرد پتے ہرے ہو گئے“ ہے۔

انعامات:

(۱) راجستھان ساہتیہ اکادمی کا ۲۰۰۲ء میں اور ۳۰۰۳ء میں کاسٹم لیش جوشی ایوارڈ۔

(۲) ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کے دوارافبلو سپٹ ایوارڈ۔

(۳) جنیمی اکیدیمی ہریانہ ایوارڈ۔

(۴) گنر بگمہ کوٹہ دواراقومی ایکٹا ایوارڈ۔

اور بھی بہت سے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر روشن بھارتی شیخ تارے اور رجب علی بھارتی ڈاکٹر کیدتی شاہ کے دواراغز لیں گائی گئیں ہیں۔ غزل کے بندپیش ہے:

دھرم کوئی بھی ہو دے گا محبت

محبت ہی ہمیں ایمان دے گا

چاند شعری صاحب کی غزل میں ملک کی تمام ہندی اردو کی میگرین و رسالے میں شائع ہوتی رہتی ہے۔ چاند شعری صاحب آل انڈیا مشاعروں و کوئی سماں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ ۲۰

غزل:

ایک لمبی قطار باقی ہے

مفسلوں کی پکار باقی ہے

سودی سود میں بکا سب کچھ

جو لیا تھا ادھار باقی ہے

قتل معصوم ہو گئے لاکھوں

پھر بھی خنجر کی دھار باقی ہے

بس یہی غم گسار ہے میرا
 ہاتھ میں جو ستار باقی ہے
 نیند تو اڑگئی دھواں بن کر
 جلتی بجھتی سگا ر باقی ہے
 رونقیں کارواں کے ساتھ گئیں
 راستے کا غبار باقی ہے
 آدمیت تو مرگی شعری
 اب تو اس کا مزار باقی ہے

ارادے کی اٹل پڑان دے گا
 ہمیں خود حوصلہ طوفان دے گا
 وہ دن کب آئیگا جب وقت ہم کو
 ہماری گمشدہ مسکان دے گا
 کہاں اب پوپ میوزک کا زمانہ
 کشن کی بانسری کی تان دے گا
 دھرم کوئی بھی ہو دے گا محبت
 محبت ہی ہمیں ایمان دے گا
 اُسے ہم امن کا پیغام دیں گے
 ہمیں جو جنگ کا میدان دے گا
 لہو بہتا ہے جو دنیا میں شعری
 وہ تیری نظم کو عنوان دے گا

عزیز مانگروی:-

نام عبد العزیز تخلص عزیز ۱۹۳۵ء بمقام مانگروں ضلع باراں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اردو، عربی ماموں عبد القادر صاحب سے حاصل کی۔ سرکاری مکملہ تعلیمات P.W.D. میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۹۰ء میں حج بیت اللہ کیا۔ ان کو شعری شوق بچپن سے ہی رہا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں جب مفتون کوٹی سلسلہ ملازمت مانگروں گئے تو عزیز کو ان کی شاگردی کا موقع ملا تب سے ہی باقاعدہ شعر کہنا شروع کیا۔ مفتون کے ہاڑوتی میں کئی شاگرد ہیں لیکن جس شاگرد پران کو بجا طور پر فخر تھا وہ عزیز تھے۔ انہوں نے ویسے تو اردو ہندی کی اکثر اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ ہندی والوں میں ان کو ”رس خان“ کوی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور اردو ادب میں ایک اچھے نظم نگاری کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ مطبع نظر بنیادی طور پر تعمیری اور اصلاحی ہے۔ شاعری کے ذریعہ آپ ملک و قوم کی اصلاح کرنے کا اچھا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی نشری نظموں میں قومیت و طینت اور مذہبی رہنمائیوں پر انہوں نے بہت سی نظمیں لکھیں ہیں۔ ان کی شاعری کا محور اخلاقیات، مساوات اور آدمیت کا پیغام ہے۔ اس اعتبار سے ان کو ہاڑوتی کا ”نظیراً کبراً بادی“، قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کی معروف نظموں میں ”کردار“، ”جنم اشتمی“، ”گاندھی ساگر باندہ“، ”دریارے چھبیل“، ”ہولی“، ”دیوالی“، ”گاندھی جی“، ”گروناںک“، ”ملک کی پیاری امانت“، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تمام نظموں میں ہندوستانیت اور حب الوطنی کے چشمے پھوٹنے نظر آتے ہیں۔ آپ کی شاعری میں نعت، غزل کے ایک ایک مجموعہ مرتب ہیں وغیر مرتب نعت کا مجموعہ ”افکار عزیز“، ”غزلیات کا مجموعہ“، ”گوہر نایاب“، ہیں۔ قومی یک جہتی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ॥

غم فرقت میں مت اتنا بہا اے چشمِ نم پانی
کہ ان جھیلوں میں وسیلے ہی بہت ہوتا ہے کم پانی
نه کھنم، برسائے جا برسائے جا ابر کرم پانی
نه جب تک شرم سے ہو جائے ہر ظلم و ستم پانی
میری شیریں بیانی بزم میں جو ہر دکھائے گی
میری تلوار کا مقتل میں رکھے گا بھرم پانی

یہ ہے اے نیل اعجاز عصائے حضرت موسیٰ
پھرا فرعون کی سب حسرتوں پر ایک دم پانی
عزیز اس دور کے فریاد ہیں ان خشک نہروں میں
پھاڑوں کا کلیجہ چیر کر لائیں گے ہم پانی

چپ ہیں سب معصوم دیواریں تو درخا موش ہے
بے زبانی آہ ایسی گھر کا گھر خاموش ہے
اس سے پہلے ہی میں مر جاؤں تو اچھا ہے عزیز
میری جس وقت زمانے کو ضرورت نہ رہے

لطفی کوٹلوی:-

نام بشیر احمد تخلص لطفی کوٹلوی ہے۔ ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ شرف تلمذ عرشی اجمیری صاحب سے حاصل ہوا۔ ان کے برادر بزرگ شاد کوٹلوی بھی شاعر تھے۔ مگر دونوں کا مذاقِ خن مختلف ہے چھریے جسم کے میانہ قامت اور پُرکشش خدو خال کے مالک ہیں۔ نظمیں اور غزلیں دونوں کہیں ہیں۔ ۲۲
تعلیم و تربیت کوٹھے میں ہوئی۔ تقریباً پچھلے ۲۰ سالوں سے انہوں نے دہلی میں سکونت اختیار کر رکھی تھی اور وہیں ۲۰۰۶ء میں انتقال فرمایا۔ ان کی شاعری سے متعلق دیا سا گر قم طراز ہیں:

”اپنے ہم عصر شعراء سے لطفی کوٹلوی چند قدم آگے ہیں۔ یعنی کوٹھے کی ادبی محفلوں میں لطفی کے نغموں کی گونج ۱۹۵۲-۵۸ء کے آس پاس سُنائی دینے لگی تھی جو بڑھتے بڑھتے راجستان کے ادبی افق پر چھا گئی۔
اس وقت مقامی شعراء میں ان کا ہم عصر شاعر کوئی نہ تھا۔ کوٹھے کی موجودہ نسل کے تمام نوجوان شعراء سے آگے تھے۔ دلیق مطالعہ، تجربہ مشاہدہ، محنت اور لگن نے اس شاعر کے کلام کوتازگی بخشی ہے۔
غزل، نظم، قطعہ و رباعی پر ہی اکتفا کر کے نثر میں بھی ہاتھ

دیکھائے ہیں۔ اور بحیثیت ایک ڈرامہ نگار اپنی ادبی اور فنی صلاحیتوں
کو اجاتگر کیا ہے۔ ۲۳

ان کی شاعری میں توازن ہے۔ فن اور فکر کا سانگم ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ لطفی نے اردو شاعری
کیلاسکیت اور روایت کو جدید عہد کی بدلتی ہوئی زندگی اور ادب کی قدر وہ سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش
کی ہے۔ وہیا ساگر کے مطابق:

”لطفی نے زمانے کی بدلتی ہوئی قدر وہ کاپور اساتھ دیا ہے۔ اس نے اپنے ماحول
کے اوپر سے قدامت کا البادہ اُتار پھینکا ہے۔ تعمیری اور صحت مندرجہ روایت کے نظریہ
کو لے کر مناسب حکم تک جدیدیت کو اپنایا ہے۔ یعنی ایسی جدیدیت ذوقِ سلیم پر
گراں نہ گزرے۔ اس نے آدھونکتا کی آڑ لے کر تک بندی نہیں کی بلکہ ایسے شعر
کہے ہیں جن میں عصرِ جدید کی روح انگریزی لیتی ہوئی دیکھائی دیتی ہے۔ ۲۴

ودیا ساگر کے اس بیان کی تائید کے لئے درجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں
کبھی جہاں کو میں تہاد دیکھائی دیتا ہوں
زمانہ اب مجھے تہاد دیکھائی دیتا ہے
شہرِ محفوظ رہا خوش ہوں کہ زہر یہ سحاب
ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے اوپر بر سے
دیکھتے دیکھتے پھر ایا خلاں کا دھواں
پھر معاه پیکر احساس پہ پھر بر سے
اتنے خوش کیوں ہو آج، کیا کوئی یاد آ گیا
زلفِ سیاہ منتشر، چہرہ اُداس، دل ملوں
روشن کوٹوی:-

نام اسحاق محمد، تخلص روشن کوٹوی ہے۔ والد ماجد کا نام اعل جوہر کوٹوی ۱۹۲۸ء کو بمقام کوٹہ میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم قرآن اور اردو کے اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ مڈل تک سرکاری اسکول میں اردو فارسی پڑھی۔ روشن بچپن سے ہی اپنے والد کے ساتھ مشاعروں اور شعری نشستوں میں شرکت کرتے تھے۔ شعر فہمی بچپن سے ہی تھی لیکن شاعری کا آغاز ۲۵ ربرس کی عمر سے ہوا۔ ان کا شعری سرمایہ غزلیات و قطعات پر مشتمل ہے۔ بنیادی طور پر روشن کوٹوی غزل کے شاعر ہیں۔ اسی صنف میں انہوں نے خوبی کے ساتھ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو استعمال کیا ہے۔ روشن کی شاعری کا پیشتر حصہ ان کے عشقیہ جذبات و احساسات پر مشتمل ہے۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں خالص مجازی عشق کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ انکی غزلوں میں معاملہ بندی، ناکامی محبت، آئے دن ہونے والے فسادات اور کچھ دوستوں کی بے اعتنائی پر مبنی اشعار پائے جاتے ہیں۔ حسن و عشق کے مضامین کی خاص وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی جوانی میں امیر بانو بنت عثمان سے عشق کیا تھا۔ مگر آپ اس میں ناکام رہے۔ یہی وجہ سے کہ آپ نے پھر عمر بھر شادی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ کلام میں دروغم، زمانے کی کجروی، ناکامی محبت کے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ غزل کے علاوہ روشن نے نظموں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

روشن کوٹوی بڑے زندہ دل انسان تھے۔ جیسی شاعری کرتے تھے تقریباً ولی زندگی جیتے تھے۔ ۸۲ رسال کی عمر پائی انسان بہت اچھے تھے شادی نہیں ہوئی تو اپنی ایک بیوہ بہن کی خانگی ذمہ داریاں تا عمر بڑی خوبی سے سنپھالی۔ اس طرح قربانی کا جذبہ بھی ان کی شخصیت کا اہم عنصر ہے۔ اچھے برتاب و خود بھی اپناتے تھے اور دوسروں سے بھی اچھے سلوک کی ہی امید رکھتے تھے۔ اگر ایسا کہیں نہیں ہوتا تھا تو ناراض بھی ہو جاتے تھے لیکن یہ ناراضگی نفرت یا الگاؤ میں تبدیل نہیں ہوتی تھی بلکہ آگے چل کر خوب و خود بہال ہو جاتی تھی۔ فرخ ندیم نے بطور خراج عقیدت ان پر جو نظم کہی ہے وہ اس طرح ہے۔

”مرحوم روشن کوٹوی کی یادی میں“

ٹوٹ گیا سنانسو کا بندھن

رخصت ہوا مسافر

اب چاہو تو مسلم کہہ دو

چاہے کہہ دو کافر

علم و ادب کا دیوانہ تھا

بے تابی کا افسانہ تھا

آنکھوں میں اپنی رکھتا تھا
 ایک صدی کی خوشیاں
 سینوں کے آنچل میں رکھتا تھا
 ایک صدی کی خوشیاں
 سینوں کے آنچل میں رکھتا تھا
 جو کھلتی کلیاں
 محفل میں محفل بن جاتا
 تمہاری میں یوگی
 اب بھی اس کی یاد
 تمہارے دل میں رہتی ہو گی
 جانے کتنے چاہنے والے
 کہتے اس کو روشن
 بڑھ جاتی ہے اس سے مل کر
 دل والوں کی دھڑکن
 جو بن اُس کے لفظوں کا ہے تو میں میں زندہ اب بھی
 آہٹ اس کے افسانوں کی ہے تابندہ اب بھی
 آیا ایک فرکست کا جھونکا
 اور لے گیا اس کو
 آج نہیں وہ تیج ہمارے
 سمجھاؤں کس کس کو
 ٹوٹ گیا سانسوں کا بندھن ۲۵

محترم روشن کوٹوی کی شخصیت کی بلندی ہی نے فرخ ندیم کو مجبور کیا کہ بطور خراج عقیدت یہ نظم وہ ان کے
 لئے تحریر کریں۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ اس تحریری عمل میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ روشن کوٹوی صاحب
 بنیادی طور پر روایتی شاعر ہونے کے باوجود نئی فکر سے نا آشنا نہیں ہیں تبھی تو وہ کہتے ہیں ۔

اے نئے سال نئی فکر نئے ذہن کے سال

تجھ سے وابستہ نہ شکوہ ہے نہ سوال

مندرجہ بالا شعر روشن کوٹیوں کی طرزِ فکر کا نماہنہ ہے ان کی نظر ماضی اور حال کے ساتھ ساتھ مستقبل پر بھی بنی رہتی ہے۔ تبھی موضوعاتی اعتبار سے وہ ایسے تازہ شعر لکھ دیتے ہیں۔ رومانی اعتبار سے بھی محترم روشن کوٹیوں اچھے شاعر ثابت ہوئے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں :

گال پہ جوا کتل ہوتا ہے

رشک مہے کامل ہوتا ہے

آجائے جس پر آجائے

دل تو آخر دل ہوتا ہے

قاتل کا کیا دین و مذہب

قاتل تو قاتل ہوتا ہے

مندرجہ بالا غزل اہلِ متنہ میں کہی گئی ہے اور رومانی اعتبار سے روشن کوٹیوں کے عہد کے اچھی غزل ہے۔ یہاں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ محترم روشن کوٹی کو نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ بھی اگر ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو تقریباً تمام اصنافِ شخن میں ان کے شعر ملتے ہیں۔ یعنی تکنیکی اعتبار سے وہ ایک کامل شاعر ہیں اور خوبی کلام یہ ہے کہ ان کے اشعار بے ساختہ یاد بھی ہو جاتے ہیں۔ یعنی بات دل سے نکلتی ہے اور دل میں اترتی ہے۔

ایک زمانے میں موصوف یہڑیاں بنانے کے کاروبار سے مسلک رہے مگر عقیل شاداں صاحب سے ایک اتفاقی ملاقات کے بعد ان کے فرمانے پر ان کی زندگی میں ایک ایسی تبدیلی آئی کہ اپنا کام چھوڑ کر مدرسی کے کام سے جڑے رہے۔ یعنی انہوں نے تحریری تحریری اور شعری تنویر اعتمدار سے اردو زبان کی بھرپور خدمات انجام دی۔ اور ہمارے ادبی سرمائے کے فروع میں تادمِ حیات شامل حال رہے۔

علاوہ ازیں اپنے شاگردوں پر بھی اپنی نظریں کرم بنائے رکھی اور انہیں برابرا پنی رہنمائی سے نوازتے رہے۔

ان کے قابل ذکر نظموں میں ”وقت کی آواز“، ”رام راج“، اور ”عید“ ہیں۔ ان کا ہر شعر ایک درد مند کو پکار ہوتا ہے جس میں جدائی مایوسی اور وصال کی آواز میں ایک عاشق صادق کی عاشقانہ جد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ۲۶

مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

نبض مریضِ عشق کو مت دیکھ چارہ گر

یہ روگ مختلف ہے یہ بیمار مختلف

اس شہر میں روشن تمہیں سب جان گئے ہیں
ناکامِ محبت کے سوا دیکھئے کیا ہو
ایک آفت ایک قیامت ایک فضا معلوم ہوتی ہے
غرض کیا کیا تیری طرزِ ادا معلوم ہوتی ہے
وہ دور بھی اس قدر ہے کہ نظر نظر سے نہ آسکے
اور قریب اتنے قریب کہ رگ و جاں سے بھی قریب ہے

روشن کوٹوی کی شاعری میں صرف عاشقانہ جذبات کی ترجمانی ہی نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں موجودہ زمانے کے تبدیل یافتہ سیاسی، سماجی اور اخلاقی اقتدار کا احساس بھی شدت سے ملتا ہے۔ اس میں اپنے عہد کے تمام مسائل بیان ہوتے ہیں۔ اور آپ کے یہاں زندگی کا ایک روشن مستقبل نظر آتا ہے۔ جس کا انحصار یقین محاکم عمل پیغم اور طوفان سے ٹکرانے میں ہے۔ خود بے کو دار انانیت ان کے یہاں نمایاں طور پر ملتی ہے۔ ۲۷

ہم کثرت و قلت کو روشن خاطر میں کبھی لاتے ہی نہیں
طوفان جو ہم سے ٹکرائے، طوفان ہی کنارہ کرتے ہیں

غزل

جس پر تیری نگاہ ہو جائے

وہ فقیری میں شاہ ہو جائے

رشکِ صدمہ رہ ماہ ہو جائے

دل تیری جلوہ گاہ ہو جائے

بات کچھ ایسی آپڑے یارب
 اُس سے ملنے کی راہ ہو جائے
 خونے الفت نہ ہو گر انساں میں
 آدمیت تباہ ہو جائے
 اُس کی سرکار میں کریں شکوہ
 توبہ توبہ گناہ ہو جائے
 ایک رہ جائے دل میں یاد تیری
 اور سب کچھ تباہ ہو جائے
 سخت مشکل ہے آج کل روشن
 دستوں سے نباہ ہو جائے

مضطرب صدیقی:-

نام محمد شفیع صدیقی، والد کا نام حافظ حکیم محمد اسماعیل صدیقی اور ادبی نام مضطرب صدیقی ہے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۳ء کو بمقام کوٹھ میں پیدا ہوئے۔ راجستان سے میٹرک مڈیہ پر دلیش سے انٹر اور جامعہ اردو علی گڑ سے ادیب کامل کے امتحانات پاس کئے۔ اور کم عمری میں ہی شاعری کی طرف مائل ہوئے ۱۹۶۵ء سے مشقِ سخن جاری ہے۔ عروضی کا درس اور فنِ شعر گوئی کی تربیت استاد شیدا کوثری جسے پوری سے لی۔ اول عمری سے ہی ذہن و دل پر ترقی پسند ادب کا جادو ایسا چلا کہ آج تک ایسی فکر میں مستغرق ہیں۔ سلسلہ ملازمت ۱۹۶۸ء میں کوٹھ سے بانسوڑا اچلے گئے۔ اندازِ تخطاب خلیبانہ ہے، بحث و مباحثے کے شوپین ہیں۔ دوست دار اور دوست نواز انسان ہیں۔ حبِ الوطنی کا عصر مزاج میں رچا بسا ہے، نظموں میں ترقی پسند اور اصلاحی رنگ نمایاں ہے۔ اقبال، حالی، سردار، ساحر اور کیفی سے متاثر ہیں۔ غزلیں کلاسیکی اور روایت انداز کی حامل ہے۔ دو شعری مجموعے پہلا ”ارتعاش“ (۱۹۸۸) میں دوسرا ”اضطراب“ (۱۹۹۵ء) میں چھپ چکے ہیں۔ مشاعروں میں بلائے جاتے ہیں، رسائل و جرائد میں کلام چھپتا ہے اور ریڈیو سے نشر ہوتا ہے۔ آج کل بانسوڑا میں قیام ہے۔ ”تذکرہ شعراء اودے پور“ میں بھی انہیں شرکیک کیا گیا ہے۔

دو نظمیں: (فکر)

عمر بھر ہنستے رہے جو	مجھ سے بہتر آپ ہوں گے
خون کے آنسو	آپ سے بہتر بھی کوئی اور ہوگا
آج وہ	برتری اور کمتری کے درمیان
روتے ہیں کیوں	فرق کم سے کم اگر ہو جائے تو
یا اللہ!	یہ بہت بہتر ہوگا
had-e-as قسم کے	
ہوتے ہیں کیوں ؟	

غزل

بے یقینی میں فقط دل کا بھروسہ نجح گیا
اسی اندر گھر میں تھوڑا سا اجالانچ گیا
زم سارے بھر گئے، زخم تمنا نجح گیا
ناشنا ساؤں میں میرا، اک نشا سانچ گیا
اک شجر کی شاخ پر اک سبز پتہ نجح گیا
موسمِ گل کا کوئی تو نام لیوانچ گیا
آگئے شہرِ محبت سے محازِ جنگ تک
راستے میں کیا خبر کٹ گیا کیا نچ گیا
حوادثِ عشق میں یوں بھی ہوا مضربِ بھی
پکنے والا مر گیا اور مر نے والا نچ گیا

ٹھہراؤ ذرا دری کو طوفان میں آئے
وہ آئے تو کچھ جان میری جان میں آئے
ہر گل کے مقدر کا ہے چین سے تعلق
ہر گل کو ضروری نہیں گلداں میں آئے

یہ حکم ہے دھرتی کا کہ اب سطوتِ شاہی
ملوں سے نکل کر میرے خلیان میں آئے
ڈھونڈھا جنہیں ارض و سماوات میں پہم
وہ مجھ کو نظر صورہ رحمٰن میں آئے
یہ سچ ہے کہ تم سے بہت کمزور ہے دشمن
بس شرط یہی ہے کہ وہ پہنچان میں آئے
خوش رنگ پرندے ہی بناتے ہیں فضا کو
اے کاش یہ خوبی کبھی انسان میں آئے ۲۸

امین اثر:-

نام امین الدین خاں، معین الدین خاں والد کا نام، اور امین اثر تخلص ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۵۴ء کو کوٹھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ہائر سیکنڈری تک حاصل کی۔ زانوے ادب عمر کوٹوی کے آگے تھے کیا۔ پیشے کے اعتبار سے پھروں کے سوداگر ہیں اور ذوق و شوق کے لحاظ سے غزل کی زلفوں کے اسیر۔ خدو خال مناسب، رنگ دبتا ہوا اور جاذب نظر شخصیت کے مالک ہیں۔ رنگ تغزل اپنے استاد سے ملتا ہے پابند روایت اور مشاعروں کے کامیاب شاعر ہیں۔ ترجم سے دل مسخر کر لیتے ہیں۔ الگ سے اپنی راہ بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ منزل تک پہنچنے کے لئے مشق و مطالعہ کی ضرورت ہے۔ غزلیں ملاحظہ فرمائیں :

غزل

کبھی بے خودی میں زبان سے کہیں تیرانا نکل گیا
ہوا حال یہ اُس روز سے مجھے جس نے دیکھاوجل گیا
میری سہی سہی سی حسرتیں، میری سرد سردی خواہش
کوئی دے کے ان کو حراتیں، میری زندگی سے نکل گیا

اظہار کیا۔ تمام لوگ جو اس محفل میں شریک تھے ایک لمحے کے لئے حرمت میں پڑ گئے اور واقعات تشبیش ناک حد تک سنجیدہ ہو گیا۔ اس موقع پر حسن اتفاق سے ان کے چھوٹے بیٹے فرخ ندیم بھی موجود تھے۔ جو انہیں نسبتاً بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ تمام شراکا کو سمجھا بجھا کر فرخ ندیم نے معاملہ رفع دفع کیا۔ یہ واقعہ عقیل شاداب کی شخصی معصومیت کا بڑا اہم ثبوت ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ عقیل شاداب لوگوں کے دلوں کا خیال نہیں رکھتے ہوں لیکن ان کی سوچ کی اجتماعیت اس قدر روئی تھی کہ وہ جس سے ملتے اسے اپنے جیسا اسلامیم کر لیتے اور بے تکلف ہونے میں وقت ضائع کئے بغیر اس کے ہم سفر ہو جاتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ حسن سے ان کا سلوک رہتا وہ ان کو سمجھ پاتا تھا یا نہیں۔ لیکن ایک شاعر میں جن فطری معصومیت کا ہونا سب سے پہلے ضروری ہے وہ ان کے بیہاں بڑی گھرائی تک موجود تھی۔ بے حد ریقیق القلب آدمی تھے اور اپنی شدتِ احساس کا اظہار بھی آنسوؤں کی صورت میں وہ بھی بھی کر دیا کرتے تھے۔ مثلًا ایک جگہ اپنی شخصیت کے اظہار میں وہ خود کہتے ہیں۔

نقیدِ حیات جان سے مہنگی ملی ہمیں
لیکن ہمارے ساتھ سے سستی چلی گئی

ایسا لگتا ہے کہ جیسے سنبھل کر چلنے کی عادت سی ان کو چڑھتی۔ اور جن لوگوں سے وہ واسطہ رکھتے تھے یا گھلتے ملتے یا بات کرتے تھے ان سے بھی وہ یہی توقع رکھتے تھے کہ جب وہ ملیں تو مکمل طور پر ملیں۔ بقول بشیر بدر:

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا
اگر گلنہیں ملنا تو ہاتھ بھی نہ ملا

عقیل شاداب مندرجہ بالا شعر کے تاثر کو پوری زندگی میں بڑی سچائی سے جیتے رہے اور اپنے جذبہ و احساسات کو اسی سچائی اور ایمانداری سے اپنے اشعار کی زبان بھی عطا کرتے رہے۔ اس طرح شاداب کی شخصیت ہمارے لئے ایک ایسی (Idial) شخصیت ہو جاتی ہے جو زندہ رہنے کے لئے کافی حد تک ضروری ہے۔

شاداب صاحب کی زندگی میں ان کی شریک حیات محترمہ طاہرہ بیگم صاحبہ کا بڑا اہم روں رہا ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ بھی تقریباً انہیں کی طرح بے حد حساس فطرت اور صاف گو خاتون تھیں اور شعروادب کے فطری تقاضوں سے خاندانی طور پر روشناس تھیں۔ کیوں کہ ان کے والدِ محترم بھی ایک معروف اعلیٰ ادبی شخصیت تھے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جانہ ہو گا کہ علی گڑھ میں اپنی زندگی میں اپنے ہم اثرادیبوں میں یہ سب سے منفرد اور ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ محترمہ طاہرہ بیگم میں بھی ان کے مزاج کا عکس بد رجہ اتم موجود تھا۔ شاداب زیادہ تر شعر کہنے کے بعد سب سے پہلے اس پر مشورہ جن سے کرتے تھے وہ شخصیت محترمہ طاہرہ بیگم ہی تھیں۔ جو با توں ہی با توں

اب تو چھپنے لگے آنکھوں میں لہو کے منظر
 اب تو بہتر ہے کہ چھپن جائے بصارت بابا
 سب سے آگے تھے وہی گھر کو جلانے میں میرے
 جن کے ذمہ تھی میرے گھر کا حفاظت بابا
 اس قدر ہو گئیں تبدیل جہاں کی قدریں
 اب تو لاشوں کی بھی ہوتی ہے تجارت بابا
 ہو گئے کیسے اچانک وہ مخالف اختر
 جن کو دینی تھی میرے حق میں شہادت بابا

چند سکوں میں مہاجن کے حوالے کر دیا
 زندگی تجھ کو کلنٹن کے حوالے کر دیا
 عظمتِ ہندوستان کے واسطے ماں باپ نے
 لاڈلے بیٹوں کو بھی رن کے حوالے کر دیا
 دیکھ لو تاریخ شاہد ہے کہ ہم نے خون کا
 قطرہ قطرہ اپنے کلشن کے حوالے کر دیا
 زندگی کا عہد زریں تیتی پل، خون دل
 میں نے اپنا سب کا سب فن کے حوالے کر دیا
 ہو گئیں سب دور اختر اُس گھڑی خوش فہمیاں
 جب مجھے رہبر نے رہن کے حوالے کر دیا

۵۰

اکھیلیش انجمن:-

نام اکھیلیش کمار گپتا، تخلص انجمن، قلمی نام اکھیلیش انجمن، والد کا نام جناب ہری شنکر گپتا، ۲ دسمبر ۱۹۲۲ء
 کو بلند شہر (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کے سلسلے میں والد صاحب کے تبادلے ہوتے رہتے تھے اس لئے

مختلف شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ایم اے اکیونو مکس میں کیا اور صحافت میں ڈپو مالیا۔ بلند شہر، میرٹھ اٹاواہ اور بریلی میں تعلیمی سلسلے کی تکمیل ہوئی۔ والد ہندی شاعری میں دلچسپی رکھتے تھے اور والدہ کا اردو میں دخل تھا۔ اس لئے دونوں تہذیبوں اور زبانوں کی آمیزش سے ان کی شخصیت اور شاعری پروان چڑھی۔ ادبی شغف کا آغاز بی اے کے زمانے سے اٹاواہ میں قیام کے دوران ہوا، سگنیت کا شوق پہلے ہی سے تھا۔ ایم اے۔ بلند شہر سے کیا وہیں اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ نیز نظر زیوری سے مشورہ تھن کیا۔ کو ۱۹۶۶ء میں وارد ہوئے۔ شری رام فریلائزر میں ملازمت کی اور یہاں کے ادبی ماحول میں ایک خوبصورت اضافہ ثابت ہوئے۔ سانوی رنگت، روشن آنکھیں، درمیانہ قد، پرکشش آواز دلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ ہندی اردو کے رسائل و جرائد اور ریڈیو، ٹی وی سے نشر و اشاعت کا سلسلہ رہا ہے۔ ڈپٹی مینجر کے عہدے سے رٹائر ہوئے۔ اب سارا وقت شعر و شاعری اور مطالعے میں بسرا ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں موسیقی کا رچا ہے اور عصری فکر نظر کی آمیزش کلام کو دو آتشہ بنادیتی ہے۔ نرم خود ملنے سارے انسان ہیں۔ ابھی کوئی کتاب نہیں چھپی ہے۔

غزلیں:

متاعِ غم ہی بہت ہے گزر بسر کے لئے
یہ کام آئے گا سرمایہ، عمر بھر کے نے
ہمیں زمانہ سمجھتا تھا آفتاب مگر
جہانہ پائے اُجالا خود اپنے گھر کے نے
سفر میں لوٹ لیا ہم کو رہنماؤں نے
بڑے ہی شوق سے نکلے تھے جس سفر کے نے
چراغ ساتھ جو دیتا رہا اندھیرے میں
اُسی کو ہائے! بجھایا گیا سحر کے نے
اٹھا کے لے گئے کچھ لوگ وہ سحر ابجم
کہ جس کو لائے تھے ہم لوگ شہر بھر کے نے

جینا پڑا ہے یہ بھی تماشا لئے ہوئے
چہرے پہ چہرہ، چہرہ یہ چہرہ لئے ہوئے

محوس فر ہوں دھوپ کے اس روز گار میں
 سایہ کا جسم، جسم کا سایہ لئے ہوئے
 یہ زندگی تو ایسی ادھوری غزل ہے جو
 مطلع لئے ہوئے ہے نہ مقطع لئے ہوئے
 اب جنم دکھائے دیتے ہیں اب تو یہاں یہ لوگ
 خود اپنی زندگی کا جنازہ لئے ہوئے

۱۴۳

جلال تو قیر:-

نام شیخ جلال الدین صدیقی، والد صاحب کا نام شیخ علاء الدین صدیقی اور تخلص تو قیر ہے۔ قلمی نام جلال تو قیر ہے۔ ۷/ جولائی ۱۹۲۰ء کوٹھ میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمری میں اپنے نانا امام الدین صاحب سے اردو، عربی، فارسی اور دینی تعلیم حاصل کی۔ مولانا فضل حق سے بھی استفادہ کیا۔ جامہ اردو علی گڑھ سے ادیب ماہر، ادیب کامل کے امتحانات پاس کئے نیزا وادے پور سے میڈیکل پوسٹ گریجویٹ ایم بی بی ایس، ڈی سی ایچ، کا امتحان پاس کیا اور سرکاری ملازمت اختیار کی۔ بعد ازاں روزمرہ کے تبادلوں سے تنگ آ کر ودیگرو جوہات کی بنیاد پر اپنی مرضی سے سنیئر اسپیشلیٹ پیدی یا ٹرک کے عہدے سے سبد و شہ ہوئے۔ اب جے پور میں پرائیویٹ پر یکیٹس کرتے ہیں۔

قد در میانہ، رنگ گندمی اور نیکھے ناک نقشے کے فعال شخص ہیں۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہے، صاحبزادہ یاسین علی خاں نشاط ٹونکی کے اصلاح یافتہ ہیں، غالب رجحان غزل گوئی کی سمت ہے۔ روایتی غزل کی ساری خصوصیات اور خوبیاں ان کے کلام کا خاصہ ہیں۔ مختلف ادبی انجمنوں سے والیتگی رہی ہے۔ کلام رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ایک شعری مجموعہ بعنوان ”شاخ گل“ مرتب کر چکے ہیں جو منظر طباعت ہے۔

غزل لیں:

تیری خاطر ہم تری دنیا میں ٹھکرائے گئے
 جو بھی ممکن تھے وہ سب ہم پر ستم ڈھائے گئے

ہم نے گلہائے عقیدت تجھ پہ برسائے تو کیا
 ہار کانٹوں کے ہمیں سوبار پہنائے گئے
 کیا نہ پایا ہم نے تعمیر گلستان کا صلد
 جہاں بہار آئی تو گلشن سے نکلوائے گئے
 ہم نے نمرودوں کی کب پرواہ کی حالانکہ ہم
 آگ میں ڈالے گئے سولی پر چڑھائے گئے
 دیکھیے انجام کیا ہوا حضرت تو قیر کا
 سینکڑوں منصوراب تک دار پر لائے گئے

راہ گو سخت ہے پر خار و خطر ہے لوگو
 حق پر چلنا ہے تو کس بات کا ڈر ہے لوگو
 سنگ باری کرو پر یہ بھی خبر ہے لوگو
 جس میں تم رہتے ہو شیشے کا نگر ہے لوگو
 کیوں سزا میں ہمیں ناکرده گناہوں کی ملیں
 کیوں خطاكاروں سے صرف نظر ہے لوگو
 کیوں سلگتے ہیں ہمارے ہی نشمن ہر دم
 کوئی ہم ہی میں سے آمادہ شر ہے لوگو
 کون تو قیر ہے یہ کس سے ہے نسبت اس کی
 کفر کے سامنے جو سینہ سپر ہے لوگو ۲۷

ـ
کنور جاوید:-

نام اور تخلص کنور جاوید بدایونی والد صاحب کا نام محمد عادل صدیقی ۱۹۶۲ء میں کنور جاوید بمقام سہوان ضلع بدایونی (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ روہیل کھنڈ یونیورسٹی سے بی اے۔ دہلی یونیورسٹی سے ایل ایل بی۔ امتیازی

حیثیت سے پاس کئے۔ گورنمنٹ کانج کوٹھ سے اردو میں ایم اے۔ کیا۔

دراز قدلبی اور تیکبھی ناک، گندمی رنگ، بلوتی ہوئی آنکھیں اور پرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ والد بھی شاعر ہیں، اس لئے شاعری کا شوق و راشت میں ملا ہے۔ شعروخن میں کسی کو ہبھنہیں بنایا بلکہ اپنے ذوق و شوق کی ہی رہنمائی قبول کی۔ ۱۹۹۵ء میں کوٹھ میں شادی ہوئی اور اسی شہر کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا۔ مشاعروں اور کوئی سمیلنوں میں ان کی شرکت پروگرام کی کامیابی کی ضامن ہیں۔ بڑے بڑے شعروخن کے اجتماعات میں مدعو کئے جاتے ہیں۔ نظامت کے فن سے بھی واقف ہیں۔ کئی اخباروں اور انجمنوں سے وابستگی ہے۔ لال قلعہ کے مشاعرے سے لے کر بین الاقوامی کوئی سمیلنوں اور مشاعروں تک اپنی رس بھری آواز کا جادوجگا چکے ہیں اور داد و تحسین سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ خصوصاً گیت، غزلیں اور قطعات کہتے ہیں۔ سامعین کی نبض پر ان کی انگلیاں ہمیشہ رہتی ہیں۔ عصری حالات و قطعات کو اپنے اشعار میں خوبصورتی سے سمو نے کافن جانتے ہیں۔ انعامات و اعزازات سے مستفید ہو چکے ہیں۔ جلدی ہی ایک کتاب غزلوں، گیتوں، قطعات اور دوہوں پر مشتمل ”اور میں ننگے پاؤں“، چھپ کر منظرِ عام پر آنے والی ہے۔

غزل

نہ پوچھ پیٹھ پہ تیری یہ دارکس کا ہے
بس اتنا جان کہ تو رشتہ دارکس کا ہے
تیرا سفر ہے، ترا راستہ، تری منزل
تو آگے بڑھنے میں پھر انتظار کس کا ہے
پڑے پڑے یہاں سب سوکھ کر ہوئے پیلے
ہری ردا سے ڈھکا یہ مزار کس کا ہے
لرز رہا ہے تری انگلیوں میں جو لقمه
ذرا بتا ترے اوپر ادھا رکس کا ہے

گیت

کون سارکھوں نام
میں تیرا کون سارکھوں نام
صح بنا رسکھوں یا پھر رکھوں او دھ کی شام

نام تیرا سیتارکھ دوں تو میں رام نہیں ہوں
 نام تیرا میرا رکھ دوں تو میں برج دھام نہیں ہوں
 نام تیرا رادھا رکھ دوں تو میں گھنٹام نہیں ہوں
 نام تیرا رکھ دوں جوغز ل تو میر کی شام نہیں ہوں
 نام ترا گلبدن رکھوں تو نہیں ہوں میں گلفام....!!

نام تیرا خوشبو رکھ دیتا میں جو اندھیرا ہوتا
 نام تیرا جگنو رکھ دیتا میں جو انریکھر ہوتا
 نام تیرا ناگن رکھ دیتا میں جو سپیرا ہوتا
 نام تیرا درپن رکھتا جو روپ سنہرا ہوتا
 نام تیرا رکھ دیتا رباعی ہوتا اگر خیام!!

تجھکو تو اگر پائل کہہ دوں تو میں جھنکار نہیں ہوں
 تجھ کو اگر قاتل کہہ دوں تو میں تلوار نہیں ہوں
 تجھ کو راجملاری کہوں تو راجملار نہیں ہوں
 تجھ کو سر کا تاج کہوں تو میں شرنگار نہیں ہوں
 تجھ کو اگر آغاز کہوں تو نہیں ہوں میں انجام ...!!

آنکھ کو تیری جھیل لکھوں تو میں گھرائی نہیں ہوں
 زلف کو کالی گھٹا لکھوں تو میں پروائی نہیں ہوں
 جھکی نظر کو شام لکھوں تو میں تہائی نہیں ہوں
 باہوں کو دو پھول لکھوں تو میں انگرائی نہیں ہوں
 گردن کو لکھو جو صراحی نہیں ہوں میں بھی جام ...!! ۳۷

جممال سنگھ جاوید:-

نام جمال سنگھ، والد کا نام نول سنگھ اور تخلص جاوید ہے۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۴ء کو بمقام اکبر پور ضلع گوڑگاؤں پنجاب (جواب ہریانہ میں ہے) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں کوٹھ آئے ورے ۱۹۳۶ء میں نیوہائی اسکول کوٹھ سے میٹرک پاس کیا پھر ۱۹۵۰ء میں ہر برٹ کالج کوٹھ سے انٹر سائنس پاس کیا اور ۱۹۵۳ء کو دہلی کالج آف انجینئرنگ سے ٹیکسٹائل میں ڈگری لی اور کوٹھ کی بے کے سنتھیکس کس فیکٹری میں ملازمت اختیار کی۔

اپنے دیرینہ اور تخلص دوست ڈاکٹر وڈیا دھر شرما کے ساتھ مل کر ڈاکٹری کا پیشہ اپنایا اور خصوصاً غربیوں اور محتاجوں کی امداد کی مقصد پیش نظر رکھا۔ ۶ ر拂وری ۱۹۸۱ء سے رشہہ اپتال کوٹھ میں وی ڈی شرما کے خصوصی معاون کی حیثیت سے خدمات دے رہے ہیں۔

قد لمبا، ناک بڑی، چہرہ لمبوتر، رنگ دبتا ہوا اور آنکھیں مجسس ہیں۔ شاعری کا شوق اواں عمری سے ہی ہے۔ خصوصاً غزل میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ رنگِ سخن روایتی ہے۔ کوئی کتاب تاحال شائع نہیں ہوئی۔

غزلیں

کس نے زلف اہرائی بہاروں کا بیام آیا
اٹھایا میں نے جب ساغر، فرشتوں کا سلام آیا
دھرے ہی رہ گئے سب جام و صہبا اور پیانے
مری تو بہ جوٹی تب کہیں گردش میں جام آیا
ترے جذب طلب کا یہ کرشمہ کیا کہوں جاوید
نظر ہر ہر قدم پر مجھ کو وہ ماہ تمام آیا

کیا ہوا مضطرب ہے کیوں دو رکھن میرے لئے
آج تک بیتاب ہیں گنگ و جمن میرے لئے
غیر کو بخش گئی ہیں نرم و نازک ہستیاں
رہ گئی ہے شعلہ خوشعلہ بدنا میرے لئے

عبدالجید حیراں:-

نام عبدالجید، تخلص حیراں، ۵ فروری ۱۹۵۶ء کو فیض محمد صاحب کے گھر کیتھون شریف ضلع کوٹھ میں تولد ہوئے۔ پیشہ جامہ بانی اختیار کیا۔ کوٹھ ساری کے کارگر بھی ہیں اور تاجر بھی۔ جناب صابر کیتھون سے تلمیز ہیں، پڑھنے لکھنے کا شوق ہے۔ شطرنج سے شغف ہے، ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں وقت بسر کرنے کے عادی ہیں۔ غزل کہتے ہیں ابھی انہیں دور تک جاتا ہے۔ منزل تک پہنچنا، ان کے حوصلے پر موقوف ہے۔

غزل

کھوٹے سکے اُچھا تا ہے کیوں ہے
سب کو حیرت میں ڈالتا کیوں ہے
ہم بھی حق دار ہیں برابر کے
ہم کو گھر سے نکالتا کیوں ہے
ہم سے پینائی مانگنے والے
ہم پہ آنکھیں نکلتا کیوں ہے
صاف شفاف لوگ ہیں حیراں
إن پہ کچڑا اُچھا تا کیوں ہے
 DAG دامن کے دھولیے صاحب
 آپ کیا پاک ہو لیے صاحب
 دھوپ دروازہ کھٹ کھٹاتی ہے
 اب تو بیٹھے کہ سوئے صاحب
 اب تو ہنستے ہیں اپنی حالت پر
 جتنا رونا تھا رائیے صاحب
 لوگ کہتے ہیں بزم میں حیراں
 آپ بھی کچھ تو بولئے صاحب

پُر شوتم یقین:-

نام پُر شوتم یقین سورن کار، والد صاحب کا نام شنگر لال سورن کا را اور قلمی نام پُر شوتم یقین ہے۔ ۲۱ رجون ۱۹۵۴ء کو گھنی باندو اصلع قروی راجستان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم بی۔ ای۔ سی آیورودیہ رتن اور ساپتہ رتن تک ہے۔ فوٹو گرافی کے پیشہ سے مسلک ہیں۔ رنگ سانو لا ہے، آنکھیں خواب الودہ، چہرہ گول اور نکلتا ہوا ہے۔ ادا کار ای کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ ہاڑوتی، ہندی اور اردو میں شعر کہتے ہیں۔ موسیقی سے خاصی رغبت ہے۔ شاعری میں ہر صنف سے رجوع کیا ہے مگر غزل زیادہ کہی ہے۔ تلمذ کسی سے نہیں ہے۔ اپنے ذوق و شوق، مطالعہ کو ہی رہنمایا ہے زبان لفت آمیز ہے۔ شعوری طور پر ثقل الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ سنسکرت کے لفظوں کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔ شاعری مقصودیت کی حامل ہے۔ عوامی مسائل اور جدید دور کی پریشانیاں اور الجھنیں ان کے کلام کا حصہ ہیں۔ ہندی اور ہاڑوتی کے علاوہ اردو میں ۱۹۹۲ء ہیں ”ہم چلے کچھ اور چلنے“ ۱۹۹۷ء میں ”جھونٹ بولوں گا نہیں“ دیوناگری میں اور ”رات ابھی باقی ہے“ اردو میں غزلیات کے مجموعے شاعر ہو چکے ہیں۔ ۶ کے

”جھونٹ بولوں گا نہیں“ آپ کے اس مجموعہ میں وہ تمام غزلیں ہیں جن میں یقین صاحب نے موجودہ سماج کی مختلف دشواریوں میں ایک ہنر، سلکھی پر اسلوب اور انسانیت سے مکمل سماج کو سجانے اور سنوارنے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ جو دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں انہیں اپنی شاعری میں پُر خلوص انداز میں پیش کرتے رہتے ہی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

سوچنا اچھا، رُ اپہلے ضروری ہے مگر
وقت پڑنے پر جو جائے ہی ہوتا ہے
تازہ ہوا میں آنے دو کچھ دور ہونے دو گھنٹن
یہ کھڑکیاں بھی کھول دواس ایک درواز کے ساتھ

یقین صاحب ایک ایسے شاعر ہیں جو ہمیشہ سماجی کشمکش کو اپنی شاعری کا موضوع عُخن بناتے ہیں۔ آپ کی شاعری کے بارے میں جناب شیورام لکھتے ہیں۔

”پُر شوتم یقین صاحب کے ذہن میں اپنا بنا یا ہوا ”ایک سپنوں کا سنسار ہے“
جس میں بہت معصوم سے چہرے ہیں۔ بہت سے گھر ہیں، اندھیرے کی

ہار کا بھروسہ ہے اور جل کر ایسا جہاں بنانے کی چاہت ہے جس میں آدمی
اُگے کبھی کسی ذلت سے نہ گزرے۔“

آؤ مل جعل کر بنائے وہ جہاں ہم جس میں
کس ذلت سے نہ اگے کبھی آدم گزرے

یقین صاحب کی غزلوں کے اشعار سے ”طوفان“ اور جوار بھائی“ کے مانند در دنما یاں ہوتا ہے۔ اس کی فطرت ہے کہ وہ جیسا دیکھتا ہے ویسا ہی بیان کرتا ہے اس لئے اس کی شاعری میں زندگی کی سچائی کا عکس ہے وہ سماجی جدوجہد کا شاعر ہے۔ خاموش رہنا یقین صاحب اپر ادھ جیسا محسوس ہوتا ہے اس لئے اس کی غزلیں سنانا نہیں بنتی بلکہ خاموشی کے سنائے کو تورتی ہے۔ وہ جدیدیت پسند شاعر ہے۔ لیکن اس کی جدیدیت صرف رواج کی لکیر پیٹنا چھوڑنے تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس کی جدیدیت آپ بیتی کو ”جگ بیتی“ سے جوڑتی ہے۔ ۷۴ کے آپ ان شاعروں میں سے نہیں ہے جنہیں اپنے لکھنے کا مقصد اور معنی معلوم نہ ہو۔ بلکہ وہ سب کچھ جانتے بھی ہے اور اپنی شاعری میں ظاہر بھی کر کے دکھاتے ہیں۔ ان کا شاعرانہ میدان بہت وسیع ہے وہ ہر فن مولا شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تازگی اور روانی نہ صرف دیکھنے دکھانے محسوس کرنے کی بات ہے۔ آپ نے جہاں اپنے گردش پیش کے مسائل و مصائب کا ایک نئے احساس و انداز سے مشاہدہ کیا ہے وہی اپنے خیالات و تجربات کا اظہار و بیان کے لئے نئی نئی تراکیب واستعارات اور نادر علامتوں کا استعمال کیا ہے۔ آپ کی نظم ”اجی بڑے سکون سے گزری ہے زندگی“ سے چند اشعار پیش ہیں: ۷۵

گپوں سے آہٹوں پکان دھر رہی ہے زندگی
قدم قدم پہ دم بخوبی پھر رہی ہے زندگی
خود اپنے پاؤں کی صر سے ڈر رہی ہے زندگی
اجی بڑے سکون سے گزر رہی ہے زندگی

صحیح کیا؟ غلط ہے کیا؟ یہ تو لنا محال ہے
زبان ہے مگر زبان کا کھولنا محال ہے
ہمارے گر میں ہی ہمارا بولنا محال ہے
کسی کواب کسی کا دل ٹھوٹلنا محال ہے

بُرا ہے وقت اور بُرا ای کا بیان ہے بُرا
تو کیا بتائیں زندگی ہے کہ مر رہی ہے زندگی
اجی بڑے سکون سے گز رہی ہے زندگی ۸۷

آپ ہمیشہ سے ہی سماج کے دکھ درد کو محسوس کرتے رہے۔ آپ کا خیال تھا کہ لوگ ایک دوسرے سے پیار کرے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آئے۔ اپنے لئے ہی نہیں بلکہ سب کے لئے جینا ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ اسی مقصد کو لے کر آپ نے اپنی کمیٹی ”وکلپ جن سانسکرتک منچ“ کو ساہتہ کے میدان میں آگے بڑھایا۔ آپ کی شاعری کے مطابق جناب مخور سعیدی لکھتے ہیں:

” پُر شوتم یقین صاحبِنجی معلومات سے زیادہ اجتماعی تجربات کو موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ موجودہ دور کی سیاسی عیاریاں اور سماجی ناہمواریاں ان کا خصوصی ہدف ہیں۔ ان کی نظر کبھی کبھی ماضی کی عظمتوں کی طرف بھی جاتی ہے جن کے حوالے سے وہ حال کے خلا کو پُر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن موجودہ صورت حال جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں۔ خاص مایوسی کن ہے اور اسی مایوسی کے نتیجے میں ان کا لہجہ کہیں کہیں تلنگ ہو گیا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ تلخی ان کے مزاج کا حصہ نہیں بن پاتی وہ جلد ہی اسے جھٹک دیتے ہیں اور انسانی سرشت کی بنیادی نیکی پر جو ایک عظیہ خداوندی کی طرف ہے ان کا یقین بحال ہونے لگتا ہے جس کی بدولت ایک خوبصورت مستقبل کے خواب ان کی آنکھوں میں پھر چمک اٹھتے ہیں۔ ۹۷

پُر شوتم یقین صاحب نے ہندی اردو میں ہی نہیں بلکہ برج اور اجستھان بھاشاؤں میں بھی شاعری کی ہے۔ ان کی برج بھاشا ملاحظہ ہو :

ہنوكہ روؤں، کہ، مسکاؤں کا پری ہم کوئی
کریجا فاری کے مرجاوں کا پری ہم کوئی
جو تم نے کام ہو کوئ ا تو نکری ہیں گیسوں

اب اپنی اینٹ میں بل کھاؤں، کا پری ہم کوئی

اردو ہندی راجستھان اور برج بھاشا سبھی میں آپ نے غزلیں، نظمیں، گیت، دوہے وغیرہ لکھے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک غزل انگریزی میں بھی لکھی ہے۔ جو پنجاب کے ایک ادبی اخبار "Introducing Gajal" عنوان سے شائع کی۔ دور درشن جے پور اور آل انڈیا ریڈیو کے کوٹھے جے پور اسٹیشنوں کے مختلف پروگرام میں اپنی

غزلیں نظمیں پیش کرنے کا گاہے بہگا ہے موقع آپ کو ملا۔

پُر شوم یقین صاحب نے تضامین، ربا عیات، قطعات، گیت وغیرہ لکھے ہیں۔ تضامین لکھنے کا جو شرف پُر شوم یقین کو حاصل ہوا وہ کسی بھی بہترین شاعر کا ایک اہم کارنامہ ہوتا ہے۔ تضمین وہ شاعر ہی تحریر کر سکتا ہے جس کا ذہن وسیع اور بلند خیال کا حامی ہو۔ آپ نے کئی شعراء کی غزلوں پر تضمین لکھی ہیں۔ آپ کی لکھی ہوئی تضمین پر غزل فیض احمد فیض پیش ہیں۔

اس کو سب کچھ بتا کے دیکھ لیا
ہم نے آنسو بہا کے دیکھ لیا
غم پر پردہ گرا کے دیکھ لیا
رازِ الفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا
اب کہاں کوئی پردہ داری ہے
آپ نے جو کیا وہ کافی ہے
اب بھی امید کیوں وفا کی ہے
اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا
نہ ہی اچھے وہ رے نہ ہوئے
چھوڑ کر مجھکو غیر کے نہ ہوئے
مگر آثار یہ بھلے نہ ہوئے

وہ میرے ہو کے بھی میرے نہ ہونے
ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

بُت کا افسانہ کچھ سننا ہم نے
کچھ تھا سمجھایا ہم کو موسم نے
کچھ کہا جھلکے چشم پر نم نے

آج ان کی نظر میں کچھ ہم نے
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

کچ ادائی ستم بھی ہونہ سکی
آہ وزاری جرم بھی ہونہ سکی
آنکھ پنس ہنس کے نم بھی ہونہ سکی
فیض تکمیل غم بھی ہونہ سکی
عشق کو آزمائے دیکھ لیا

غزل

پھر حسین نعروہ کوئی لے کر چلو
اک نیاد ھو کہ کوئی اے لے کر چلو
یہ ممکھو ٹے سب پرانے ہو گئے
اب نیا چہرہ کوئی لے کر چلو
کوئی مانگے گا نہیں تم سے دوا
زخم خود گہرا کوئی لے کر چلو
زخمیوں کو کچھ نئے سے زخم دو
پھر نیا چارہ کوئی لے کر چلو
گرنا اپنی ذات سے منسوب ہے
پھر سے منصوبہ کوئی لے کر چلو
ٹھوکروں سے وہ بچا لے گا تمہیں
ساتھ میں اندھا کوئی لے کر چلو
بھول جائیں اپنی ہر الجھن یقین
مداعا ایسا کوئی لے کر چلو

محمد یقین الدین یقین:-

نام محمد یقین الدین یقین، والد صاحب کا نام غلام مجی الدین مفتول کوٹی اور تخلص یقین ہے۔ ۱۶ نومبر

۱۹۵۶ء کو کوٹہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ایم اے۔ ادیب کامل، فاضل، دینیات اور جز لزم اینڈ ماس کمیونی کیشن میں سند حاصل کی۔ اپنے والد صاحب سے ہی شعروخن کافن حاصل کیا۔ کوٹھرمل پاور میں سرکاری ملازم ہیں۔ قد کشادہ، رنگ دبنا ہوا، چہرہ پتلا اور آنکھیں روشن ہیں۔ مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر غزلوں اور گیتوں کی طرف زیادہ مائل ہے۔ کلام تازگی اور پڑکاری سے مزین ہے۔ مشاعروں اور نشستوں میں ترجمہ سے پڑھتے ہیں۔ رومانی وطنی اور اصلاحی نقطہ نظر کے قائل ہیں۔ نشر و اشاعت کے سلسلے سے وابستہ ہیں۔ ہنوز کوئی شعری مجموعہ سامنے نہیں آیا ہے۔

غزل

یہ موم کے مانند ہیں جل جائیں گے رشتے
سورج کی عمارت سے پکھل جائیں گے رشتے
پھر تم انہیں حسرت بھری آنکھوں سے تنکو گے
جب راکھ کے دھیروں میں بدل جائیں گے رشتے
دھاگے ہیں یہ کمزور نہ کھینچو انہیں اتنا
ٹوٹیں گے تو نفرت میں بدل جائیں گے رشتے
اجھیں گے تو کچھ روز بھی مشکل سے چلیں گے
سلک جھیں گے تو سوال بھی چل جائیں گے رشتے
پھر پاک محبت کی مہک آئے گی ان سے
سانچے میں وفاوں کے جو ڈھل جائیں گے رشتے
اپنوں میں یقین آیک الگ رنگ ہے ان کا
غیروں میں اگر ہیں تو بدل جائیں گے رشتے

گیت

ٹھیلے والا بوجھاڑ ہوئے آگے بڑھتا جائے
موسم چاہے گرمی الگلے یا پانی پر سائے
فکر اسے ہے دور وٹی کی شام کے دیپک باتی کی
بارش سے پہلے جھگلی پر ایک نئی بر ساتی کی

دن بھر محنت کرنا اس کو بد لے میں کچھ پیسوں کے
جن کے خاطر بوجھا ٹھانا دن پر ایسوں ولیسوں کے
پھر بھی خواہش ہے کہ میرا بیٹا پڑھ لکھ جائے
موسم چاہے گرمی اگلے یا پانی برسائے

جب سے اس نے ہوش سنبھالاتب سے ٹھیلہ پکڑا ہے
بیوی کی بیڑی بچوں کی زنجروں میں جکڑا ہے
نیتا جی کو فرصت کب جو بیچارے کی بات سنیں
اس کے ادھ نفے بچوں کے مرے ہوئے جذبات سنیں
نیتا جی تو چاہے اس کا ووٹ انہیں مل جائے
موسم چاہے گرمی اگلے یا پانی برسائے ۸۰
راہی ٹونکی:-

نام احمد حسن خاں، والد صاحب کا نام محمد حسین خاں تخلص راہی اور قلمی نام را ہی ٹونکی ہے ۱۹۲۱ء میں
ریاست ٹونک کے مردم خیز نھیں میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد محکمہ جنگلات میں انجینئر کے عہدے پر
فارز ہوئے۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۳ء بسلسلہ ملازمت کوٹھ میں سکونت رہی۔ اور کوٹھ ہی سے رٹائرمنٹ کے بعد اپنے
آبائی وطن ٹونک چلے گئے۔ اپنا کلام حضرت صاحب ٹونکی اور حضرت صیف ٹونکی کو دکھایا۔

کشادہ پیشانی، بھرا ہوا چہرہ، مناسب ناک، چمکدار آنکھیں، کھلتا ہوا گندمی رنگ، فربہ جسم اور قد آور
شخصیت کے مالک ہیں۔ روشن خیالی فطرت کا حصہ ہے۔ اور فرسودگی سے گدیڈاں رہے ہیں۔ شعر مزاج کلاسکل
اور صحت مندرجہ ایت کا حامل ہے۔ عموماً غزلیں کہتے ہیں۔ فارسی کا اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں۔ پرمغز اور بصیرت افروز
اشعار کہتے ہیں۔ ادبی سیاست سے کوسوں دور ہیں، کوٹھ کی شعر فضاؤں کی آبیاری میں ان کا ثابت رول رہا ہے۔ ان
کی غزل اپنی جدا گانہ شناخت رکھتی ہے۔ طبیعت میں ملنگی اور استغنا ہے، رسائل و جرائد نیز ریڈیو کے نشریوں سے
نسبت رہی ہے۔ کوئی کتاب اب تک منظر عام پر نہیں آئی۔

غزل

زندگی درد ہوئی جاتی ہے
 روشنی زرد ہوئی جاتی ہے
 تیز تر گردشِ ساغر ساقی
 انجمن سرد ہوئی جاتی ہے
 اُف یہ دنیا تری دنیا یارب
 کتنی بے درد ہوئی جاتی ہے
 کارواں جانے بھٹک جائے کھاں
 معتبر گرد ہوئی جاتی ہے
 جرأت عرضِ تمٹا رائی
 جرم کی فرد ہوئی جاتی ہے

وادیِ موت میں ہر گام نظر آتا ہے
 زندگی لے تر انجام نظر آتا ہے
 مت دکھاؤ مجھے آئینہ خدار ایارو
 چہرہ گردشِ ایام نظر آتا ہے
 کبھی دیکھا تھا جہاں جلوہ صد حسن و شباب
 ایک سایہ سا سر شام نظر آتا ہے
 اُف یہ عالم کے تصور نہ کیا تھا جس کا
 ہر نفس موت کا ایک جام نظر آتا ہے
 ڈوب جاتی ہیں اندھیروں میں نگاہیں رائی
 جب مالِ دلِ نام کام نظر آتا ہے

جبار را، ہی:-

نام عبدالجبار، والد صاحب کا نام واصل علی قلمی نام جبار را، ہی ہے۔ ۱۲ ار جولائی ۱۹۵۲ء کو انجین میں پیدا ہوئے۔ تعلیم میٹریک تک پہنچ سکی، شاعری کا شوق احباب کی محبت میں پروان چڑھا۔ امیر محمد صاحب کی تھونوی سے مشورہ تھن کیا۔ غزلیں کہتے ہیں، مقصدیت اور وطن پرستی کی آمیزش سے ان کی شاعری کا خیر عبارت ہے۔ درمیانہ قد کے مناسب ناک نقشہ گندمی، رنگ اور روشن آنکھوں کے حامل ہیں۔ ۵۷ء تا ۱۹۸۳ء گوپال مل کوٹھ میں ملازمت کی۔ اس کے بعد کوٹھ ساڑی کے کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ سیاسی اور سماجی خدمات میں لچکسی ہے۔ رنگ تھن عام ہے اور ابھی تک کوئی کتاب نہیں چھپی ہے۔

غزلیں:

بھلا ہم غم نصیبوں میں خوشی کی بات کیا ہوگی
جہاں بارش لہو کی ہو وہاں برسات کیا ہوگی
نہیں ہے قدر و قیمت جب تیری اپنوں کی نظروں میں
تو غیروں کی نگاہوں میں تیری اوقات کیا ہوگی
جہاں گرد تعصّب ہو ہر اک آئینہ دل پر
پھر اس محفل میں قومی ایکتا کی بات کیا ہوگی
کل کی بات ہے را، ہی کے وہ تھے ہم سفر میرے
مگر شاید انہیں اب یاد کل کی بات کیا ہوگی
قسمت ہے بد گمان کروں بھی تو کیا کروں
ذمہن ہے مہربان کروں بھی تو کیا کروں
مشہور تھا جو صاحبِ ایمان کے نام سے
نکلا وہ بے ایمان کروں بھی تو کیا کروں
اس نے جو بھکلو زخم دیئے وہ تو بھر گئے
مٹنے نہیں نشان کروں بھی تو کیا کروں

اوم پر کاش شرما دوست:-

نام اوم پر کاش شرما، والد کا نام مدن موہن جی شرما اور تخلص دوست ہے۔ ۱۹۶۲ء میں گورنمنٹ کالج کوٹھ میں اول درجہ میں ایم۔ ایس۔ سی۔ کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۹۶۴ء میں راجستھان یونیورسٹی میں پی۔ اچ ڈی کی سند حاصل کی۔ بحیثیت لیکچرر پہلے ٹونک پھر باراں اور آخر میں کوٹھ میں درس و تدریس کی خدمات انجام دی۔ ۱۹۶۸ء میں یہی سے واسن پرنسپل کے عہدے سے رٹائرڈ ہوئے۔

قدر درمیانہ، چہرہ کچھ لمبائی لئے ہوئے، نام مناسب عمومی خدوخال، گوارہ ورد بتا ہوا گندمی رنگ ہے۔ ہندی اردو اور ہاڑوتی تینوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں۔ غزلیں، نظمیں، دوہے، گیت پر مشتمل خاصہ شعری ذخیرہ جمع کر لیا ہے جو کتابی شکل میں آنے کا منتظر ہے۔ رنگ سخن عوامی ہے، نشر و اشاعت سے والبستگی ہے، اردو انجمن ہم سخن کے نائب صدر ہیں۔

غزلیں:

دشمنوں کے درمیاں یادوستوں کے درمیاں
عمر گزری ہے مسلسل حادثوں کے درمیاں
زندگی کے عکس کی پیچان نہ ممکن ہوئی
اس قدر تقسیم ہے وہ دھیوں کے درمیاں
جس طرف دیکھو کوئی ناصح کھڑا ہر موڑ پر
کھو گیا سب کچھ ہمارا مشوروں کے درمیاں
باغ میں کھلتے ہیں اکثر مختلف قسموں کے پھول
خوشبوئیں بُتی نہیں ہیں کیا ریوں کے درمیاں
یاد کرنے کے لئے کافی ہے پچھلے حادثے
پھر تصادم ہونہ جائے بھائیوں کے درمیاں

انہیں کے ہونٹ سینے کی رہی حسرت زمانے کی
جنہیں سب سے زیادہ تھی ضرورت مسکرانے کی
ہمارا کیا ہے ہم تو غم اٹھا کر یوں بھی جی لیں گے
دھواں جیسے اُلتی ہے یہ چمنی کارخانے کی
کسی نے اس لیئے شاید کسی کا گھر جلا ڈالا
کہ جس سے اور چوڑی ہو سکے چھت شامیانہ کی

۸۳

نعیم دانش :-

نام نعیم اختر، قلمی نام نعیم دانش، والد صاحب کا اسم گرامی عبدالعزیز انصاری (عزیز مانگروی) (۲۶ ستمبر ۱۹۶۷ء کو کوٹھ میں پیدا ہوئے۔ ایم اے۔ اردو تک تعلیم حاصل کی اور ڈاکٹر فاروق بخشی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ آج کل زمینوں کی خرید و فروخت کے کاروبار سے بھی منسلک ہیں۔ شعرو شاعری کا شوق ورثے میں ملا ہے، ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ جوش گو، خوش گفتار ہیں۔ موقعِ محل کے اعتبار سے شعر موزوں کر لیتے ہیں۔ طبیعت روائی ہے، قد مختصر اور ناک و نقشہ مناسب ابھی ان کا سفر طویل اور توقعات زیادہ ہیں۔

غزل

پالیا وصلِ صنم لطفِ جدائی مانگ کر
کیا کروں گا ان سے اب ساری خدائی مانگ کر
اُس نے میرے لب کی ساری مسکراہٹ چھین لی
جرم کیا میں نے کیا اُن سے کلائی مانگ کر
جیسے اُس نے سرپہ اک احسان کا پربت رکھ دیا
ہم بہت پچھتا رہے ہیں اُن سے رائی مانگ کر
خوب واقف ہوں میں انجامِ محبت سے حضور
کیا کروں گا تم سے عشق ابتدائی مانگ کر

وہ تو مجھ سے اور بھی کچھ بے تعلق ہو گئے
اب میں شرمندہ ہوں اُن سے آشنائی مانگ کر
شکر ہے دلنش خدا کا سُرخ روئی مل گئی
ان کے ہاتھوں سے مجھے رنگِ حتائی مانگ کر

۸۳

محمد سلیمان رہبر:-

نام محمد سلیمان رہبر، قلمی نام رہبر کوٹوی، والد صاحب کا نام حاجی محمد حیم بخش، ۱۹۲۰ء کو کوٹہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم بی اے۔ تک حاصل کی۔ مشہور شاعر وادیب مفتون کوٹوی کے برادر خورد ہیں۔ درس و تدریس کے پیشہ سے منسلک رہے۔ کوٹہ کی مشہور قدیم انجمن ”بزمِ ادب“ کے سیکریٹری بھی رہے ہیں، شاعری کا شوق اواکل عمری سے ہی رہا۔ ۱۹۳۴ء میں حضرت ثابت لکھنؤی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ خدمتِ اردو اور خدمتِ دین میں مصروف رہے۔ یوں تو ہر صنف میں دخل رہا لیکن غزل سے خصوصی نسبت رہی۔ غزل بڑی پرمument، پرمعتبر اور پ्रاًثر کی ہے۔ ان کا سلسلہ کلاسکل اعلیٰ روایتی شاعری سے استوار ہا ہے۔ ہم عمر شعراء میں اپنی الگ پہنچان رکھتے ہیں۔ قد او سط، رنگِ دبتا ہوا اور تینکھانا ک نقشہ ہے۔ مزاجاً خاموش طبع اور کم تحریر ہے، کوئی کتاب اب تک نہیں چھپی ہے۔

غزلیں:

بچی بھی ایک وسعت وہ میدانِ قیامت میں
اسے بھی میں نے پڑھ کر لے لیا دامانِ وحشت میں
نظر آتی ہے نفرت کی جھلکِ چشمِ عنایت میں
پلایا زہر بھی تم نے ملا کر جامِ شربت میں
یہ کیا سرمایہِ حسنِ عمل سے کم ہے قیمت میں
جودو آنسو ڈھلک آئے میری چشمِ ندامت میں
یہ شوقِ دادخواہی اللہ اللہ اپنے یذداں سے
کہ پہلے سب سے آبیٹھا ہوں، میدانِ قیامت میں

میں وہ پروردہ ہنگامہ و آفات ہوں رہبر
قیامت آئی استقبال کو خود میری تربت میں

ہجوم شوق میں دل بھول جائے مدد عاکیا ہے
محبت میں اسی کا نام تکمیل تمنا ہے
یہ آخر دم بدم کیوں بجلیاں گرنے لگیں مجھ پر
الہی خیر ہو شاید کہیں وہ مسکراتا ہے
امید و نیم کا عالم شب فرقہ کوئی دیکھے
چراغ آرزو سو مرتبہ بجھ بجھ کے جلتا ہے
زمانہ جانتا ہے کشۂ ناز و ادارہ بر
کسی کو کیا خبر، میں کیا ہوں، میرا مرتبہ کیا ہے

۸۵

عبداللطیف سرور:-

نام عبد اللطیف، والد کا نام عبد الوہاب اور قلمی نام سرور بارانوی۔ ۱۹۳۱ء کو باراں (ضلع کوٹھ) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ایم اے، بی ایڈ۔ تک حاصل کی۔ حضرت مفتون کوٹھی سے اصلاح لی۔ مزاحیہ شاعری بھی کرتے ہیں اور اس میں تخلص آباؤ کوٹھی ہے۔

۱۹۵۶ء سے شاعری کر رہے ہیں۔ رنگ قدیم کے قائل ہیں۔ غزلیں اور ہر لیں کثیر الاشعار ہوتی ہیں۔ روایت کی پاسداری شاعر ہے۔ اور بڑخن کے نائب صدر رہ کر شعر و ادب کی خدمت کی ہے۔ نشتوں اور مشاعروں میں حصہ لیتے ہیں۔ قد مختصر، چہرہ گول، آنکھیں بڑی، رنگ سیاہی مائل، آواز باریک اور تیز ہے۔ ۲۰۰۰ء میں فریضہ حج سے بھی فارغ ہو گئے ہیں۔ ابھی کوئی شعری مجموعہ نہیں آیا ہے۔
غزلیں

خطا معاف، کے ظالم کو مہرباں لکھ دوں
نہ ہو گا یہ کہ زمین کو میں آسمان لکھ دوں

اگر ہو قبضہ قدرت میں میرے اے ہدم
 تو تیرے نام، یہ سب دولتِ جہاں لکھ دوں
 تیری نگاہ کی اس بے رُخیٰ پیہم سے
 ہوا ہے قلب میرا پھر دھواں دھواں لکھ دوں
 یہ تیری غفلتِ پیہم ہے با غباں، جس سے
 اجڑ گیا ہے میرا ازالِ گلستان لکھ دوں
 ملا ہے مجھکو اجل سے سرو قلبِ حزین
 میں کس طرح دل غمگین کو شاد ماں لکھ دوں

جیسے گھر گھر کوئی جا جا کے گدا گرمانگے
 ووٹ ایسے، میرے، اس ملک کا لیڈر مانگے
 اس کو محفوظ بلاوں سے الہی رکھنا
 میرے مرنے کی دعائیں جو ستم گرمانگے
 پیاس بجھتی نہیں ایک جامِ منے الفت سے
 تشنگی میری، سمندر کا سمندر مانگے

محمد شاہد پٹھان:-

نام محمد شاہد پٹھان، والد کا نام حاجی شبیر محمد پٹھان اور تخلص شاہد ہے۔ ۱۹۲۹ء کو بالا کھیڑی ضلع کوٹھ میں پیدا ہوئے۔ مذہل اپنے گانوں سے اور ہائرشینڈری انتا سے کی۔ ۱۹۷۹ء میں کوٹھ سے بی اے۔ اور ۱۹۹۱ء میں راجستھان یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ ۱۹۹۳ء میں ایم فل کیا۔ ۱۹۹۵ء میں ہندی میں ایم اے کیا۔ فارسی میں ڈپلومہ کورس کیا۔ ایم اے میں ”کوٹھ کی شعری خدمات“ پر مقالہ لکھا اور ایم فل میں ”راجستھان

میں جدید شعری رجحانات، پر مقالہ مکمل کیا۔ پی۔ اتحادی کا موضوع ”آزادی کے بعد اردو میں جدید تنقید“ ہے۔ ۱۹۹۶ء میں آئی سی آرڈینی کے زیر اہتمام مقابلے میں ”مولانا ابوالکلام آزاد کا تصور دین“ کے عنوان پر لکھے گئے مقابلے کو اول انعام کا مستحق قرار دیا گیا اور اس سلسلے میں ۱۱ نومبر ۱۹۹۷ء کو صدرِ جمہور یہ ہند کے دستِ مبارک سے ۲۵ ہزار روپیہ کا چیک اور توصیف نامہ عطا کیا گیا۔

شاعری کا آغاز ۱۹۹۸ء سے ہوا۔ کسی سے اصلاح نہیں کی۔ اپنے ذوق و شوق کو ہی رہنمابنایا۔ حمد و نعت اور غزلیں کہتے ہیں۔ روایتی اردو کلاسیکی شاعری سے متاثر ہیں مگر نظریں میں حال اور مستقبل پڑھتے ہیں۔ شاعری کے علاوہ مضمون نگاری میں پید طولی حاصل ہے۔

درمیانہ رنگ سانو لا، آنکھوں میں ذہانت کی چمک، ناک لمبی اور خدو خال پر کشش ہیں۔ موقر جراند میں مضامین و کلام شائع ہوا ہے۔ ابھی کوئی کتاب منظر عام نہیں آئی ہے۔ ان کی ذہانت و فناخت سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

غزلیں

گھروں میں بھی کوئی ڈر کا ٹتا ہے

رہے باہر تو باہر کا ٹتا ہے

گلچین بھی بہت بیداد گر ہے

فقط خوش رنگ پیکر کا ٹتا ہے

منافق ہے کہ منکر ہے خدا کا

خدا کے گھر میں بھی سر کا ٹتا ہے

اتر جائے جو میداں میں مجاہد

تو پھر لشکر کے لشکر کا ٹتا ہے

نہیں پتھر بھی اس کے گھر میں شاہد

جو اک مدت سے پتھر کا ٹتا ہے

ستم گری کی روایت بہت پُرانی ہے
کبھی جو ختم نہ ہو گی یہ وہ کہانی ہے
ہر ایک دور میں ہوتے ہیں انس اور یزید
ہر ایک دور میں معقوب زندگانی ہے
دل بتاہ میں باقی نہیں کوئی ارماد
تمہاری چاہ کی کی اک آرزو پُرانی ہے
لگائے بیٹھے ہیں مدت سے ہم یہاں ڈیرے
تیرا دیا رمحبت کی راجدھانی ہے
نہیں ہے منصب، تخت، دَوَل تو کیا شاہد
ہماری لوح قلم پر تو حکمرانی ہے

۸۷

چاند شعری:-

نام چاند محمد قلمی نام چاند شعری۔ والد کا نام رکن الدین اور والدہ کا نام محمودہ۔ پیدائش ۸ جولائی ۱۹۶۶ء
کو گاؤں جھر موڑی (ضلع جھالاواڑ) میں پیدا ہوئے۔ ہائی سینکندری تک تعلیم حاصل کی۔ غزل کے بند ملاحظہ ہوں۔
ایک لمبی قطار باقی ہے
مفلسوں کی پکار باقی ہے
اسٹیل فرنچ پر کاروبار کرتے ہیں۔ کرکٹ، فلم اور مطالعے کے شو قین ہیں۔ آر۔ پی شرما ہر لیش صاحب سے شاعری
کافن سیکھا۔ رنگ دبنا ہوا، چہرہ گول، آنکھیں چمکیلی، جسم فربہ اور قد مختصر ہے۔ غزل کے بند ملاحظہ ہوں۔
آدمیت تو مرگئی شعری

اب تو اس کا مزار باقی ہے
شعر و شاعری میں دلچسپی اول عمری سے ہے۔ خصوصاً غزل کا شوق رکھتے ہیں اور ان کی شاعری میں عصر زندگی کی
پر چھائیاں لرزتی ہیں۔ اور پڑھ کر کہتے ہیں۔ زبان سادہ صاف اور ہندی آمیز ہے، سہل ممتنع کی روشن اختیار کی
غزل کے بند ملاحظہ ہوں۔
قتل معصوم ہو گئے لاکھوں

پھر بھی خبر کی دھار باقی ہے

کثرت سے ہندی اور آمیز ہے۔ اردو کے رسائل میں چھپتے ہیں کہ ہندی اردو نجمنوں سے جوئے ہوئے ہیں۔
مشاوروں اور نشتوں کے علاوہ ریڈ یو پرنگی بلائے جاتے ہیں۔
غزل کے بندپیش ہے ۔

سود ہی سود میں بکا سب کچھ

جو لیا تھا ادھار باقی ہے

زبان اضافتوں، علمتوں، تشبیوں و استعاروں سے بوجھل نہیں ہے۔ کلام میں ایہام وابہام کا دخل نہیں
ہے۔ سادگی و پروگاری شیوه سخن ہے۔ ایک کتاب دیناً گری رسم الخط میں ۲۵ دسمبر ۱۹۹۹ء کو شائع ہو چکی ہے۔ جس کا
نام ”زرد پتہ ہرے ہو گئے“ ہے۔

چاند شعری کی غزلیں ملک کی تمام ہندی اردو کی میگزین اور رسالے میں شائع ہوتی رہے ہیں۔ چاند
شعری آل انڈیا مشاعروں کوی سمیلنوں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ غزل کے بندپیش ہیں۔

نیند تو اڑگی دھواں بن کر

جلاتی بھتی سگار باقی ہے

لوگ ان کی غزلوں کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ چاند شعری ہندی اردو کی تمام تنظموں سے جوئے ہوئے ہیں
چاند شعری کی غزلوں میں قومی ایکتا جھکتی ہے۔ اس لئے لوگ ان کے اشعاروں کو نظمات میں پڑھتے ہیں۔ غزل
کے بندپیش ہے ۔

غزل

اُسے ہم امن کا پیغام دینگے

ہمیں جو جنگ کا میدان دے گا

ایک بچے کو کھلونا چائے

چاند جیسا پیار، پیار چائے

۸۸

ارادے کی اٹل پڑان دیگا

ہمیں خود حوصلہ طوفان دے گا

وہ دن کب آئے گا جب وقت ہم کو

ہماری گمشدہ مسکان دے گا

کہاں اب پوپ میوزک کا زمانہ
کشن کی بانسری کی تان دے گا
دھرم کوئی بھی ہودے گا محبت
محبت ہی ہمیں ایمان دے گا
اُسے ہم امن کا پیغام دیں گے
ہمیں جو جنگ کا میدان دے گا
لہو پیتا ہے جو دنیا میں شعری
وہ تیری نسل کو عنوان دے گا

امیر محمد صابر:-

نام امیر محمد ہے، تخلص صابر۔ والد کا نام عبدالشکور انصاری۔ ۱۵ ارجنون ۱۹۳۸ء کو کیتھون شریف (صلع کوٹھ) میں پیدا ہوئے۔ جامہ بانی پیشے سے مسلک ہے۔ کوٹھ ساڑی تانے بانے ملاتے ہیں اور اسی ذریعہ سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ حضرت روشن کوٹھی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ قد چھوٹا ہے، ارادے بڑے با قاعدہ تعلم حاصل نہ کر سکے۔ مگر ہندی اور اردو دونوں زبانیں جانتے ہیں۔ غزلیہ شاعری کے شائق ہے۔ مزاج فقیرانہ ہے اروغزل میں بھی قلندرانہ موضوعات کی کثرت ہے، مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، مشاعروں میں خوبصورت ترجم سے پاٹ دار آواز میں غزل سرائی کرتے ہیں۔ کوشش کریں تو ایک اچھے غزل گو شاعر بن سکتے ہیں۔ فیصلہ مستقبل کرے گا۔

غزلیں

اگر غم ہے تو غم اس بات کا ہے
سحر پر اب بھی قبضہ رات کا ہے
میں اپنے پاؤں پھیلاوں تو کیسے
میرا کمبل فقط نوہا تھکا ہے

دیے جلتے ہوئے کچھ ساتھ لے لو
 سفران جنگلوں میں رات کا ہے
 سراپا شہر کا لگتا ہے صابر
 لب و لہجہ مگر دیہات کا ہے

☆☆☆

سب سے بہتر ہے عمل کی زندگی
 سوبرس کی ہوکہ پل کی زندگی
 سوچتار ہتا ہوں میں اکثر یہی
 آج سے اچھی تھی کل کی زندگی
 دشمنوں میں آدمی ایسے رہے
 جیسے دلدل میں کنوں کی زندگی
 تم سے قائم ہے نظامِ فکر و فتن
 تم سے زندہ ہے غزل کی زندگی
 کتنے دن چل پائیں گے مکرو فریب
 کتنی ہو سکتی ہے چھل کی زندگی

۹۰

سعیدِ محتوی:-

نام سعید احمد خاں۔ والد کا اصغر علی خاں۔ قلمی نام سعیدِ محتوی ہے۔ ۱۸۲۶ء کو ایک خوشحال و مہذب گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ تعلیم ہائر سینڈری تک حاصل کی۔ بعد ازاں علاج و معالجہ کی تربیت لی اور اب پیشہ ور معاуж ہیں۔ اصلاح کسی سے نہیں لی۔ اپنے ذوق و شوق کو ہی رہبر بنایا۔ دو ریاضت میں سعیدِ محتوی قیصری ارو سعیدِ الجم کے نام سے بھی کلام چھپا۔ آخرش سعیدِ محتوی کے تخلص سے ہی سلسلہ سخن جاری ہے۔ چمکیل آنکھیں، دُبلا پتلا چہرہ، لبوں پر موچپوں کا غبار، اوپھی ناک اور مناسب قد و قامت کے حامل ہیں۔ اپنا کلام تحت اللفظ میں سناتے ہیں۔ نظم بھی کہتے ہیں لیکن غالب رجحان غزل کی طرف ہے۔ شاعری میں تازگی اور عصری آگہی کے عناصر

کا رفرما ہیں۔ زبان و بیان میں روایتی لفظیات سے گریناظر آتا ہے۔ ان کا شمار جدید شاعری کے شیدائیوں میں ہوتا ہے۔ نشر و اشاعت سے واپسی رہی ہے مگر اب تک کوئی شعری مجموعہ منظر عام پر پہنچ آیا ہے۔

غزلیں

چرچا یہی ہے چاہنے والوں میں آج کل
پڑتے ہیں کیوں بخور تیرے گالوں میں آج کل
تنگ آ کے سرد جھیل کی لہروں سے دستو!
چنسنے لگی ہیں مجھلیاں جالوں میں آج کل
میں بھی ادھر ہوں قید جوابوں میں ان دنوں
وہ بھی الجھر ہے ہیں سوالوں میں آج کل
صدیوں کی نیندا و دحد کے سقراط سو گئے
کیوں زہر گھولتے ہو پیالوں میں آج کل
انسان کھو گیا ہے مشینوں کے شور میں
پتھر کے جسم چپ ہیں سوالوں میں آج کل
جو تیر بزم سے اے جانِ بہاراں نکلا
دستِ وحشت میں لیے چاکِ گر پیاس نکلا
غمِ جاناں نے دلائیِ غمِ دوراں سے نجات
ہم جسے درد سمجھتے تھے وہ درماں نکلا
عظمتِ عشق کی تاریخ گواہی دے گی
کارِ دشوارِ عشق میں آسماں نکلا
آپ کے لطف نے جنثی بھی حیاتِ جاوید
آپ کا غم ہی میری موت کا ساماں نکلا
زندگی کیا ہے بس اتنی تو خبر ہے محنتی
جسمِ خاکی سے ہر اک سانس پر بیشاں نکلا

شمار احمد:-

نام شمار احمد، والد صاحب کا نام محمد خدا بخش۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو قصبه سانگود (صلع کوٹھ) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم میٹر ک اور ادیب کامل تک حاصل کی۔ عمر بھر سرکاری اسکول کے مدرس رہے۔ شغل بچوں کو ہندی، اردو اور مذہبی تعلیم دنیا اور شعر و ادب کی خدمت کرنے رہا ہے۔ شعراء اور ادباء کی صحبت میں رہ کر شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ مفتوح کوٹھی صاحب کو اپنا کلام دکھایا۔ نظم و غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی۔ اصلاحی، وطنی موضوع پر کلام بنی ہے۔ عمومی اور روایتی مزاج پایا یہ، رنگ سیاہی مائل دبلا پتلا چہرہ، چھریرہ جسم اور قد گوارہ ہے۔ ابھی کوئی مجموعہ کلام شاعر نہیں ہوا ہے۔

غزل

ناپید ہوا سلسلہ حفظ و امان کا
شیرازہ ایسا بکھرا ہے ہندوستان کا
اب تو درود یوار کا حافظہ ہے خداہی
”ہر اینٹ ساتھ چھوڑ رہی ہے مکان کا“
رہبر کی شکل میں یہاں رہن ہیں بے شمار
خطرہ ہر ایک پل ہے ہمیں اپنی جان کا
ہر سمت قتل و خون ہے لٹکی ہیں عصمتیں
کیا حال ہو گیا مرے بھارت مہان کا
باطل نے سراٹھا یا ہے سنبھلوڈ راثنا۔
اب وقت آگیا ہے تیرے امتحان کا ۹۲

ستار ندیم:-

نام عبدالستار خاں، تخلص ندیم ادبی نام ستار ندیم۔ والد کا نام عبد الخلیل خاں۔ ۱۵ اگست ۱۹۳۴ء کو کوٹھ میں پیدا ہوئے۔ اور آزادی وطن اور حیثیت سخن کی علامت بن گئے۔ تعلیم مڈل تک حاصل کی۔ اور نائلون فیکٹری جے کے سنتھیکس میں ملازم ہو گئے۔ ٹریٹر یونین میں حصہ لیا اور مزدوروں کے حق کے لیے لال جھنڈا بلند کیا۔ بیس

سال تک حق و باطل کی لڑائی میں معروف رہے۔ عرفِ عام میں کامریڈ ستار کے نام سے موسم ہوئے۔ میسا کے قانون میں جیل گئے۔ مل مالکوں نے خریدنا چاہا مگر کبھی بکنہیں۔ آخوش مل بند ہو گئی اور ایمانداری کی سزا بہ مع اہل و عیال کو بھلتتی پڑی۔ اب گھریلوں کی شیشہ سازی کا پیشہ کرتے ہیں۔ طبیعت میں انکساری اور فطرت میں غمگساری ہے۔ میانہ قامت اور او سط خال دوخت کے حامل ہیں۔ بحث و مباحثہ کی عادت ہے۔ ۱۹۸۳ء سے شاعری کوزریعہ اظہار بنالیا ہے۔ جناب آرپی شرما سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ شیشہ سازی اور سخن نوازی دونوں سے رشتہ استوار ہے۔ بقول شاعر

”ہے مشقِ سخن جاری چکتی کی مشقت بھی“

نشستوں کا اہتمام کرتے ہیں اور دل لگا کر ہر کام کرتے ہیں۔ شطرنج کے شوqین ہیں اور وطنی اصلاحی نیز ترقی پند شاعری کے امین ہیں۔ بہ طریقہ غزل کہتے ہیں انداز خطیبانہ ہوتا ہے۔ نشوواشاعت سے مستفید ہوئے ہیں۔ ابھی انہیں اپنا شعری تشخّص بنانا ہے۔ جس کے لئے لگن اور مشق ضروری ہے۔

غزلیں

شاعر ہوں میں شریک ہوں سب کے ملال میں
تاریخ مجھ کو یاد رکھے گی مثال میں
ہے پھر سے انقلاب کی صورت عیاں مگر
ہرنوجوں کا دھیان کہاں اس سوال میں
صحنِ چن میں آکے یہ احساس ہو گیا
گل ہیں، تو ساتھ ساتھ ہیں کانٹے بھی، ڈال میں
اُس میں بھی تیرے حسن کی رعنایاں کہاں
پونم کا چاند ماند ہے تیری مثال میں
اک ایک آرزو کا ہوا خون اے ندیم
باتی ہی کیا بچا ہے دل پائمال میں

نام دو رِزان اک مٹائیں گے ہم
 گلِ محبت کے ایسے کھلائیں گے ہم
 ہر بشر کو بشر سے ہوا الفت یہاں
 یوں دلوں کو دلوں سے ملائیں گے ہم
 جان حاضر ہے اپنی، وطن کے لئے
 جان دے کر بھی اک دن دکھائیں ہم
 شاد ماں ہوں ندیم اس وطن میں سمجھی
 با خدا ایسا بھارت بنائیں گے ہم

۹۳

ختم شد



حوالا جات

(باب سوم)

نمبر شمارہ	نام کتاب / رسالہ	صفحہ نمبر سنِ اشاعت	مصنف / مرتب
۱.	عقلیل شاداب کی شعری خدمات کا تقریبی جائز	۲۰۰۳ء	روبنیہ
۲.	رنگ (سہ ماہی) رسالہ	۲۵-۲۲	راشد انور راشد
۳.	عقلیل شاداب کی شعری خدمات کا تقریبی جائز	۲۰۰۳ء	روبنیہ
۴.	عقلیل شاداب کی شعری خدمات کا تقریبی جائز	۲۰۰۳ء	روبنیہ
۵.	ظفر غوری شخصیت، شعری خدمات اور انتخابِ کلام	۲۰۰۳ء	عبدالحفیظ
۶.	آباد خرابہ	۲۰۰۰ء	ظفر غوری
۷.	ظفر غوری شخصیت، شعری خدمات اور انتخابِ کلام	۲۰۱۰ء	عبدالحفیظ
۸.	اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت	۱۹۹۵ء	پروفیسر عنوان چشتی
۹.	آباد خرابہ	۲۰۰۰ء	ظفر غوری
۱۰.	ظفر غوری شخصیت، شعری خدمات اور انتخابِ کلام	۲۰۱۰ء	عبدالحفیظ
۱۱.	تیور (ہندر رسالہ)	۱۹۷۸ء	پریم پرکاش کانپوری
۱۲.	جدید اردو نظم نظریہ عمل	۱۹۹۰ء	عقلیل احمد صدیقی
۱۳.	توفیق کوٹوی کی حیات اور شعری خدمات	۲۰۰۹ء	نیلوفر اکرم
۱۴.	ظفر غوری شخصیت، شعری خدمات	۲۰۱۰ء	عبدالحفیظ

اور انتخابِ کلام

۵۱ ۱۰۹ ۲۱۰ ۳۳ ۱۵، ۱۶، ۳۱ ۱۱ ۱۰۵، ۱۰۵ ۳۸، ۳۵ ۱۰۵، ۱۰۲	عقیل شاداب احتشام اختر عبدالحی احتشام اختر احتشام اختر احتشام اختر احتشام اختر شاہین پروین عقیل شاداب عبدالحفیظ	تذکرہ شعرائے کوٹھ تبصہ نیلا آکاش "صحیح کاستارہ" راجستان میں غزل گو شعراء دریا کے کنارے دریا کے کنارے دریا کے کنارے اندازِ نظر کوٹھ کے نوجوان شعراء کی خدمات تذکرہ شعرائے کوٹھ ظفرغوری شخصیت، اور شعری خدمات
--	--	--

اور انتخابِ کلام

۸۱ ۸۷-۸۶ ۷۹-۷۸ ۵۰ ۱۰۳ ۲۱ ۹ ۲۰۰۹ ۱۳۶ ۹، ۸ ۵۰، ۴۹ ۱۰	عقیل شاداب عقیل شاداب سجاد ظہیر فاروق بخشی یوسف حسین خاں ڈاکٹر فرمان فتحپوری بشیر احمد توفیق نیلوفر اکرام عقیل شاداب فاروق بخشی نیلوفر اکرام فاروق بخشی	تذکرہ شعرائے کوٹھ تذکرہ شعرائے کوٹھ روشنائی مفہومیم اردو غزل اردو شاعری کافنی ارتقا سُنہرے خوابوں کی تعبیریں توفیق کوٹھی حیات و شعری خدمات تذکرہ شعرائے کوٹھ وہ چاند چہرہ سی ایک لڑکی توفیق کوٹھی حیات و شعری خدمات وہ چاند چہرہ سی ایک لڑکی
---	--	---

۳۷.	اداں لمحوں کے موسم	فاروق بخشی	۲۰۰۳ء	۱۳
۳۸.	اداں لمحوں کے موسم	فاروق بخشی	۲۰۰۳ء	۱۳
۳۹.	وہ چاند چہرہ سی ایک لڑکی	فاروق بخشی	۲۰۱۲ء	۹
۴۰.	نئی حسیت کا شاعر فاروق بخشی		۲۰۰۸ء	۱۵۱
۴۱.	مغایم	فاروق بخشی	۲۰۰۳ء	۹
۴۲.	توفیق کوٹوی حیات و شعری خدمات	نیلوفر اکرام	۲۰۰۹ء	۲۵
۴۳.	مغایم	فاروق بخشی	۲۰۰۳ء	۹
۴۴.	تذکرہ شعرائے کوٹہ	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء	۱۰۸
۴۵.	تذکرہ شعرائے کوٹہ	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء	۵۶
۴۶.	تذکرہ شعرائے کوٹہ	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء	۶۲
۴۷.	کوٹہ کے نوجوان شعرا کی شعری خدمات	شاہین پروین	۲۰۱۰ء	۲۸، ۳۵
۴۸.	دریا یاہریں اور کنارے	شکور انور	۲۰۱۱ء	
۴۹.	تذکرہ شعرائے کوٹہ	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء	۱۳۲
۵۰.	تذکرہ شعرائے کوٹہ	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء	۱۵۰
۵۱.	فضا جو کالوی فن اور شخصیت	آمنہ خاتون	۲۰۱۰ء	۳۰
۵۲.	فضا جو کالوی فن اور شخصیت	آمنہ خاتون	۲۰۱۰ء	۳۳، ۳۲
۵۳.	جدید "لکش"		مئی ۹۷-۱۹۹۸ء	
۵۴.	فضا جو کالوی فن اور شخصیت	آمنہ خاتون	۲۰۱۰ء	۵۸
۵۵.	فضا جو کالوی فن اور شخصیت	آمنہ خاتون	۲۰۱۰ء	۸۹-۸۷
۵۶.	فضا جو کالوی فن اور شخصیت	آمنہ خاتون	۲۰۱۰ء	۹۷
۵۷.	حسن نظر	فضا جو کالوی	۱۹۹۱ء	
۵۸.	تذکرہ شعرائے کوٹہ	عقلیل شاداب	۲۰۱۰ء	۱۷
۵۹.	ظفر غوری شخصیت، اور شعری خدمات	عبد الحفیظ	۲۰۱۰ء	۱۲۲-۱۲۰
۶۰.	کوٹہ کے نوجوان شعرا کی خدمات	شاہین پروین	۲۰۱۰ء	۸۰-۷۹

۶۱.	ظفرغوری شخصیت، اور شعری خدمات	عبدالحقیط	۱۰۸-۱۰۷ءے ۲۰۱۰ءے
۶۲.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۱۵۳ءے ۲۰۰۱ءے
۶۳.	لطفی کوٹوی (نخلستان)	ودیساگر	۹۲ دسمبر ۱۹۷۶ءے
۶۴.	لطفی کوٹوی (نخلستان)	ودیساگر	۱۹۲ دسمبر ۱۹۷۶ءے
۶۵.	ٹوٹ گیا سانسوں کا بندھن (نظم)	فرخ ندیم	۱۱۵ءے ۲۰۱۰ءے
۶۶.	ظفرغوری شخصیت، اور شعری خدمات	عبدالحقیط	۱۱۵ءے ۲۰۱۰ءے
۶۷.	ظفرغوری شخصیت، اور شعری خدمات	عبدالحقیط	۱۱۵ءے ۲۰۱۰ءے
۶۸.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۱۵۹ءے ۲۰۰۱ءے
۶۹.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۳۹ءے ۲۰۰۱ءے
۷۰.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۵۶ءے ۲۰۰۱ءے
۷۱.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۶۵ءے ۲۰۰۱ءے
۷۲.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۹۱ءے ۲۰۰۱ءے
۷۳.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۹۶ءے ۲۰۰۱ءے
۷۴.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۹۳ءے ۲۰۰۱ءے
۷۵.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۱۰۱ءے ۲۰۰۱ءے
۷۶.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۱۷۱ءے ۲۰۰۱ءے
۷۷.	سونج سے ٹھنی ہے میری	پروشوم یقین	۲۰۰۱ءے
۷۸.	پروشوم یقین حیات اور شعری خدمات	نیعم پٹھان	۲۰۰۹ءے
۷۹.	رات ابھی باقی ہے	پروشوم یقین	۲۰۰۵ءے
۸۰.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۱۷۳ءے ۲۰۰۱ءے
۸۱.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۱۱۳ءے ۲۰۰۱ءے
۸۲.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۱۱۸ءے ۲۰۰۱ءے
۸۳.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۱۰۳ءے ۲۰۰۱ءے
۸۴.	تذکرہ شعراۓ کوٹہ	عقیل شاداب	۱۰۲ءے ۲۰۰۱ءے

۱۲۳	۱۹۰۵ء	عُقِيل شاداَب	تذكرة شعراء کوٹہ	.۸۵
۱۲۶	۱۹۰۵ء	عُقِيل شاداَب	تذكرة شعراء کوٹہ	.۸۶
۱۳۲	۱۹۰۵ء	عُقِيل شاداَب	تذكرة شعراء کوٹہ	.۸۷
	۱۹۱۰ء	شاہین پروین	کوٹہ کے نوجوان شعراء کی شعری خدمات	.۸۸
۱۳۷	۱۹۰۵ء	عُقِيل شاداَب	تذكرة شعراء کوٹہ	.۸۹
۱۳۸	۱۹۰۵ء	عُقِيل شاداَب	تذكرة شعراء کوٹہ	.۹۰
۱۵۶	۱۹۰۵ء	عُقِيل شاداَب	تذكرة شعراء کوٹہ	.۹۱
۱۶۳	۱۹۰۵ء	عُقِيل شاداَب	تذكرة شعراء کوٹہ	.۹۲
۱۵۶	۱۹۰۵ء	عُقِيل شاداَب	تذكرة شعراء کوٹہ	.۹۳



باب چہارم

عقیل شاداب کی غزل گوئی

عقلیل شاداب کی غزل گوئی

رشید احمد صدیقی نے غزل کواردو شاعری کی آبرو، نیاز فتح پوری نے اردو شاعری کی روح اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے موسیقی کا رس اور فرماں گور کچپوری نے شاعری کا عطر کہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اصنافِ شاعری میں غزل سب سے زیادہ فطری دلکش صنفِ سخن ہے۔ اس کی تمام خوبی اس کے رومانی رکھار کھاؤ اور لب والہجہ کی ایماست اور مزیت میں ہے۔ ۱

”دریائے سخن میں فی زمانہ جس صنف کو بلا اختلاف رائے درجہ تا جوری حاصل ہے

وہ یقیناً غزل ہے۔ ۲

غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول ترین صنف رہی ہے۔ اس کے لغوی معنی عورتوں سے باقیں کرنا یا عورتوں کی باقیں کرنا۔ مثلاً غزل اس نظم کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق، اخلاق، مذهب، سیاست، معاشرت وغیرہ پر موضوع کا اظہار کیا جاتا ہے۔ غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے اور اسی کو مطلع کہتے ہیں۔ اگر ایک کے بعد ایک دوسرا مطلع ہو تو اس کو حسن مطلع کہتے ہیں۔ آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص پیش کرتا ہے اس کو ”مقطع“ کہتے ہیں۔ غزل میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہوتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی اور اب غزل میں حسن و عشق، تعریف، فلسفہ، اخلاقی و حکیمانہ، سماجی غرض زندگی سے متعلق ہر طرح کے خیالات کا اظہار کیا جانے لگا ہے۔ غزل اپنے بنیادی رمزیاتی اسلوب کی ملامت کے باوجود ہر دور میں بدکفر ہر بڑے شاعر کے کلام میں ایک نئی آن بان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔ بیان و اظہار اور ابلاغ ترسیل کی لاکھوں نزاکتوں اور بے شمار اطافتوں سے اس کا دامن لبریز ہے۔ شاعری کا تخلیقی عمل اپنی جگہ خود ایک پراسرار عمل ہے۔ اگرچہ ابتدائی طور پر تحریب مادی ہوتا ہے اور شاعر اپنی حسین قوتوں سے ادراک حاصل کرتا ہے۔ یہ ادراک جذبہ کی لہروں کو پیدا کرتا ہے۔ جذبہ اپنی ابتدائی حالات میں احساس میں اپنی شدید اور طاقتور حالت میں جذبہ کھلاتا ہے۔ ادراک جذبہ سے گلے ملتا ہے اور اس میں تحلیل ہو جاتا ہے بنیادی طور پر شاعر کی یہی جذبائی کیفیت اس کے شعری وجود ان کی تشکیل کرتی ہے۔ ۳

اردو شاعری کی ابتداء غزل سے شروع ہوتی ہے اس سے پہلے شاعر حضرت امیر خسرو کہے جاتے ہیں۔ غزل کا پہلا دور قطب شاہ سے شروع ہوتا ہے اس دور کے سب سے مشہور شاعر وی دکنی ہوئے۔ وی نے محبوب کے سراپے اور نگین جلوے اس طرح پیش کئے کہ نظریں خیر ہو گئیں۔ میر، سودا اور درد نے سوز و گداز اور صوفیانہ حالات کا اظہار اس انداز سے کیا کہ پڑھنے والے مسحور ہو گئے۔ صحیقی، انشاء اور جرأت نے فکر فن کے وہ جو ہر دکھائے کہ طبیعت عشق کر رکھی۔ ناسخ اور آتش اور شاہ نصیر نے اپنی صنایع اور استادی کے ایسے کمالات پیش کئے جن کی مثال پہلے کبھی ملی۔ میر، غالب مونمن اور ذوق نے اپنے میدان فن کے جو حسین نمونے پیش کئے وہ بھی اپنی جگہ یادگار ہیں اور اس طرح داع و آغ اور امیر نے بلبل ہزار داستان بن کر جو نغمے گائے ان سے شعرو شاعری کے دلدادہ آج تک مست و سرشار ہیں۔ ۲

شاعری لفظ شعور سے مشق ہے، جب شاعری اپنے احساسات، جذبات اور اظہار کے پھولوں کو بحر و وزن کے دھاگوں میں پروتا ہے تو شعر بنتا ہے۔ اور شعر کی نغمگی، موسقیت موزونیت براہ راست انسانی قلب و روح کے لطیف تاروں کو چھیڑ دیتی ہے۔ ٹھیک یہی انداز عقلی شاداب کی غزوں میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ دراصل اصناف سخن کی تاج میں دمکتا ہوا کوہ نور ہیرا ہے۔ غزل، عشق کی فضا بھی غزل ہے اور حسن کا مرانی بھی غزل ہے، غزل دراصل ایک بحر بکر اس ہے جس میں حب الوطنی کی پاکیزہ گنگا مدغم ہو جاتی ہے۔ اسی سمندر میں پیار و محبت کی جمنا بھی آلتی ہے۔ مظلوموں کی آہوں کے طوفان بھی اس میں اٹھتے ہیں بے کسوں اور بے بسوں کی بے چینی کی لہریں بھی اس میں موجود ہوتی ہیں۔

اس لئے غزل ابتداء سے لے کر آج تک اردو شاعری کی عظیم صنف سخن میں شمار کی جاتی ہے۔ صنفِ غزل میں طبع آزمائی کرنے والے حضرات بہتر تعداد میں موجود ہیں۔ جنہوں نے غزل کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا کیوں کہ غزل زمانے کے ادبی تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ کوٹے شہر کو دیکھیں تو یہاں بڑی تعداد میں غزل پر طبع آزمائی کرنے والے موجود ہیں۔ ان میں منتوف کوٹوی، عمر کوٹوی، ظفر غوری، عقلی شاداب، احتشام آخر، فاروق بحقی، عزیز ماگروی، کلیم اشرف ملکوری وغیرہ شعراء ہیں۔ جنہوں نے اس فن میں آسمان چھولیا ہے۔ اور اس بلندی پر وہی پہنچ سکتا ہے جس کا مشاہدہ وسیع ہو۔

راجستان میں اردو شعرو ادب کا فروع انسیوں صدی سے شروع ہو گیا تھا۔ جے پور، ٹونک، الور، جھالاواڑ، بھرت پور، کوٹہ، جودھپور، بیکانیر نے بھی شعرو ادب کا ماحول بنارہا۔ کوٹہ کی شعری ماحول کو سازگار بنانے میں ثابت لکھنؤی کا بڑا ہم رول رہا۔

غزلوں کے اعتبار سے عقیل شادا بَ رجستان کے شعراء میں اپنا ایک الگ اور اہم مقام رکھتے ہیں بلکہ اگرچہ یہ کہا جائے کہ ان کی صاف سُتھری اور بھی ہوئی تلاش ان کی غزلوں کے مطالعہ سے حاصل ہوئی ہے تو شاید غلط نہ ہوگا اور انہیں ایک جدید شاعر تسلیم کرنا بھی آسان ہوگا۔ ان کی نظر میں فرد واحد کی تلاش اور خودشناس کے عمل سے عبارت ہیں۔ ان کی کوشش بھی دوسرے جدید شاعروں کی طرح اپنے زمانے کو اپنے عہد کی تبدیلیوں سے آشنا کرنا نئی زندگی کے تقاضوں کو سمجھنا موجودہ اور آنے والی تبدیلیوں کا احساس کرانا اور انہیں ساتھ لے کر چلنے پر آمادہ کرنا ہے۔

”متاع و مال نہ دے دولتِ تباہی دے“

مجھے بھی مملکتِ غم کی بادشاہی دے“^۵

ان کی شاعری رات کی تاریک ہیبت ناک اور پُر تصور ماحول سے ابھر کر دن کی گھما گھموں سے نا بُردازم اس ہوتی ہے اور ایک ذہنی مسلسل کی شکل اختیار کرتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ رومانیت سے ان کا جڑا و جنسیت کی حد تک ہے۔ لہذا ان کے یہاں رومانی عنصر موجود تو ہے لیکن شدت اختیار کرنے کی وجہ سے وہ اپنی شعری نزاکت کو اس طرح قائم نہیں کر سکے جو کہ ایک رومانی شاعر کے لئے ضروری ہے۔ ان کا جدت پسند ذہن انہیں اظہار کی خوبصورتی سے الگ رکھتے ہوئے اظہار کی سچائی کا شاعر بناتا ہے۔ سبھی شاعر زندگی کے شاعر ہوتے ہیں لیکن عقیل شادا بَ زندگی کے رومانی ترقی پسند یا جدید شاعر نہیں بلکہ ان کی غزلوں کے تعلق سے زندگی کے شاعر زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ یہ وضاحت ان کے یہاں جا بجا دکھائی دیتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کہیں کہیں بے حد عام موضوعات کو بھی اپنے رویے سے خاص بنادیتے ہیں۔ جو دل کو بھی چھوٹے ہیں اور دماغ کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار ملا حظہ ہوں۔

اگ، تو، چولہا، چکلا، بیلن روئی
ایک اکیلی اور کتنے بندھن روئی
چاندر سر کی کی اور کبھی سورج جیسی
اماں کے ہاتھوں میں روشن روئی
شاہ سویرے سوندھی سوندھی خوشبوں سے
مہکاتی رہتی ہے گھر آنگن روئی

کہیں بنی بنیاد عبادت گا ہوں کی
اور کہیں پر چورا سی آسن روئی
انسانوں کی سب سے پہلی محبوبہ
فن کاروں کا سب سے پہلافن روئی ۲

غم و غصہ بھی ان کی شاعری کی اہم خوبی ہے خصوصاً ان کی غزلوں میں کئی بار شدت اختیار کرتا ہے لیکن صرف اس حد تک کے قاری اور سامع کو فرحت اور سکون عطا کر سکے لہذا سماعتوں یا ذہن پر گراں نہیں گزرتا اور قائل کرتا ہوا ہم سفر بناتا ہوا۔ خیال کی وسعت کے اعتبار سے آگے پڑھتا رہتا ہے۔ ان کے یہاں غزلوں میں طنز کا عصر بھی تیکھے روئے کے ساتھ ابھر کر آتا ہے اور بات کہتے کے انکے جاریہ انداز کو قائم رکھتا ہے جیسے ایک جگہ فرماتے ہیں۔

یوں ایک اچھے پڑوئی کا حق نبھادوں گا
وہ آگ دے گا میرے گھر کو میں ہوا دوں گا

یا

جب میرے گھر نے آگ پکڑی تھی
ملنے آیا تھا وہ ہوا کی طرح

مجموعی طور پر عقیل شاداب ان چند شعراء میں سے ہیں جنہوں نے فکر اور فن کی آبیاری کی ہے۔ پھر اس شاعر کو اپنی آس پاس کی دنیا بھی متاثر کرتی ہے۔ اور اُسے اپنا تہذیبی و رشہ بھی بہت عزیز ہوتا ہے اور ان سب کو ملا کروہ ایک ایسی فکری دنیا تعمیر کرتا ہے جہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں موجود ہوتے ہیں۔

عشق دنیا میں جس کو کہتے ہیں
یہ بھی ایک فتنم کی عبادت ہے
روح کو روح کا بلباواہ ہے
جسم کو جسم کی ضرورت ہے

لہذا انسانی رشتؤں میں سیادات محبت اور حقیقت پسندی کے قائل ہیں۔ بناؤٹ سے پر ہیز کرتے ہیں۔ حقیقت پسندی کو ہی اپنا پیرائے اظہار بنایا ہے اور اس سلیقے سے بات کی ہے کہ زیادہ تر جگہ اپنا دامن تلخیوں سے

پاک رکھا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہربات اس انداز سے بیان کی ہے جو زندگی کے تبدیل ہوتے ہوئے نئے سفر کا تعارف کرواتی ہے زندگی کی بہتر سمجھ عطا کرتی ہے۔

الغرض عقیل شاداب نے زندگی کو زندگی کی طرح دیکھا۔ زندگی کے سوز و ساز کو شعری پیرایا عطا کیا۔ اسی لئے ان کی شعری کائنات میں حسن و عشق، ہجر و صال، اشتیاق و طلب کے روایتی لطیف جذبات بھی موجود ہیں۔ جوار و غزل کی شاخت بھی ہیں۔^{۱۷}

عقیل شاداب کو نظم اور غزل دونوں اصنافِ سخن پر یکجا قدرت حاصل ہے۔ ان کا کلام بہت سے ہندوپاک رسائل میں شائع ہو چکا ہے ان کا شمار جدید شعرا میں ہی نہیں بلکہ جدید شاعری کو جنم دینے والوں میں ہوتا ہے۔

عقیل شاداب کے ایک ہم عصر شاعر احتشام اختران کی شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جدید شعرا میں عقیل نے اپنا ایک مقام بنالیا ہے۔ اور ہر صرف سخن میں
دخل ہے ان کی شاعری کا یہ کمال ہے کہ سن کر دل میں اترجماتی ہے۔ ایسا لگتا
ہے کہ شاداب کا شعری سفر اندر سے باہر کی طرف ہے اور اپنے آپ سے
جنگ کرنا ان کا شعار ہے۔ پیشتر اشعار میں اپنے آپ سے لڑائی کا اظہار
واشگاف کے انداز میں ہوا ہے ایک خاص بات یہ ہے کہ عقیل شاداب
رومی شاعری میں بند نہیں ہے۔ بلکہ اس کا کنوں بہت بڑا اور دن بدن بڑا
ہوتا جا رہا ہے۔ فرانڈ کا اثر واضح ہے اور وجودی فلسفے کی جھلکیاں بھی ان
کے کلام میں جا بجا بکھری پڑی ہے۔ بلا کی رومنی ہے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی
ٹھاٹھیں مارتا دریا ہے جو خس و خاشاک کو اپنے سیلاں میں بہائے لئے جا
رہا ہے۔ ایک کمزوری یا طاقت یہ بھی ہے کہ یہ غزل بھی کم شعروں کی نہیں
کہتے ۲۵ یا ۵۰ رشعت کا لانا تو ان کے لئے بہت معمولی بات ہے۔“^{۱۸}

عقیل شاداب کی شاعری میں بہت سے ایسے پہلو موجود ہے جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں ان کا کلام عصر حاضر کا آئینہ ہے اور آخر میں یہ کہ ان کے یہاں روایت کا عمل دل کم ہے۔ عشق و محبت کا جذبہ ہے اس جذبے نے اس قدر والہانہ پن اختیار کر لیا ہے کہ ان کی شاعری میں پاکیزگی کی جگہ جنسیت نے لے لی ہے۔ اگر ہم ان کی غزلوں کا بغور مطالعہ کریں تو ایسے اشعار بڑی تعداد میں مل جائیں گے جن میں جنسیت اپنی حدود سے

باہر نکل چکی ہے مثلاً چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بلا و لمس کا گز راجو حد سے
وہ السایا ہوا بستر سے نکلا
لمس کی لذت پتھر کو پکھلا دے گی
چھوکر اس ناری کو نار کیا جائے

عقلیل شاداب نے اپنی غزلوں میں ہندی دیو مالائی الفاظ کا استعمال بھی بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے کیوں کہ وہ اس کے استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ قلی قطب شاہ اور نظیراً کبر آبادی سے لے کر فراق گور کھپوری تک جس ہندوستانی روایت اور کلچر کی بات کی جاتی ہے اس کے نقوش بھی عقلیل شاداب کی شاعری میں جا بجا دکھائی دے جاتے ہیں۔

مشہور دانشور اور نقاد اندر سہ دیوئے عقلیل شاداب کی بابت لکھا ہے۔

”عقلیل شاداب سے پہلے بھی ہندی آمیز شاعری کی گئی ہے جیسے ناصر شہزاد وغیرہ مگر عقلیل شاداب کی پروازِ فقی ہے ہندی کے الفاظ ان کے یہاں پیوند نہیں لگتے۔ عقلیل شاداب کے یہاں بے انتہا امکانات ہیں،“ ۹

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس کو پوچا پاٹ کرتے دیکھ کر
آستھا بڑھنے لگی بھگوان میں
کیا مکہ متحوراً کعبہ کاشی
من بیراگی اپنا سنیا سی ہے
مل گئی میری کسی سے کنڈلی
آج میں تقدیر والا ہو گیا
یہ تو اچھی خاصی ویں کنیا نکلی
ہم سمجھتے تھے دنیا اپنی داسی ہے

عقلیل شاداب نے اپنی غزلوں میں ہندی دیو مالائی الفاظ کا استعمال تو کیا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ اسلامی تمیحات کا بھی آپ کی شاعری میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

ہم ایسے لوگوں سے پوچھو جیات و موت کا فرق
 یزیدیوں میں بھی ابنِ بتول بن کے رہے
 کچھ یزیدیوں کی مہربانی ہے
 ہو گیا شہر کر بلا کی طرح

عقلی شاداب کی شاعر میں طنز کا عنصر بھی جا بجاد بیکھا جا سکتا ہے۔ شاداب نے اپنے مکالمے میں سماج و سیاست اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو اپنے طرز کا نشانہ بنایا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔
 ایک خدا کی بستی جل کر خاک ہوئی

چند محافظتگارین تانے نکلے
 جو پلٹ کر بھی نہ دیکھیں گے
 تم سے وہ ٹوٹ کر ملیں گے بہت
 ہے نیا منظر نئے ایوان میں
 سچ رہے ہیں کیکیش گلدان میں

عقلی شاداب کی غزلوں میں ہجروصال کی کیفیت کلاسکی انداز میں بیان ہوتی ہے۔ شاداب کی عشقیہ شاعری کا یہی وہ پہلو ہے جو ان کی شاعری کو امتیازی درجہ عطا کرتی ہے۔ ایسے کچھ اشعار مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

خبر سن کے مطمئن ہوں میں
 وہ بھی میری طرح اکیلا ہے
 ایک اپنے نے بھری دنیا میں تنہا کر دیا
 عمر سناؤں میں اور تنہائیوں میں کٹ گئی
 عمر دونوں فریقوں کی باہم
 بھول جانے کی کوشش میں گزری

عقلی شاداب کی غزلوں میں سادگی اور سلاست بھی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے مشکل الفاظ سے گریز کیا اور سادہ سلیس الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ پیچیدہ اور دقیق الفاظ سے انہوں نے اپنا دامن بچائے رکھا۔ اس بات کی وضاحت کے لئے آئیے دیکھا جائے کہ موضوع اور شعری انداز کے اعتبار سے معاصرین شعرا اور عقلی شاداب

کے یہاں کیا فرق و امتیاز ہے۔

ظفر غوری عقیل شاداب کے قریبی ہم عصر ہیں جہاں ظفر غوری نے مشکل زمین ادق الفاظ میں شعر کہنا پسند کیا وہی عقیل شاداب نے مشکل الفاظ سے گریز کرتے ہوئے سادگی اور سلاست کو اپنا شعار بنایا ہے اور یہی سادگی اور سلاست ان کی شاعری کو منفرد بناتی ہے۔ مثلاً ظفر غوری کا ایک شعر ہے

دشت شب میں بادگل فشاں کے وہ ستم ہوئے
سوئے سوئے جنگلوں کے دست و پا قلم ہوئے
وہ میرے دل کو دکھانا چاہتا ہے
(ظفر غوری)

پاس آ کر دور جانا چاہتا ہے
(عقیل شاداب)

ظفر احمد پرواز بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں ان کی شاعری میں عشق و محبت کا وہی رنگ نظر آتا ہے جو عقیل شاداب کی شاعری میں موجود ہے لیکن عقیل شاداب کے یہاں عشق و محبت کا پہلوانی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے

مد ماتی آنکھوں سے ٹپکا کرتی ہے گفتار کی مے
بکھری زفیں دیکھ کے رم جاتا ہے گہر استانا (ظفر احمد پرواز)
زلف جھرنے کی طرح جس ہے صندل کی طرح
ایک جادو ہے تیرے حسن میں جنگل کی طرح (عقیل شاداب)

عقیل شاداب کے معاصرین میں ایک نام ڈم ڈم کوٹوی صاحب کا ہے۔ ڈم ڈم صاحب کی شاعری میں طزو مزاح کا عصر غالب رہ جان ہے جبکہ عقیل شاداب کے یہاں طنز کی کاٹ تو مل جائیگی لیکن مزاح کا پہلوان کی شاعری میں نہیں ملتا۔ پھر بھی زندگی کے تمام رنگ ان کی شاعری میں بکھرے پڑے ہیں جو قاری کو متناز کرتے ہیں

غیر تہا ہے میرے ساتھ ہے اڑکا بھی میرا
مجھ پہ لازم ہے محبت کی نظر دو بٹے تین (ڈم ڈم کوٹوی)

ہم نے بھی اب جینے کے ڈھب سیکھ لئے
پہلے نہیں سیکھے تھے سواب سیکھ لئے (عقلی شاداب)
دنیا نے شعر و ادب میں اکثر شاعر اپنی عظمت کا اعتراف خود کرتے ہیں لیکن عقلی شاداب کی شاعرانہ عظمت و شخصیت کو سمجھنے کے بعد اور ان کے معاصرین کا جائزہ لینے کے بعد خلیل تنور کا یہ قول ان کے فکر و فن پر پورا اترتتا ہے۔

عقلی شاداب کے معاصرین کے کلام کے مطالعہ کے بعد عقلی شاداب کی شاعری کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کا دار و مدار جذبے کی صداقت، واردات قلبی کی صداقت، عشق کی والہانہ ہم آہنگی خدا ری اور برجستگی پر رکھا۔ عقلی شاداب نے غزل کو ہندوستانی گنگا۔ جمنی رنگ سے آراستہ کیا ہے۔
بقول شاہد پٹھان:

”عقلی شاداب کی شاعری اپنے کیف کے اعتبار سے آبدار ہی نہیں تا ب دار و تہ دار بھی ہے۔ اس کا خالق خبردار ہی نہیں نظرداری اور جگرداری کے اوصاف کا حامل بھی ہے۔ اسلوب و اظہار کی سطح پر عقلی شاداب کی غزلوں میں اسطور سازی، علامت نگاری اور استفادہ سازی کا تخلیقی انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ عقلی شاداب نے غزل کی دیوی کو ہندوستانی رنگ و نور کے زیورات میں آراستہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس اعتبار سے انکا شمار ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے ترجمان فنکاروں میں ہونا چاہیے۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی میٹی اور یہاں کی آب و ہوا نیز ہند ایرانی مشترکہ تہذیب کی اعلیٰ اقدار و روایت کی شاعرانہ و مفکرانہ جلوہ گری ملتی ہے۔ اس طرح ان کی غزل کی تعریف سے ایک نئی شعری جمالیات ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو راجستان کی حد تک انہیں نمایاں مقام پر فائز کرتی ہے۔“ ۱۰

اردو غزل کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو قلب شاہ سے لے کر وہی کنی اور آگے امیر خسر و تک بادشاہوں سے خانقاہوں تک اس کا سفر بڑا ہی دلچسپ اور تحریر خیز ہے۔ پُرانی غزل یا روایتی غزل جو دراصل محبوب سے باقی مکرنے کے فن میں ماہر تھی آگے چل کر اپنے معنی اور مطلب کو بڑی خوش اسلوبی سے تبدیل کرتی ہے اور جانے

انجانتے ہی زندگی کی اس عام سڑک پر چلنے لگتی ہے جہاں محبوب کے ساتھ بقا یہ غم دنیا بھی اس کا ہم سفر ہو جاتا ہے اور اس نازک صفتِ خن میں اتنی قوتِ اظہار ہے کہ یہ ہر طرح کے احساںِ جمال کو جذبہ سرشار کو کیفیت کو زم کر کے چلتی ہے اور دنیا کو لمحہ بہ لمحہ اپنی موجودگی سے مخطوط کرتی چلی جاتی ہے۔ غزل کی یہ تاریخ مندرجہ بالا شعر سے آگے بڑھ کر میر، صحیح، انشاء، جزت سے لے کر غالب، مومن، ذوق، داع، عمر میناںی، جگر اور فراق تک آگے بڑھتی رہتی ہے اس سفر کے دوران اس کا مجاز عہد بہ عہد کبھی فطری اور کبھی غیر فطری طور پر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ اپنے مجاز کے اعتبار سے زمانے سے سلوک کرتی ہے۔ اور کبھی زمانہ اسے اپنے سلوک کے اعتبار سے اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ بہر حال تاریخ کو پڑھنے اور سمجھنے سے یہ پہلو واضح ہوتا ہے کہ اس کے دبستان فکر دور بہ دور یہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ میں اسے روایتی کہا گیا۔ شروعاتی زمانے کی غزلیں جو دراصل قلب شاہ ولی دل کی اور امیر خصرو کی فکر سے نسبت رکھتی ہیں۔ روایتی غزلیں ہی کہلاتی ہیں۔ حالانکہ یہ لفظ بھی زیر بحث آسکتا ہے کہ روایتی کس اعتبار سے جب کہ اس زمانے کی غزل میں بھی غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ زمانہ بھی جا بجا ڈھلتا، جھلکتا دیکھائی دیتا ہے۔ مگر ممکن ہے کہ دبستانوں کی یہ سوچ فن کے علاوہ کسی اور دنیا سے آئی ہو اور غیر شعوری طور پر فن کی دنیا میں داخل ہو گئی۔ کیوں کہ روایتی غزل صرف زبان کے اعتبار سے ہی روایتی کہلاتی جا سکتی ہے۔ خیال کے اعتبار سے نہیں۔ زبان کے اعتبار سے یوں کہ زبان کی اپنی تاریخ رہی ہے۔ اس نے بھی عہد بہ عہد خود کو تبدیل کیا ہے شاید اسی نظریہ کے تحت ان دبستانوں میں غزل کی تاریخ کو بھی روایتی کبھی ترقی پسند کبھی جدید اور کبھی مابعد جدید سے جوڑ دیا ہے کیوں کہ بنیادی طور پر تو یہ تفہیق بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ غمِ جاناں غمِ زمانہ بقول احمد فراز۔

غمِ دنیا بھی غمِ یار میں شامل کرلو

نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملے

مندرجہ بالا شعر دراصل حسن شاعری کا بہترین تعرف ہے جہاں غمِ جاناں اور غمِ زمانہ کی تعریف ہی ختم ہو گئی ہے اور عہدِ حاضر کے اس شاعر نے شاعری کا تعرف شاعری برائے شاعری کے نظر سے کروائے اور پر کی اس فرقہ وارانہ بحث کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔

عقلی شاداب اسی زمرے کے شاعر ہیں ان کی غزل کی آواز زندگی کے مختلف گوشنوں کو چھو کر ایسے آزاد ہو جاتی ہے کہ پتہ نہیں لگنے پاتا کہ دراصل وہ کس قبیلے کے شاعر ہیں کیوں کہ اس قبیلے پروری سے وہ ہمیشہ ہٹ کر شعر کہتے ہیں۔ انہوں نے بقول ان کے کبھی کسی مخصوص طرزِ فکر کو اپنے ذہن پر ہادی نہیں ہونے دیا۔ بلکہ عین اپنے مزاج کے حساب سے دنیا سے بات کرنے کے غزل روپی ہنر کو برتاؤ اور آگے بڑھایا۔ ان کا طرزِ فکر طرزِ سخن اور طرزِ

زندگی تینوں ہی تقریباً ایک ہیں اس لئے وہ اس خاندانی تاثر سے ہمیشہ آزاد رہے اور جب لکھا تو اپنے جذبہ و احساس کی نمائندگی اس طرح کی کہ وہ صرف عقیل شاداب کے نام سے پہچانا جائے نہ کہ اس نام نہاد گروپ کے ویلے سے۔

الہذا اس عظیم شاعر پر بات کرنے یا لکھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا بے حد ضروری ہے کہ وہ زندگی کسے جیتا ہے۔
شاداب صاحب بچپن ہی سے بڑے بے فکر، بڑے محنت آمیز، بڑے رقيق القلب اور ملن سار آدمی تھے ان کی فطرت میں ناپسندگی کا عصر تقریباً نہیں کے برابر تھا۔ جہاں قبولیت انکے یہاں ایسی بھرپور تھی کہ کبھی کسی کو نظر انداز نہیں کر پاتے تھے بلکہ زندگی کو اس طرح اپنے ساتھ لے کر چلتے تھے جیسے اس کا موت یا خاتمہ سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

بقول احمد ندیم قاسمی:

عقیل شاداب پچھلیوں ہیں:

کون کہتا ہے موت آئی تو مر جاؤں گا

میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

انہوں نے نہ صرف اس احساس کے پیش نظر زندگی کو جیا بلکہ اسے اپنے فن میں ثابت کر کے بھی دکھایا۔ وہ ایک اسے عظیم مفکر ہیں جو زندگی کے جھگڑوں میں الجھنے کے بجائے انہیں ساتھ لے کر جانے کے عادی ہیں۔ اور اپنی فنی چاک دستی سے اسے جا بجا اس طرح جیا اور ادا کیا ہے کہ پڑھنے اور سننے والا حیرت میں رہ جاتا ہے انکے چھوٹے بیٹے فرخ ندیم اکثر ان سے یہ پوچھا کرتے تھے کہ تباہی کا تعلق محبت سے کیسے ہو سکتا ہے یا اپنی غزلوں میں آپ تباہی کی دعائیں کیوں مانگتے ہیں وہ مسکرا کر التفات آمیز نگاہیں فرخ ندیم پر ڈالتے اور خاموش ہو جاتے کیوں کہ وہ کہتے تھے کہ:

متاع و مال نہ دے دلت تباہی دے

مجھے بھی مملکت غم کی بادشاہی دے

اب یہاں جب تک کوئی بالغ النظر اور بالغ شخص اس شعر کو اس کے مکمل احسا کے ساتھ اس کے مکمل تاریخی پس منظر کے ساتھ سمجھے اور پڑھنے نہیں تو وہ کیسے سمجھ پائے گا کہ اس غم اور تباہی کے معنی کیا ہیں ہاں اس مسئلے کو انہیں کے ایک اہم عصر شاعر بشیر بدربیوں با آسانی حل کر دیتے ہیں کہ:

پتھر کے جگروالوں غم میں وہ روائی ہے

خود راہ بنالے گا ہتا ہوا پانی ہے

لہذا یہاں شاداب صاحب کی عظمت فن نام سے ہاں کو سمجھ لینے کے فن سے تعارف کروارہی ہے کیوں کہ یہ تو ازال سے غزل کی خوبی رہی ہے کہ اس کا پیرائے اظہار بھی تو بالکل واضح ہوتا ہے لیکن کبھی یہ معنی اور مطلب کی روٹ میں چھپ کر دھیمے دھیمے اسی طرح مسکراتی ہے کہ راز دنیا ز کی تھے اہل نظر کے سامنے کھلتی چلتی جاتی ہے۔ فن کوئی بھی ہو جب تک اسے لکھنے، پڑھنے یا سمجھنے والا اس کے بنیادی شعور سے کیفیت نہیں رکھتا ہو مکمل طور پر مخطوط نہیں ہو سکتا۔

لہذا شاداب صاحب کو سمجھنے کے لئے بھی کبھی کبھی ان الجھنوں سے گزر کر ان آسانیوں کی طرف آنا ہوتا ہے جو ان کی شخصیت اور فن کے بنیادی سرچشے ہیں صرف غزل ہی ایک ایسی صنف سخن ہے جو موضوع کے اعتبار سے اپنے اندر اتنی ہم گیری لئے ہوئے ہیں جو کسی اور صنف سخن کو حاصل نہیں۔ کیوں کہ اس کا طریقہ اظہار اکائی سے شروع ہو کر کائنات تک با آسانی پہنچ جاتا ہے اور پھر نشانہ ایسا اچوک ہوتا ہے کہ بات دل سے نکل کر دل میں اترتی ہے۔ لہذا شاداب صاحب جو اس نقطہ نظر سے پیدائشی طور پر واقف تھے جو اپنی غزل میں اعجاز بیان کے یہ کارنامہ انجام دیتے رہتے ہیں ہاں یہ نقطہ بہ آسانی سمجھ میں آتا ہے کہ ان کی خوشیوں کا انحصار ان کے آفاقی غم سے منصوب ہے جسے انہوں نے اردو غزل میں اس کے علاوہ شاداب صاحب کی شخصیت بنیادی طور پر اصلی مشرقت کی آئینہ دار ہے اور وہ اپنا طرزِ فکر اس رو سے کوپنا کر غزل کی زبان میں ہم تک پہنچاتے ہیں۔ مثلاً ان کے یہاں اپنی خاگنی زندگی کا اظہار بھی اس طرح ہوتا ہے کہ مٹی کی خوبیوں سے ہمارا تعارف ہندوستانیت کے اعتبار سے مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

لکھتے ہیں :

انگنائی چھٹپٹا رہی ہے واپس آ

گھر کی چھوکٹ بلارہی ہے واپس آ

کچا آنگن اور اکیلی کوریا

دو پھری چلچلا رہی ہے واپس آ

سر دتوے پر کب سے ادھ کچھ روئی

چو لہے کامنہ چڑا رہی ہے واپس آ

یہاں شاداب صاحب اپنے زیادہ تر جذبات، خیالات کا اظہار اس خوبی سے کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی سماجی زندگی خاندگی کیفیت اور طرزِ اسلوب اس طرح کا ہے یہ معاشراتی نمائندگی ہر ایک شاعر کو اس سچائی سے حاصل نہیں ہوتی جتنی اس شاعر کو ہوئی ہے عقیل شاداب اپنے ملک اور زبان و تہذیب کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

رُوْعَ كَيَا تَحَايَيْمَيْن بَيْطَحَ كَرْمِيرَى جَانَ نَ

مَجْهَيْقَيْنَ هَيْ خَذِينَهَيْمَيْنَ سَنَكَلَهَ

اس طرح زبان اور بیان کے ایسے تہذیبی نادر و نایاب نمونے ان کے کلام میں جا بجا جلوہ گر ہیں اور ہمارے ملک کے اور جمل کلچر کو واضح کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ والہانہ اندازان کی شاعری کونہ صرف دلچسپ اور ہر دل عزیز بناتا ہے بلکہ Motivational بھی ہے اور پڑھنے اور سمجھنے والے کو ہمارے ملک کی معاشرتی اور اخلاقی زندگی سے بہتر طور پر تعریف کرواتا ہے۔ کسی بھی قوم کے اچھے شاعر کا یہ کارنامہ بے حد ضروری ہے کہ وہ اپنی تہذیب کے نقوش اپنے فن میں مسلسل ظاہر کرتا رہے اگر اس طرزِ عمل میں وہ کامیاب ہے تو یہ اسے شاعر کہلانے کا حق ہے سوچ کا Universal ہونا بے حد لازمی ہے لیکن جڑوں کا محفوظ رہنا اس زیادہ ضروری ہے کیونکہ دنیا کے کسی بھی ادب کا شاعر زبان کے اعتبار سے اپنے تہذیبی عمل کے اعتبار سے کسی ایک مخصوص طرزِ فکر کی دین ہوتا ہے یہ کام دراصل اس طرح کا ہے جہاں ہمیں کسی ایک راستے پر چلتے ہوئے راستے کی ہمواری کا خیال تور کھانا ہی ہے۔ ساتھ ساتھ اپنے اعتراف سے باخبر ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ عقیل شاداب کے یہاں اپنے مذہب کی پاسداری بھی ہے اور وہ اس تضاد سے بھی باخوبی واقف ہیں جس کا شکار ہمارا معاشرہ اکثر و بیشتر ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں۔

ہم اپنے عہد میں جنسِ فضول بن کر رہے

یہودیوں میں خدا کے رسول بن کر رہے

ایک شاعر اپنی بات کہنے کے اعتبار سے کبھی کبھی ایک عام آدمی سے اس لئے الگ ہو جاتا ہے یا منفرد ممتاز ہو جاتا ہے کہ اسے بات کو بہتر طریقے سے کہنے کا عمل تو آتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی بات کو سماج کے سامنے پیش کرنے کے واقعہ میں ایک عام آدمی سے زیادہ بہادر ہوتا ہے اور یہ اس لئے ممکن ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کی سمجھ عام آدمی سے بہتر ہوتی ہے اور رہنمائی اور رہبری کے اوصاف قدرتی طور پر اس میں اور وہ سے زیادہ ہوتے ہیں۔ لہذا اپنے لاشعور میں پلنے والی تمام باتوں کو وہ ایک مخصوص کیفیت کے تحت اس ترتیب و سلیقے سے ادا کرتا ہے

کہ اس پھول سے نکلی ہوئی خوبیوں کے شیدائیوں کو حد درجہ مخطوط کرتی چلی جاتی ہے۔

شاداب صاحب بھی اپنے فطری طرزِ عمل کے اعتبار سے نہ صرف ایک بڑے شاعر ہیں بلکہ عالمی سطح کے مفکر بھی۔ اس لئے وہ جب بھی کوئی مضمون شعر میں ادا کرتے ہیں تو زیادہ تر ان کی غزل کے نشتر اپنی اثر انگیزی کو ثابت کر کے رہتے ہیں اور اس خوبی کے ساتھ کہ جو پڑھنے اور سننے والے کو ان کی بات تسلیم کرنے کے لئے کی قسم کی زبردستی کا شکار نہیں کرتی بلکہ لکھا ہوا سچ بہت جلدی سنا ہوا اور سمجھا ہو ثابت ہو جاتا ہے۔ شاداب صاحب کو اپنے ملک سے بے پناہ محبت ہے ان کا اپنی تہذیب سے گہرا جڑا ہے اس لئے ان کے یہاں یہ قرب بھی نظم ہوا ہے۔

بلاؤ رزق کا برتر ہر تعلق سے

پرندے اپنے نشانیں بھی چھوڑ جاتے ہے

یہاں ان کے قلندرانہ صفات کا اظہار بڑے معاشر طریقے سے ہوا ہے اور انہوں نے زندگی کی ماڈی ضرورت سے انسانی رشتے کو اس توازن سے نظم کیا ہے کہ وہ آفاقی ہو گیا ہے ساتھ ہی ساتھ ایک یقین کامل بھی آشکار ہے کہ ماڈی ضروریات ہی زندگی کی بنیاد نہیں بلکہ دنیا میں جینے اور زندہ رہنے کے لئے انسانی رشتہوں کا ہموار رہنا اس سے زیادہ ضروری ہے اپنی پوری زندگی جس شخص نے جہدے مسلسل کے طور پر جی ہو وہ یہی تو لکھ سکتا ہے۔

خشک ہیں عافیت کی جھیلیں بھی
سر پہ منڈرار ہی ہیں چلیں بھی
زندگی نے بھی مار رکھا ہے
وقت نے ڈال دی ہیں نیلیں بھی
تنگی حد سے بڑھ کیں لیکن
دسترس میں نہیں سبیلیں بھی

مندرجہ بالا سطور فرید واحد کا انتشار بھی ہے اعتبار بھی ہے اور اس کا زندگی سے پیار بھی ہے کیونکہ یہاں ایک شخص تنگی کا شکار نہیں۔ بلکہ اس سے مخطوط ہونے کی بے قرار صلاحیتیں بھی رکھتا ہے تبھی جا کر اس نے یہ بھی لکھا ہے۔

زندگی کے اجاڑ صحرا میں

تنگی کا الاؤ روشن ہے

یہاں بھی محرومی نظر نہیں آتی بلکہ زندگی کا حاصل دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ زندگی کو اجاڑ صحرا کہنا دراصل

زندگی کی سچی اور اصلی مصوّری ہے انسان کی سوچ اس کے احساس اور اس کے عمل کی حد میں صرف یہی تو ہے کہ وہ اپنی بھر پور ڈنی صلاحیتوں کے ساتھ زندہ رہے لیکن زندگی میں ظاہر ہونے والے اُتار چڑھاؤ خود بے خود یہ سبق سکھا دیتے ہیں کہ زندگی کی ترتیب و تہذیب اس کے تابع یا اس کے غلام نہیں بلکہ وہ حالت کے بنتے بگڑتے رہنے سے ثابت ہے۔

لہذا یہاں شادا ب صاحب نے اپنی شاعرانہ عظمت کے بھر پور استعمال سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زندگی ایک سفر ہے اور اس کا حاصل بھی سفر ہی ہے۔ یہ سوچ کر زندگی جینا دراصل زندگی کو آسان بنانا نہیں بلکہ زندگی کی مشکلات کو بہتر طور پر سمجھنا ہے۔ اور ان کو سمجھنے کے ساتھ اس سبق کو حاصل کرنا بھی ہے کہ مسلسل پانے اور کھونے کا یہ سلسہ ہی زندگی ہے۔ اسی تسلسل اور ارابطہ کوئی شاعر وہ نے اپنے اپنے طریقے سے ظاہر کیا ہے۔ یہاں اسی تناظر میں ایک بڑا مقبول شعر ذہن میں آتا ہے یہ بھی تلاشِ جستجو کا ہی اظہار کرتا ہے۔

نہ تو کاروائی کی تلاش ہے نہ ہی ہم سفر کی تلاش ہے
میرے شوق خانہ خراب کو تیری رگہز رکی تلاش ہے

لہذا بقول شادا ب صاحب ان کی تشقی بھی زندگی کے سفر کا بہتر تعرف کرواتی ہے اور دراصل یہ تشقی لگتی ہی نہیں بلکہ زندگی حاصل کرنے کی جدوجہد معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ با ظاہر کئی جگہ ان کے شعر پڑھنے پر ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی شکست کا شکار ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شادا ب صاحب زندگی کے میدان کے ایک کامیاب شکاری ہیں اور انہیں اپنے منازل حاصل کرنے کا سلیقہ معلوم ہے تھی تو وہ اپنے شعر میں بھی بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں۔

عشق دنیا میں جس کو کہتے ہیں
یہ بھی ایک قسم کی عبادت ہے
روح کو روح کا بلا وہ ہے
جسم کو جسم کی ضرورت ہے

جسم اور روح کا یہ با کمال تعرف فتح یا ب تذکرہ زندگی کے مکمل سفر کو سمجھانے کے لئے کافی ہی نہیں بلکہ لامحدود سعتوں کا حامل ہے لہذا عقیل شادا ب اسے روشن امکانات کے شاعر ہیں جن کا ڈنی سفر ماضی، حال، مستقبل تینوں زمانوں کا مکمل احاطہ کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں زندگی جینے کا وہ بہتر سلیقہ عطا کرتا ہے جسے ہم صحیح معنوں میں زندگی کہہ سکتے ہیں۔ جہاں جہاں انکے یہاں شکست خرد م موضوعات نظم ہوئے ہیں وہاں وہاں اس دبی ہوئی

چیخ نے اپنی موجودگی کو حقیقتاً ایک فتح یا بآواز کی شکل میں ثابت کیا ہے اور ان کی یہی خوبی انہیں اپنے عہد کے دیگر شعراء سے منفرد و ممتاز کرتی ہے۔

لہذا عقیل شاداب کی غزل گوئی زندگی کی کامیاب جدہ جہد کا عکس اس لئے نظر آتی ہے کیوں کہ وہ مسلسل جاری رہنے کے باوجود کہنی بھی اپنی شکست کا اعتراف نہیں کرتے۔ بلکہ زخم پانا اور انہیں قرید کران سے مخلوط ہونا بھی ان کی فطرت مزاج اور اور عمل کا ایک ایسا نمونہ ہے جو کسی اور دوسرے شاعر کو خصوصاً کوٹھ کے ذکر میں حاصل نہیں ہے اور ان کا یہ مزاج صرف ان کی شاعری ہی نہیں بلکہ مجموعی طور پر ان کی پوری زندگی میں شامل رہا۔ کیسی بھی نئی چیز کے لئے وہ اپنے طرزِ عمل کو ہمیشہ تیار کھتے تھے اور اسے حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ نئے پن کی یہ چاہ شاداب صاحب کے جینے کا انداز تھا اور ایسے تجربات ان کے لئے زندگی کا حامل بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں آکر کوئی بھی اس نئے پن کو سحد تک جی سکتا ہے یہ تو اس کے حالات و توقات پر مخصوص ہے۔ ساتھ ہی ساتھ نئے پن کے نظر یہ پر بھی شاداب صاحب ان شاعروں کو پڑھتے تھے ان میں بڑا واضح اور قابل ذکر نام ظفر اقبال کا ہے۔ جن کا پرائے اظہار، خیال اور شعری تصور واقعی اپنے عہد کے تمام شعراء سے منفرد ہے ہر چیز میں شاعری ہی کی طرح جدت کی تلاش نے انہیں زندگی کو اس حد تک سمجھنے کے لاائق بنادیا تھا کہ باقی اور لوگ بھی کبھی کبھی انہیں سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔ اور بعض دفع تو بڑی الجھن ہوتی غلط فہمیوں کا شکار بھی ہو جاتے تھے۔ یہ صانع صرف عقیل شاداب کے ساتھ ہی نہیں گزر ا بلکہ ہر اس مفکر اور فکار کا ہم سفر رہا ہے۔ جس نے زندگی کو تلاش و ہستجو کی نظر سے دیکھا ہوا س کے لامحہ و دامکنات پے یقین کیا ہوا اور بر سر سفر رہا ہو۔

شروعاتی طور پر شاداب بھی ایسے شعر کہتے تھے جو با آسانی سمجھ میں بھی آجائے تھے اور معنویت کے اعتبار سے شعری تہہ داری سے محروم ہوتے تھے۔ لیکن ان کے عیقق مطالعہ نے انہیں آگے چل ایسا کرنے سے روکا اور وہ خود بے خود اس یکسانیت سے باہر نکلنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے اور یہ سمجھ گئے کہ اچھی شاعری نہ صرف پچی ہوتی ہے بلکہ معنی خیز بھی۔ اس طرزِ عمل نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنا نام ان شاعروں کی صفت سے نکال لے جو بات کرتے وقت اپنے قاری اور سامع کی تفہیم کو پیش نظر رکھ کر شعر کہتے ہیں اس کی جگہ انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کی اپنی شخصیت بھر پور ہے اور صرف اس کا اظہار انہیں شاعر کے وسیلے سے نہ صرف تمام دنیا سے متعارف کروائے گا بلکہ ان کی شعری شاخت بھی قائم کر دے گا۔

ایک جگہ کہتے ہیں:

ابنِ آدم کے ہر ایک جرم کے پیچھے اکثر

داستان ہوئی ہے گندوم کے کسی دانے کے

الہذا مندرجہ بالا شعر کے اعتبار سے شاداب صاحب اپنی قومی شناخت کے تعلق سے فرمار ہے ہیں کہ دراصل میں جرم کی وجہ بھی وہی ہے جو دنیا کی پیدائش کا سبب ہے۔ یہاں شاعر نے اپنی داخلی کیفیات کی حفاظت کرتے ہوئے بھی خارجیت کی بقا کو محفوظ رکھا ہے اور بڑے متوزن رویے کے ساتھ مکمل زندگی کا تعارف کروادیا ہے اور ایک اچھا شاعر کبھی بھی پوری زندگی کسی ایک ہی تاثر کے زیر اثر جینے کا عادی نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی بالغ سمجھ اسے یہ سبق بہت جلدی سمجھا دیتی ہے کہ زندگی کی ہمہ زندگی ہی اس کا اصل وجود ہے اور اس کے قامِ رہنے کا کامیاب اور خوشحال رہنے اور اپنے آپ کو ثابت کرنے کے لئے اس کے یہاں کائنات کا مکمل اجمالیاتی شعور ہونا بے حد لازمی ہے جب یہ کیفیت خیال کی بنیاد بن جاتی ہے تو شاعر زندگی لکھتا ہی نہیں بلکہ اُسے بہتر طور پر جیتا اور سمجھتا بھی ہے۔ اور اس کے یہاں اس اعتماد سے ایک تسری قوت بیدار ہو جاتی ہے جو اسے بڑی زندہ دلی کے ساتھ اپنے عمل کا مردے میدان بنادیتی ہے۔ اور وہ اپنے اس سفر کو بڑی کامیابی سے طے کرتا ہوا چلا جاتا ہے کیوں کہ اس کا اعتماد دنیا پر مکمل ہوتا ہے اور وہ یونیورسل Universal Acceptance عالمی قبولیت حاصل کر لیتا ہے۔

الہذا ایسے فنکار کے لئے بات کرنا کسی بھی فن کے حوالے سے بہت آسان ہوتا ہے خصوصاً شاعری تو ایک ایسا شعبہ ہے کہ اس کے وسیلے سے جوبات کی جاتی ہے اس کا اثر کسی دوسرے طریقے سے کی گئی بات کے مقابلے میں بہت بہتر اور کارگر ثابت ہوتا ہے کیونکہ الفاظ سے شاعر کی واقفیت ان سے کام لینے کا سلیقہ اس طرزِ عمل کو آسان بنادیتا ہے اور وہ اتنے مؤثر انداز سے اپنی بات کہہ پاتا ہے کہ قبولیت حاصل ہو کر ریتی ہے۔

الہذا اس فن میں عقیل شاداب بھی ماہر ہے بلکہ خیالی اعتبار سے بھی وہ اپنا وجود جا بجا مستحکم ثابت کر دیتے ہیں ایک جگہ کہتے ہیں:

اوڑھے ہوئے الفاظ معنی کے لبادے

صدیوں سے انہیں بند کتابوں میں پڑا ہوں

مندرجہ بالا شعر ادبی شکست کا شعر نہیں بلکہ ادبی استحکام کا شعر ہے اور بڑی معنویت کا حامل ہے جہاں شاعر اپنے تحریری امکانات کا باشعور طریقے سے نہ صرف اظہار کر رہا ہے بلکہ اکٹھاف مرحلوں سے بھی قاری کو مخطوط فرم رہا ہے اور اپنی ذات میں موجود بے قرار امکانات کی طرف اسے اشارہ کر رہا ہے جو سمجھنے والے کے لئے بے حد معنی خیز ہیں۔ کیونکہ شاعری کی تفہیم صرف شعر کو پڑھ لینے سے نہیں ہو جاتی بلکہ اس میں پوشیدہ تہذیبی

قرب کا تعرف اس شعر کو عظمت عطا کرتا ہے۔ ہندوستان میں رہ کر اردو زبان کا ایک شاہکار شاعر اگر اس طرح بات نہ کرے تو کیا کرے کیونکہ جو عہد شاداب نے جیا اور اسے جس حد تک سمجھا اس میں کئی ایسے پہلو انسانی اعتبار سے ان سلچھے رہ جاتے ہیں جنہیں وقت رہتے ہوئے سلچھ جانا چاہیے۔ مگر ہمارا تہذیبی تصادم جب انہیں سلچھانے کی بجائے اور زیادہ الجھادیتا ہے تو شاعر کو کہنا، ہی پڑھتا ہے کہ یہ کارے خیر صرف اس کی ذات سے وابستہ نہیں ہے بلکہ اس کی تلاش و جستجو اس کے پورے انسانی معاشرے کو حیران و پریشان کر رہی ہے۔ لہذا تفہیم کے پہلو تک پہنچنا، ہی اس کا واحد علاج ہے۔

شاعری کے لئے جملہ بڑا مقبول ہے۔

”شاعری جزو سی پیغمبری“

شاعری تقریباً الہام و پیغمبری جیسا ہی عمل ہے کیونکہ بے انتہا حساس ہونے کے سبب شاعر اپنے معاشرے کے تمام انسانی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد جب کہی بات کو قلم کی زبان سے ادا کرتا ہے تو یا تو وہ ہمارے انسانی معاشرے کا کوئی اہم مسئلہ ہوتا ہے یا زندگی جینے کا بہتر طریقہ۔ شاداب صاحب کہیں کہیں اپنی شخصیت کے اعتبار سے زندگی کے منفی پہلوؤں کا اظہار بھی اسی فنی چاکدستی س کرتے ہیں کہ ایسا لگنے ہی نہیں پاتا کہ وہ اس انسانی اصول کے خلاف ہیں۔ لیکن ایک پیش و پیش وجود میں آتی ہے اور سوال بن کر مسئلہ کا جواب دے جاتی ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں:

روایتوں سے گریزاں رہے، جیسے جب تک
گلاب زاروں میں تہبا بول بن کر رہے

یہاں دراصل شاعر کو کسی تہذیبی عمل سے اختلاف یا انکار نہیں بلکہ اس کی اصلاحی کوشش کے پیش نظر ایسا خیال وجود میں آیا۔ ذاتی طور پر عقیل شاداب کا مزاج زخم پر مرحم رکھنے کے بجائے عمل جزا حی کے ذریعہ اسے صاف کرنے سے تعلق رکھتا ہے لہذا اس خیال کے پیش نظر ان کا یہ سخت رویہ اس شعر کے اظہار کا وسیلہ بن گیا ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ عقیدہ بجائے یقین کے اختلاف سے حاصل کیا جائے۔

حالانکہ ان کا یہ شعری طرز عمل کسی کی نظر میں قابل اعتراض بھی ہو سکتا ہے لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے وہ بڑے تیز رفتار اور بے باک شاعر ہیں اس لئے اپنے من کی بات کہنے سے نہیں چوکتے اب چاہے معنوی اعتبار سے کسی اور کے لئے قبل اعتبار ہو یا نہیں۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو۔

سچ کو سچ کہنے کی عادت نے کیا ہے رسوا
میں تو لے دے کے یہی ایک ہنر کرتا ہوں

تلخ استعمال کرنا شاداب صاحب کی زیادہ تر شاعری کا اہم حصہ ہے کیونکہ انہیں پھول کی پتی سے ہیرے کا جگہ کاٹنا نہیں آتا بلکہ وہ فردناداں سے ایسی سخت زبان میں بات کرتے ہیں جو اس کی سمجھ کے لئے کافی ثابت ہو۔ لہذا شاداب صاحب کا طرزِ عمل شعری اعتبار سے اپنے رویوں کو تبدیل تو کرتا ہے لیکن ان کا عام لب والہجہ کل ملا کر جارہا ہے یہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے شعر میں جب بھی کلام کرتے ہیں تو شدتِ احساس اور شدتِ بیان ان کی مخصوص خوبی ہے اور وہ اپنی بات ایسی سخت زبان میں کہتے ہیں جو پڑھنے اور سننے والے کے لئے کبھی کبھی تو ایک حکم سی محسوس ہوتی ہے اور یہ ان کا مزاج بھی ہے کہ طرزِ بیان کے معاملے میں وہ نازک خیالی کو پسند نہیں کرتے بلکہ اپنے قاری سے شدتِ بیان سے گفتگو کرتے ہیں ان کا یہ لب والہجہ انہیں زبان کے اعتبار سے الگ انقلابی شاعر بنادیتا ہے۔

شاداب صاحب اپنے معاشرے کے نظام سے مکمل طور پر اپنی شاعری میں خوش نہیں لگتے بلکہ وہ اس نظامِ حیات پر کبھی کبھی بڑے کرارے حملے کرتے ہیں اور اسے ثبت انداز سے تبدیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں لیکن یہ رویہ ان کی پوری شاعری میں کارگر نظر نہیں آتا کہیں اور کبھی کبھی تو انہیں بھی اپنے قاری سے نرم و نازک لہجہ میں بات کہنے پر مجبور ہونا ہی پڑتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں۔

وقت کی دھوپ کو لفظوں کی ردا پہنما کر
شارخ بے برگ کو چھتنا رشجر کرتا ہے

یہاں نازک خیال کا انداز بھی ایسے ٹھیل انداز میں ہوا ہے کہ اس نزاکت تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ سخن فہم ہی ان معنی تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں لہذا شاداب صاحب لب والہجہ کے اعتبار سے بڑے پڑ اعتماد اور سخت کلام شاعر ہیں یہ ان کی طرزِ ادا کا تنقیدی پہلو بھی ہو سکتا ہے لیکن شاعروں میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کچھ نے زندگی جی بھی اپنے انداز سے اور شاعری بھی اسی فطری انداز سے کی جو انہیں بخی طور پر پسند رہا ہوا پنے اس رویے کو انہوں نے تبدیل نہیں کیا جکہ اردو ادب کی تاریخ میں کئی ایسے شاعر ہے جنہوں نے حسب ضرورت اپنے لب والہجہ زبان اور خیال کو تبدیل کیا ہے۔ شاداب صاحب کے یہاں طرزِ ادا کی یہ تبدیلی بہت کم نظر آتی ہے وہ زیادہ تر اپنے ہی انداز سے بات کرنے کے عادی ہیں یعنی کہ ان کی شاعری بہ حیثیتِ مجموعی خطاب کے دائرے تک نہیں پہنچ پاتی بلکہ صرف ان کا طرزِ بیان ہی ان پر اور ان کے کلام پر حاوی رہتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں یہ شدت

پسندی پڑھنے اور سمجھنے والے کے لئے باعثِ وقت بھی ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

اپنی نظروں سے مجھے دور کبھی مت رکھنا

گر محبت نہیں رکھتا ہے تو نفرت رکھنا

جب بھی ماضی کے اجالوں سے گزر رہتا ہے

یاد آتا ہے کتابوں میں تیراخٹ رکھنا

یہاں شاداب صاحب طرز ادا اور موضوع کے اعتبار سے رومانی شاعر محسوس ہونے لگتے ہیں لیکن یہ دراصل ان کی ابتدائی شاعری کا حصہ ہے۔ پوری شعری شخصیت کا عکاس نہیں لیکن یقیناً وہ یہ احساس کرواتے ہیں کہ ان کے ماضی سے ان کا لگاؤ بڑا گہرا ہے اور کسی کو بھی وہ اپنی زندگی میں بے تعلق کرنے کے کبھی بھی عادی نہیں بلکہ ایک عام انسان کی طرح اپنا نیت کا وہ لافائی جذبہ ان کی شاعری میں روای دواں ہے جو زندگی سے صرف جڑا و کی بات کرتا ہے۔ اور یہی خوبی ہر لمحہ عقیل کی ندرت بیان اور تزرت خیال کی حفاظت بھی کرتی رہتی ہے۔

”عشق میں جو وحشت ہوتی ہے اس کے اثرات عاشقی کے باطنی زندگی

اور اس کے خارجی زندگی دونوں پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس عشق میں جو

قلندری، آنا پرسی یا پھر آہ و فغاں یا اضطراب کے عوامل عناصر ملتے ہیں وہ

بھی دامنِ دل کھینچتے ہیں۔“ ॥

شاداب صاحب کی شعری سفر علی گڑھ سے شروع ہوا اور کوٹہ پہنچتے پہنچتے اختتام تک پہنچا لیکن ان کی مقبولیت کسی شہر یا کسی جگہ سے منصب نہیں کی جاسکتی ان کی شاعری ہر جگہ کائنات کا احاطہ کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور ان کا طرزِ فکر الفاظ کے انتخاب اور خیال کے اعتبار سے واقعی منفرد و ممتاز ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

جب بھی یاد آتی ہے ماضی ترے افسانے کی

ذہن بن جاتا ہے دل دل کسی ویرانے کی

یہ شعر شاداب کی زندگی کے اس ماضی کا ذکر کرتا ہے جو بڑا مشکل اور ناگوار رہا ہو کیونکہ ابتدائی زندگی موصوف کی بڑی پریشانیوں اُبھنوں میں گزری ہے اس کے پیش نظر انہوں نے اپنے ماضی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے اور آگے بڑھ کر تو پھر عقیل شاداب نے اپنی غزل کے ذریعہ اپنے حال اور مستقبل کے اسے بہترین خاکے پیش کئے جو نہ صرف زندگی کے سمجھنے سمجھانے کے عمل کو کامیاب کرتے ہیں بلکہ اس کی تفہیم کا بھی کارگرو سیلہ ثابت

ہوتے ہیں۔ شاداب صاحب کی غزل گوئی کو ان کے تمام نکات کی روشنی میں ہم روایتی کہہ سکتے ہیں۔ نہ ترقی پسند نہ جدید بلکہ مکمل زندگی کی شاعر کہہ سکتے ہیں۔

عقلیل شاداب نے اردو غزل کے روایتی موضوعات کو نئے انداز سے پیش کیا۔ حسن و عشق، ہجرو وصال، گل و بلبل، خزاں و بہار، حرم و دریر، شیخ و برہمن وغیرہ نفاست اور تازگی کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھال دیئے۔ غزل کا فن بڑا نا扎ک فن ہے اس کو برتنے میں کافی اختیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی لغزش غزل کی نزاکت کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ عقلیل شاداب نے غزل کی اس نزاکت کا احساس رکھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

انگنت جلوے ہیں منظر ایک ہے

پیر ہن لاکھوں ہیں پیکر ایک ہے

عشق میں اپنی یہ حالت ہو گئی

اس کا جا کہنا بھی "آ" لگنے لگا

عقلیل شاداب کسی ادبی تحریک سے وابستہ نہیں رہے۔ اس لئے ان کے کلام میں نہ تو قدامت پسندی ہے اور ترقی پسندی کا رجحان بلکہ کلاسکی مزاج کے باوجود ایک طرح کی تازگی موجود ہے۔ فنی اقدار اور شاعرانہ رکھرکھاؤ ہے۔ زندگی کا شعور، محبت کا نور، عصری مسائل کا احساس، حسن کی شوختیاں، وصال کی سرمیتیاں دلکش انداز میں موجود ہیں۔ روایتی مضامین کو عصرِ حاضر سے ہم آہنگ کا ہنر ان کے اسلوب کی شاخت ہے۔

آج کا دور بڑا افراتفری کا دور ہے۔ مغربی تہذیب نے مشرقی تہذیب بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ رشتے پامال ہو رہے ہیں، انسان خود غرض اور مطلب پرست ہو گیا ہے، انسان جن حالات سے دوچار ہو رہا ہے اس کی تصویر کشی عقلیل شاداب نے بڑے سلیقے سے کی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہو۔

یہ کیسا شور بربپا ہے میرے آنکن میں

یہ لوگ بیچ میں دیوار اٹھاتے کیوں ہیں

ہر طرف ہے بارش سنگ ہوس

اور میرے دوش پر سر ایک ہے

جن میں رشتؤں کی دھوپ چھاؤں نہ ہو

ایسے گھر، گھر نہیں ہوا کرنے

عقلیل شاداب کی غزلوں میں جدید اور قدیم رنگ حقیقت میں رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ تجربات اور

مشاهدات کا تاثر قاری کے دل کو ان کی طرف کھینچ لیتا ہے۔ سادگی اور سلاست ان کا طرہ امتیاز ہے۔ اشعار بظاہر سادہ ہوتے ہیں لیکن غور کیجئے تو معنویت سے پڑھتے ہیں۔ اس لئے ان کے اشعار دل کو لگتے ہیں اور حقیقت بھی ہے کہ دل سے نکلی ہوئی بات اثر رکھتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے

وہ شخص جو کہ میرے دوستوں میں تھا شاید

وہی غنیم کی گلی صفوں میں تھا شاید

ماننا پچھڑنا، کھونا پانا، دُکھ اور سُکھ

�یون کے سب تانے بنے لگتے ہیں

عقلی شاداب کی غزلوں کا اسلوب سادہ سلیس اور شستہ ہے۔ ثقلت سے پاک لیکن گھری معنویت سے لبریز ہے۔ غزلیں چھوٹی بھروں میں ہوتے ہوئے موسیقی کی خوبی سے مالا مال ہیں اور زبان و بیان کی تازگی کا احساس کرتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار دیکھئے

ظرف رکھتے ہیں جو سمندر کا

حد سے باہر نہیں ہوا کرتے

ڈوبنے کا جنمیں شعور نہیں

وہ شناور نہیں ہوا کرتے

پاؤں روکونہ دھوپ کے ڈر سے

راستے میں شجر میں گے بہت

کھارے سا گر میں ڈوب جاتی ہیں

میٹھے پانی کی ندیاں کلتی

عقلی شاداب کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی غزلیں قاری اور سامع کی سماught دیتی ہیں۔ لطیف احساسات، گرم جذبات اور سادہ زبان و بیان دل کو مومہ لیتا ہے۔ عقلی شاداب نے غزل کے مزاج سمجھا اور پرکھا ہے۔ اور پھر اپنی غزلوں میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں زندگی کے خوشگوار اور ناخوشگوار حیات سنائی اور دکھائی دیتے ہیں۔ ماضی کی یادیں اور مستقبل کی آہیں بھی دستک دیتی نظر آتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے عام انسان کی زندگی ان کی غزلوں میں سما گئی ہو۔ جو لاکن شناش ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہو۔

ماضی حال اور مستقبل میں بال برابر فرق نہیں

میں ہی اپنا تھا شاید میں ہوں اپنا بیٹا

تازہ کرتا رہتا ہوں ماضی کے پل

زنگ لگے برتن اجالتار رہتا ہوں

فُنی اعتبار سے عقیل شاداب کو اوسط درجہ کا شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن علاقائی ادب میں ان کا شمار باصلاحیت اور قابل شاعر کے روپ میں کیا جانا غلط نہ ہوگا۔ ہمارے ادب کے ٹھیکے دار چند اہم مرکز کے علاوہ دوسرے مرکز کے ادب کو نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔ اور آج بھی کرتے ہیں۔ ان چند اہم مرکز کے علاوہ کوئی اس شخصیت کا شمار بھی راجستھان کے اور خصوصاً کوئٹہ کے اردو ادب میں ایک انجمن سے کم نہیں۔ کوئٹہ کی سر زمین ادبی لحاظ سے شاداب صاحب کو ہمیشہ عزت و احترام سے یاد کرتی رہے گی۔ یہ کسی بھی شاعر کے لئے قبول عام کی سند ہے۔

عقیل شاداب کی شاعری ان کے نام کے مطابق ہمیشہ سر سبز اور شاداب رہی ہے۔ اور انشاء اللہ رہے گی۔

ختم شد

☆☆☆

حوالا جات

(باب-چہارم)

نمبر شمارہ				
۱.	نام کتاب رسالہ	مصنف مرتب	صفحہ نمبر سن اشاعت	ساغر نظمی: حیات اور کارنامے
۲.	دل کی دھڑکن	فاروق بخشی	۱۳۲ ۲۰۰۷ء	محسن عثمانی
۳.	کاظہار	نئی غزل میں رومانی حیثیت	۱۵۲ ۲۰۰۵ء	پروفیسر عنوان چشتی
۴.	اردو غزل (ہندو پاک سینما نار	کامل قریشی	۲۳ ۱۹۹۲ء	میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ
۵.	بے آب سمندر	عقلیل شاداب	۳۲ ۱۹۹۹ء	
۶.	بے آب سمندر	عقلیل شاداب	۶۳ ۱۹۹۹ء	
۷.	میور میگزین پی جی کالج کوٹھ		۱۳۹ ۲۰۱۰-۱۱ء	
۸.	تعارف و انتخاب کلام عقلیل	احتشام آخر	۲ ۱۹۹۳ء	شاداب (مونوگراف)
۹.	تعارف و انتخاب کلام عقلیل	احتشام آخر	۳ ۱۹۹۳ء	شاداب (مونوگراف)
۱۰.	بے آب سمندر (مضمون)	شاهد پٹھان	۲۹	
۱۱.	کتاب نما (رسالہ)		۲۰	

باب پنجم

عقل شاداب کی نظم نگاری

عقلیل شاداب کی نظم نگاری

نظم شاعری کی وہ شکل ہے جس میں کوئی قصہ کوئی واقعہ اور تجربہ یا کوئی خیال تسلسل کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں، کیونکہ نظم کے معنی ہی پرونسے اور یکجا کرنے کے ہیں۔ اس طرح نظم غزل کے بالکل برعکس ہوئی، البتہ ۱۸۵۰ء کے انقلاب کے بعد مغرب کے زیر اثر نظم کی طرف زیادہ توجہ ہوئی کیونکہ بے شمار ایسے تجربات تھے جو تسلسل پیان کا تقاضہ کرتے تھے۔ اردو میں نظم پہلے بھی موجود تھی مگر اسے پابند نظم کہنا چاہیے۔ یہ نظم غزل سے زیادہ مختلف نہیں تھی کیونکہ اس میں بحرا اور قافیہ کی پابندی لازم تھی۔ قصیدہ، مرثیہ، مشتوی، نظم ہی کی مختلف فرمیں ہیں۔ جناب روشن اختر کا قلمی نظم کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

”صفِ نظم آج کسی کی محتاج تعارف نہیں ہے۔ کیون کہ آج اردو کا ایک طالب علم بھی جانتا ہے کہ نظم ایک تسلیم شدہ صنف ہے۔ اس کی اپنی تعریف بھی ہے اور تاریخ بھی۔ نظم اجمال و تفصیل کا ایک خوبصورت امترانج ہے۔ حاصل نظم وہ کیفیت یا تاثیر ہوتا ہے جو نظم کا سبب تخلیق ہے، ہر نظم کا ایک مخصوص عنوان ہوتا ہے اور یہی اکثر موضوع نظم بھی ہوتا ہے۔ نظم کے تمام اشعار اس بنیادی موضوع سے وابستہ اور مر بوٹ ہوتے ہیں۔ یہ ربط تسلسل ارتقاء نظم کے ساتھ برقرار رہتا ہے اور اشارے کے ذریعہ ارتقاء خیال ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ نظم اپنے عروج تک پہنچ کر مکمل ہو جاتی ہے۔ نظم کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں نہ ہیئت کی۔ زندگی کا ہر منظر نظم کا موضوع بن سکتا ہے۔ کائنات کی ہر دھڑکن نظم کے قالب میں پیش کی جاسکتی ہے۔ اور یہ قالب یا پیر ہن کسی بھی شکل و صورت کا ہو سکتا ہے۔“ ۱

نظموں کے اعتبار سے عقیل شاداب بڑے موثر شاعر ہیں اور انہوں نے نظم کو بڑی وسعت عطا کی ہے۔ لہذا اگر غزلوں، نظموں کا موازنہ کیا جائے تو واقعی قاری اور سامع بڑے تذہب کا شکار ہو جاتا ہے کہ عقیل شاداب کو غزل کا شاعر کہا جائے یا نظم کا۔ یعنی یہ ہے کہ فی الحقیقت وہ نظم کے نمائندہ شاعر ہیں یا غزل کے کیوں کہ جہاں ان کی غزلوں کے اشعار ہمیں یاد رہ جاتے ہیں ٹھیک اسی طرح ان کی چند بہترین نظمیں بھی زبان پر بے ساختہ آجائی ہے۔ مثلاً ”آدمی نما“، ”ایک نیا اتہاس“، ”مان“، ”طahرہ“، ”غیرہ“ خاص طور قابل ذکر ہے۔ عقیل شاداب عہد ساز شاعر ہیں۔ زماں اور مکاں کی حدود سے آگے کے شاعر ہیں۔ انقلاب ان کا شیوه ہے اور یہ تیوران کی نظموں میں بھی بے حد نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ جہاں وہ اپنی بات کو مکمل یکسوئی سے اپنی قاری اور سامع تک پہنچاتے ہیں علاوہ ازیں دیگر نظموں میں وہ خردے نظر آتے ہیں اور اپنی بات اگر انہیں رومائی اور جنسی حمایت کے وسیلے سے کہنی پڑے تو یہاں بھی ان کی بے با کی بڑی موثر خوبصورتی کے ساتھ محفوظ رہتی ہے اور وہ اس اعتبار سے بھی خود کو مردمیاں ثابت کر دیتے ہیں۔

حالانکہ کہیں کہیں شدتِ احساس و جذبات کسی کسی کے لئے اعتراض کی حد تک واضح ہو جاتے ہیں۔ مگر شاید یہ انتشار بھی ان کی ایمانداری کا ہی ایک حصہ ہے کیونہ اکثر دورانِ گفتگو وہ فرمایا کرتے تھے کہ ان کے مزاج میں Selection Rejection کی جدوجہد شامل نہیں وہ زندگی کو اس کے مکمل بہاؤ کے ساتھ جینے کے عادی ہیں لہذا اس انصاف کو انہوں نے اپنے پڑھنے سننے اور محسوس کرنے والوں پر چھوڑ دیا ہے۔

بقول ان کے صاحبزادے فرخ ندیم کے ”عقیل شاداب“ کسی بھی ادبی شخصیت کو معلیٰ یا Reformer بھی نہیں مانتے تھے بلکہ یہ کہا کرتے تھے۔ کہ ایک اچھا فنا کار جن جن تجربات یا کیفیات سے مسلسل دوچار ہوتا ہے وہ اُسے مکمل تخلیقی سچائی کے ساتھ اپنے فن میں اجاگر کرتا رہتا ہے اور دراصل یہی عمل اس کے زندہ رہنے کی بنیاد بھی ہوتا ہے۔

لہذا یہاں عقیل شاداب غیر جذباتی بھی محسوس ہوتے ہیں کیوں کہ اپنی بات کو کہتے وقت وہ قاری یا سامع کے ذوق کا خیال نہیں رکھتے بلکہ آپ بیتی کو جگ بیتی بنادیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسی سوچ نہ رکھنے والے لوگوں کو ان پر اعتراض ہو جائے لیکن کوئی بھی شخص جس کام کے لئے دنیا میں آتا ہے وہ دراصل بہ ذاتِ خود وہ صرف اپنے ہی ذریعہ نہیں کرتا بلکہ کبھی کبھی اُسے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ کام اس سے لیا جا رہا ہے اور اُسے کرنے ہی میں اس کا وجود محفوظ ہے ورنہ غیر محفوظ۔

لہذا عقیل شاداب کے ساتھ مکمل انصاف کا عمل تو چلتا ہی رہے گا لیکن پہلی نظر میں ان کی یہ بے با کی اور

بہادری ایک وسیع القلب پڑھنے سننے اور دیکھنے والے کے لئے قابل تحسین ہے۔

ادب دراصل ایک ایسا شعبہ ہے جو دوسرے شعبہ ذات زندگی کے مقابلے میں اپنی بات زیادہ بہادری، بے باکی اور بے خوف کہتا ہے۔ لہذا اگر کوئی ادب کے معنی سمجھتا ہے اور اسے سمجھ کے پڑھتا ہے تو اجتنا اور الورا کی گواہی سے لے کر ہماری اردو شاعری تک تمام کچھ بے حد واضح اور سچائی پر مبنی ہے۔ اس لئے نظم کے اعتبار سے عقیل شاداب شاید غزل سے بہتر شاعر کہے جاسکتے ہیں کیونکہ نظموں میں ان کا کھلا پن ان کی ذاتی شخصیت معرف کرتا ہے۔ یہاں شاعر پرده پوشی سے کام نہ لے کروضاحت اور Confession کی صورت میں زیادہ موثر اور ایماندار نظر آتا ہے۔ نظم کی تاریخ یوں توبات کو نظم میں ادا کرنے کے اسلوب سے ہی شروع ہو جاتی ہے اور نظم لفظ کے معنی ہی بات کو بنا نظر کے کہنا ہوتا ہے یعنی کسی بھی موضوع کو اس طرح لکھنا یا ادا کرنا کہ اس میں ایک خاص قسم کی غنایت موسیقت اور ربط تسلسل قائم رہے تحریر کا نظمیہ انداز کھلاتا ہے۔ لہذا نظم کی شروعات تو شاعری کی شروعات کے ساتھ ہی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ نظم کے تعریف میں نظم بھی آ جاتی ہے بلکہ غزل کے علاوہ اور کئی دیگر اصناف سخن بھی نظم کی تعریف میں ہی آتے ہیں۔ مثلاً غزل، مرثیہ، مثنوی، قصیدہ، روایی، مسمس، مسدس، آزاد نظم، معراج نظم، ہانگو، نثری نظم اور بھی کئی انگنت اصناف سخن نظم کا ہی حصہ ہیں۔ لہذا نظم ہر وہ صنف سخن ہے جو نثر میں نہ کہہ کر ایک الگ طریق اسلوب کے ساتھ ادا کی جاتی ہے لیکن نظم کو آگے چل کر آزاد نظم کے نام سے بھی پہچانا گیا ہے۔ کیوں کہ مندرجہ بالا موضوع کے اعتبار سے تو نظم کی شروعات تو قلی قطب شاہ سے ہی ہو جاتی ہے لیکن بقاہدگی کے ساتھ نظم کی تاریخ کا آغاز دراصل نئی نظم کے طور پر ہی ہوتا ہے اور یہ نظیراً کبر آبادی سے شروع ہوتی ہے اور آگے چل کر کئی ادوار کا سفر تیکری ہوئی مختلف روپوں میں یہ ہماری اردو کا ادبی سفرتیہ کرتی ہے۔

نظیراً کبر آبادی دراصل اردو نظم کا پہلا جدید شاعر ہے۔ یعنی اردو نظم کی تاریخ میں جدید اردو نظم کا آغاز ہی نظیر سے ہوتا ہے۔ کیونکہ نظیر نے عوامی سطح پر بڑی کامیاب اور مقبول نظموں کی بھی ہیں۔ مثلاً ”آدمی نامہ“، ”بنجرہ نامہ“، ”ہولی“، ”عید“، ”دیوالی“، ”غیرہ۔

نظیر کی زبان بھی عوامی اور موضوع بھی عوامی ہوتا تھا۔ وہ ایک ایسا شاعر تھا جو کسی بھی موضوع پر شعر کہہ سکتا تھا۔ وہ جس موضوع پر چاہتے لکھتے اور اس سلیج بھی ہوئی عوامی زبان میں شعر کہہتے تھے کہ ہر ایک کے لئے اسے سمجھنا اور اس سے محظوظ ہونا بہت آسان ہوتا تھا۔ لہذا صحیح معنوں میں نئی نظم کا آغاز نظیراً کبر آبادی سے ہی ہوتا ہے اس لئے انہیں عوامی شاعر کے خطاب سے بھی نوازہ گیا۔ حالانکہ اس زمانے میں جو شاعری ان کے علاوہ ہو رہی تھی اس میں بڑی ثقیل اردو استعمال کی جاتی تھی جو نظیر کی زبان سے Match نہیں ہوتی تھی۔ لہذا اس عہد کے زیادہ تر

شاعروں نے نظیراً کبراً بادی کی شاعری کو Reject کر دیا اس سطحی گھٹیا یا میانہ شاعری قرار دیا جبکہ آگے چل کر یہی طرزِ تحریرِ عوام کے لیے ہر دل عزیز ہوا اور پھر کوئی سوچاں سال بعد کے شعراء نے اس طرز کو اپنا کر مقبولیت حاصل کی۔

لہذا نظم کی ایک خوبی اور خصوصائی نظم کی ایک خوبی یہ بھی ہونی چاہیے کہ اس میں جو موضوع بیان کیا جائے وہ عوام کی زبان میں ہو، سلسلہ بجا ہوا ہو اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا ہو۔ نظیر کے بعد کافی عرصے تک اسی شاعری کا فقدان رہا کیوں کہ تقریباً کئی سو ڈبڑھ سو سال ہوان جیسا کوئی دوسرا شاعر وجود میں نہیں آیا۔ لہذا نظم کا سفر ایسا لگتا ہے کہ جیسے ختم سا ہو گیا تھا لیکن ان کے بعد درمیان میں کہیں اچانک قصیدہ گوا مرثیہ گو شاعر پیدا ہونے لگے اور وہ بھی نظم کے انداز میں شعر کہنے لگے جن میں میرا نیں، مرزاد بیر، استاذ ذوق، سودا وغیرہ کے نام تاریخی حساب سے قبل ذکر ہیں۔ انہوں نے بھی غزل کو چھوڑ کر نظم کے اسلوب میں، ہی شاعری کی اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور آگے پڑھتے ہیں تو اس تناظر میں ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان ترقی پسند تحریک وجود میں آتی ہے اس کے شاعروں نے تو نظم کے بلندی کو اعلیٰ ترین مقام عطا کر دیا۔ جس میں فیض احمد فیض، علی سردار جعفر، معین حسن جذبی، اختر العمان، جاثر اختر، کیفی عاظمی، مجاز، ساحر لودھیانوی وغیرہ شاعر قابل ذکر ہیں۔ ان شاعروں نے نظم کو ترقی پسندی کے خیال سے آشنا کیا اور اس موضوع کے تحت زیادہ تر شاعری کی۔ یہ ایسا سمجھتے تھے کہ زندگی کی جدوجہد کو مؤثر طریقے سے پیش کرنے کا واحد طریقہ اظہار نظم ہی ہے۔

لہذا اس دور میں نظموں کی بارش سی ہو گئی اور ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ درجے کی نظمیں لکھی گئی۔ یہ دور ہندوستانی اردو ادب میں تقریباً ۱۹۵۰ء تک کامیابی اور خوشحالی کی ساتھ قائم رہا اس کے بعد ۱۹۵۳ء سے جدید اردو شاعری کا آغاز ہوا اور ترقی پسند نظم جدید یا نئی نظم میں تبدیل ہو گئی اور نئی شاعری کا تعارف یہ ہے کہ اس میں فردِ واحد کے نہایا خانوکوتلاش کیا گیا اور یہ کوشش کی گئی کہ فرد سے سماج کی تعمیر کی جائے نہ کہ سماج سے فرد کی۔ ترقی پسند ادیب اس کے برعکس تھے لہذا جدید یا نئی شاعری کا نصب العین دراصل فرد واحد کے خیال حیالات جذبات کی حفاظت کرتا ہے۔ انہیں معنوں میں اس کے لکھنے والے تمام شعراء نے اس خیال کا اظہار کیا اور اس طرح ۱۹۵۳ء سے شروع ہونے والی جدید شاعری کے ممتاز ناموں میں ن۔م۔ راشد۔ ش۔ ک۔ نظام، شہریار، مصحفی اقبال توصیفی، غلام مصطفیٰ راءی مخور سعیدی، اختشام اختر، ظفر غوری، عقلی شاداب، سید مہدی، سرتاج رحمانی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نئی شاعری دراصل انسان کی ذاتی محرومی کی تلاش سے مسلک ہے لہذا اس کا رشتہ کبھی اپنی پیاس سے بہت

گہرا ہوتا ہے تو بھی اس کی سیرابی ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ علاوہ ان شاعروں کی ایک منفرد خوبی یہ بھی ہے کہ اپنی بات کو کہنے کے حساب سے بڑی بولڈ Bold ہیں اور جو بھی جذبہ انہیں چھوٹا ہے یا محسوس ہوتا ہے یہ تقریباً اس انداز سے اس کا بیان اتنے سہل طریقے سے کرتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والا بھی کبھی یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ بات میں بھی اس طرح لکھ سکتا تھا اور بعض جگہ ان کا زندگی اور اپنے اظہار کے حساب سے اتنا مشکل بنادیتا ہے کہ اصل مفہوم تک پہنچنا قاری کے لئے ناممکن سا ہو جاتا ہے۔

لہذا یہاں یہ بات قابل ذکر ہے جدید شاعری موضوع اور اظہار دونوں کے حساب سے جتنی آسان ہے اتنی ہی مشکل بھی ہے اور کہیں کہیں تو یہ اس طرح چھپٹاتی ہے کہ خواہش کے اعتبار سے بڑی اجنبی محسوس ہوتی ہے اور اس کی یہ تہائی اور یہ محرومی شدتِ احساس کے سب تلاش مرغ میں کھو جاتی ہے لہذا یہاں عقیل شاداب کی شاعری کو تخلیقی نطقوں سے دیکھا جائے۔ لہذا ان کی شاعری میں ابتدائی دور میں جدید شاعری کے اثرات موجود تھے۔

چوں کہ انہوں نے آزادانہ فطرت پائی تھی اور کسی کو بھی اپنے اوپر مسلط کرنا یا مسلط ہونا انہیں پسند نہیں تھا لہذا جلدی ہی اس تحریری عمل سے انہوں نے پچھا چھڑا لیا۔ اور بعد کی نظموں میں زندگی کو ہو بھو ویسے ہی لکھا جس طرح انہوں نے اسے لکھنا چاہا مثلاً علمتوں، اشاروں، تشوہوں، اشتعارات اور اضافتوں کا استعمال دھیرے دھیرے کم کرتے گئے اور بات کو اس واضح توازن کے ساتھ کہنے لگے کہ شاعری صرف شاعری محسوس ہونے لگی۔ ایسی ہی نظموں میں سے ایک نظم ہے۔

موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

مسکرانے کی تو انائی ملی

ماتر بھوئی تیرے کن کن سے ہمیں

ماں کی ممتا کی سی گہرائی ملی

ہم تیری آغوش کے پالے ہوئے

ہیں سرایا و جرمیں ڈھالے ہوئے

تونے ہم کو بارہا پر کھا ہے ماں

ہم نے کب تھک کو جایا ہے بھلا

ہم گدا ہیں بھیم کی ارجمن کا بان

اور ٹھوا۔ راڑاں، ظفر، ٹپو ہیں ہم

مندرجہ بالا نظم نہ صرف عقیل شاداب کی ندرت بیانی کا ثبوت دیتی ہے بلکہ ہمارے ملک کی روایتی پاسداری کی ضامن بھی ہے یہاں اس نظم کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد ان کی پیشانی پر کسی گروہ کا لیبل کس طرح اگا دیا جائے جب کہ وہ خاص طور سے اپنی نظموں کے حوالے سے بڑے آزاد منش اور سچے شاعر ہیں جس کے ذہن میں منظر ہوتا ہے، جذبہ ہوتا ہے، احساس ہوتا ہے۔ ساتھ میں قلم ہوتا ہے اور وہ اسے نظم کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح کہ جیسا وہ اُسے محسوس کرتے ہیں۔ ہاں کہیں نہ کہیں ان کے یہاں تبدیلی اور انقلاب دوسرے انسان جذبات کے مقابلے میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ دراصل سب سے زیادہ نزدیک تبدیلیوں کے ہی رہے ہیں۔ شاید اس وجہ سے ادب میں کہیں ان کی تفہیم جدید شاعر کے طور پر قبول کر لی گئی ہو لیکن دراصل وہ جدت نہیں بلکہ ایسی شدتِ احساس ہے جو اپنے وقت کی تبدیلیوں سے عبارت ہے۔ مثلاً نظم ملاحظہ فرمائیں۔

نظم۔ نیا اتہاس

ایک نئی اتہاس کی بنیاد رکھنا ہے ہمیں
ضائقہ اپنے لہو کا آپ چکھنا ہے ہمیں
آویں جل کرنے فرمان ہم جاری کریں
اپنے ہاتھوں اپنے مستقبل کی تیاری کریں

ایک عالم آج ہم سے برسے پیکار ہے
ہر کنارہ اب ہمارے واسطے مجھدھار ہے
گالیوں کی بارش ہیں وینگ کی بوچھار ہے
کان اب تک آشنا ہیں کرشن کی آواز سے

لڑ رہے ہیں ہم مہا بھارت نئے انداز سے
دوستوں اب نوجوانوں کا زمانہ آگیا
سر پھروں کا اور دیوانوں کا زمانہ آگیا
انگلت ہندوستانیوں کا زمانہ آگیا

فرق مت جائے گا ہر انسان کا انسان سے
اک نیا سورج اگے گا خاکے ہندوستان سے

شاداب صاحب کے یہاں سورج کا اشتھارہ بڑی شدت سے استعمال ہوا ہے اور شاید اسی سورج کو اپنا

کروہ برس رے عمل بھی رہ سکتے ہیں کیوں کہ چاند سے ان کا رشتہ اور نسبت مقابلتاً کم ہے ہندی ڈکشن (Diction) ان کی شاعری کے وجود میں جگہ جگہ کار فرمائے اور شاید اسی لئے وہ اپنی اردو شاعری میں اس (Boldness) کو حاصل کر سکے جوار دو کی (Purity) کے ساتھ حاصل نہیں ہو پاتی اور ویسے بھی یہ بڑا فطری عمل ہے کہ فنکار کے یہاں اسباب صرف ذریعہ کا کام کرتے ہیں ان کا ذہن دراصل خیال پر مرکوز رہتا ہے اور خیال کے حساب سے اسے جو بھی اسباب بہتر لگتے ہیں وہ بڑی بہادری سے ان کا استعمال کرتا چلا جاتا ہے اور ایک بہترین فنکار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ عالمی سوچ رکھتا ہے لہذا اس کے یہاں جھجک بہت کم ہوتی ہے اور نئے نئے یا منفرد راستوں کا سفر یا انجان راستوں کا سفر، یہ وہ بڑے جانے پہچانے انداز سے طے کر لیتا ہے کہ وہ صرف متوقع زندگی جینے کا عادی نہیں ہوتا بلکہ ہر لمحہ غیر متوقع حالات کے لئے بھی خود کو تیار رکھتا ہے اور ان میں فتح یا ب رہتا ہے۔

شاداب صاحب بھی اردو نظم کے ایک ایسے ہی مجاہد ہیں جو جس بھی موضوع کو قلم بند کرتے ہیں وہ ان کی جڑتِ اظہار کی وجہ سے شاہکار ہو جاتا ہے مثلاً ان کی نظم (Nude) پڑھیں تو وہ صرف ایک عورت کی خوبصورتی پر منحصر لگتی ہے لیکن جس طرح شاداب اس کی خوبصورتی کا اظہار کرتے ہیں لگتا نہیں کہ ان کا نصب العین صرف نفرت پرستی ہے بلکہ وہ زندگی کے اس سچ سے ہمیں آشنا کرتے ہیں جیسے جنس کہا جاتا ہے۔ خود بھی جیتے ہیں اور قاری اور سامع کو بھی جینے پر آمادہ کرتے ہیں۔

”نظم نیوڈ“، ملاحظہ ہو:

تیری تصویریاں مصوّر نے
خون دل سے بنائی ہے شاید
رنگ و نور کا سراپا ہے
جس کو اک مگزین نے چھاپا ہے
زلفیں آ کاش پر کمندیں ہیں
باز و قوس و قضا کا جادو ہے
سینہ ہے یا کے دو پرندے ہیں
اپنے اڑنے کو پر جو تو لتے ہیں
ان کو دیکھو تو منہ سے بولتے ہیں
ناف ہے یا بھور ہے دریا کا

ڈوب جاتے ہیں جس میں دل والے

اور کمر میں رچاؤ ہے ایسا

رام کی تھا کمان میں جیسا

فیتوں کا یاک جوڑا ہے

اس نے جیتا نہ ہم کو چھوڑا ہے

دانوؤں نے سحر پھونک رکھا ہے

پنڈ لیاں ہیں کہ صاقِ سیکی ہیں

ایڑیاں کیسی جان لیوا ہیں

باغِ جنت کا جیسے میوا ہیں

جالِ نظروں کا ڈال رکھا ہے

پیر ہن بن گیا ہے شوقِ دید

عید کا چاند ہے سراپا تو

یہ تصوّر کی برق پاشی ہے

تیری تصویر ہے کہ کاشی ہے ۲

اس سفر کو طے کرنے کے بعد بھی وہ ایک مرحلہ اور طے کرتے ہیں جسے مقصدیت کہا جاتا ہے۔ اور وہ مرحلہ زندگی کی نظر سے نظر ملا کر بات کرنے کے حوصلے سے تعلق رکھتا ہے وہ کسی پر تھوپتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے بلکہ ایک دلش احساس کو خود جینے کے بعد دوسروں کو بھی اس دعوت میں با آسانی شامل کر لیتے ہیں۔ ابھی تک کئی نظم کے شاعروں میں ایسا جاں باز شاعر شاید ہی کوئی ہو جو اپنے اظہار کے واقع میں اس قدر ایماندار ہو۔ لہذا یہاں ایک بات یہ بھی با آسانی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ دنیا مختلف نو ہے اس کی جگہ تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ لہذا جنسی پہلو جو زندگی کی بنیاد ہے ایک قابل شاعر کے قلم سے تشنہ کیسے رہ سکتا ہے۔

عقل شاداب جیسا کہ غزلوں کے تناظر میں بھی عرض کیا جا چکا ہے زندگی کے شاعر ہیں لہذا جو بھی چیز جو بھی منظر جو بھی جذبہ جو بھی احساس انہیں اپنی طرف بلا تا ہے وہ وہاں پہنچتے ہیں بلند نگاہی سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور بہتر تجربے کے ساتھ اسے اپنی شعری زبان عطا کر دیتے ہیں وہ بڑے محبت کرنے والے بے باک ہیں بے

نکف ہیں۔ لہذا ان کی تفہیم بھی آسان ہے اپنے بنیادی خانگی رشتؤں سے بھی ان کا تعلق بہت گہرا ہے۔ خصوصاً ان کی احليٰ مختارہ طاہرہ بیگم سے ان کا جذبائی جڑاً کائنات کی ہرشے سے زیادہ ہے۔ ان کی نظموں میں ان کا ذکر ایک عبادت گاہ کے طور پر ہوا ہے ایسا لگتا ہے کہ طاہرہ بیگم سوچتی ہیں اور عقیل شاداب لکھتے ہیں اپنی نظموں کے مجموعہ کلام ”آدمی نما“ کی ترتیب اور انتخاب کی ذمہ داری بھی انہوں نے مختارہ طاہرہ بیگم کو دی کیوں کہ موصوف بے انتہا ذہین قابل اور شاداب صاحب سے بے انتہا محبت کرنے والی بیوی تھیں۔ لہذا شاداب صاحب نے انہیں بقول شاعر ایسے جیا۔

”عشق جب دونوں طرف ہو تو مزہ دیتا ہے“

ان کی ایک اہم نظم ”نیند“ پڑھنے سے محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ موصوفہ سے کیسی شدید محبت کرتے ہیں جہاں انہوں نے یہ واضح طور پر لکھ دیا ہے کہ طاہرہ بیگم کے رخصت ہونے کے بعد کی زندگی ان کے لئے تقریباً بوجھ ڈھونے جیسی ہے۔ یہاں شاداب صاحب ایک عظیم شاعر ہونے کا ثبوت فراہم نہیں کرتے بلکہ ایک ذہین انسان ہونے کی ذمہ داریاں بھی پوری کرتے ہیں اپنے تمام رشتؤں سے بڑی مظبوطی سے جڑے ہوئے رہے اور زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ کا سامنا جرأت سے کرتے رہے شاید ان کا ایماندار اور بنیادی جڑاً ہی انہیں آج ہمارے قلم کے تفہیم عطا کر رہا ہے کیوں کہ کام کبھی ضائع نہیں جاتا اگر کام صاف نیت اور ضروری محبت اور مشقت سے کیا جائے تو ہر حال میں کام آتا ہے قابل ذکر بھی رہتا ہے۔ اور عنطمتوں سے فیض یا ب ہوتا ہے۔ آئیے ان کی شاعری کا ایک اور رُخ ملاحظہ فرمائیں۔

ان کا بکھراً اور پھر سمٹ کر خود کو مرِ میدان ثابت کر دینا ان کی ”آدمی نما“ شاہکار نظم سے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں۔

کارنس کے ایک گوشے سے مسلسل

میرے اپنے دانت مجھ پر نہیں رہے ہیں

میری آنکھیں میز پر کھی ہوئی ہیں

اور مجھ کو تک رہی ہیں

کان میرے، میرے سر ہانے دھرے ہیں

اور مجھ کو سن رہے ہیں

ناک پہلے تھی کبھی چہرے کی زینت

اب نہیں ہے

جانے کتنی بارا ب تک کٹ چکلی ہے
بال میرے ایک کھوٹی پر ٹنگے ہیں
فارغ البابی پہ میری خندہ زن ہیں
ہاتھ میرے ایک کونے میں کھڑے ہیں
پانو بوسیدہ شکستہ اور تھکن سے چور
دروازے کی چوکھٹ پر پڑے ہیں
وقت اک دیوار سے چپکا ہوا ہے
اور بے رحمی سے گردش کر رہا ہے
رات کا پچھلا پھر ہے
میں کئی ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گیا ہوں
گویا میں اک آدمی سے
تخت زده بے جان کمرے بن چکا ہوں
روز مرہ کی طرح سے
صحیح سورج

سارے کل پر زے دوبارہ جوڑے گا
اور میرے نام کی تختی لگا کر
مجھ کو میرے گھر سے باہر چھوڑ دے گا ۳

اردو ادب کی تاریخ میں یہ نظم ایک اہم اضافہ کی جاسکتی ہے۔ شاداب کا مکمل نظموں مجموعہ کلام ایک طرف اور یہ اکیلی نظم ایک طرف ہے۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ شاداب کی بیگم صاحبہ محترمہ طاہرہ بیگم بھی ان کی تمام شاعری میں اس نظم کو سب سے زیادہ پسند فرماتی تھی۔ اور محترمہ بڑی اعلیٰ درجے کی سخن شناس تھیں۔ لہذا یہ بھی کہتی تھیں کہ شاداب کی غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظمیں زیادہ بہتر اور مؤثر ہیں۔ عقیل شاداب چونکہ نظم کے فن سے بخوبی واقف تھے اور نظم کی ارتقاء کا پورا اسفر بھی ان کے مطالعہ کی حدود

میں تھا۔ لہذا روایتی نظم سے لے کر ان کے عہد تک کی تمام تبدیلیوں کا انہیں مکمل علم تھا اس لئے وہ آزاد نظم، معرا، نظم اور نشری نظم میں بھی بہترین کہتے تھے۔ کیوں کہ زبان پر ان کی قدرت بھی بہترین تھی وہ جب جیسا چاہتے اس کا استعمال کرتے اور اپنے انطہار کو بڑی کامیابی سے اپنے قاری اور سامع تک پہنچادیتے۔ ان کی ایک نظم ”جنگل“ تو منظر کشی کے اعتبار سے حیرت میں ڈال دیتی ہے اور اس کا لامکس قابل تعریف ہے۔ نظم ”جنگل“ ملاحظہ ہو:

سارا جنگل مہک رہا تھا
ستائے بی سہمے سہمے
سارے پیڑ فنا کے ڈر سے ٹھر ٹھر کانپ رہے تھے
سارے پرندے اور درندے تھک کر ہانپ رہے تھے
چاندی رات میں کالی جشن چخ رہی تھی ایسے
چھوٹا سا بچہ کوئی آسیب دیکھ لے جیسے
پتے ایسے کھڑک رہے تھے چاپ ہو جیسے چڑیوں کی
مہک آرہی تھی بوس سے سڑنے والے کریلوں کی
چاند بھی اپنا چہرہ جھیل کے پانی میں تکتا تھا
ایسا بخارا تھا جو چلتے چلتے نہیں تھکتا تھا
ذرے ذرے پر جنگل کے بھوتوں کا ڈریا تھا
خوف سے ہر ایک پتے کا پیلا پیلا چہرہ تھا
ایک مسافر اس جنگل میں رستہ بھول گیا تھا
چلتے چلتے چلتے دم اس کا پھول گیا تھا ۲

شاداب کی مذکورہ نظم بھی اسی معیار پر کھڑی اترتی ہے اور ایک ایسا جنگل آباد کرتی ہے۔ جس پر یہ تمام آبادیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ بڑے اچھوتے مضامین ان کی نظم نے چھوئے ہیں مثلاً ”شاخت نامہ“، عقیل شاداب کی بڑی موثر نظم ہے اور ہمارے موجودہ سیاسی اور سماجی نظام کو بہتر طور پر سمجھاتی ہے۔
نظم ملاحظہ ہو:

شاخت نامہ

کوئی نہیں ہے اپنا شناسا
 جانے والا کوئی نہیں
 پہچانے والا کوئی نہیں ہے،
 شہرے ہوس میں تھا ہوں میں
 کوئی نہیں جو مجھے پکارے
 ساتھ میرے کچھ وقت گزارے
 تاکہ میری ناکام زندگی
 ایک نئے رستے پر رواں ہو
 آنکھوں میں منزل کا نشان ہو
 میں تو اپنے آپ میں شاید
 سر کاری پہچان پتھر ہوں
 کاغذ کا بے جان سا پڑ زہ
 جس کا مصرف
 صرف اتنا ہے
 کہ جب جب بھی
 ایکشن آئیں
 آئی کارڈ لے کر میں اپنا
 کسی بھی ایک
 امیدوار کو
 ووٹ دے سکوں
 گویا میں انسان نہیں ہوں
 آئی کارڈ ہوں
 ماترا ایک

پہچان پڑھوں
اک ووڑھوں ۵

موجودہ دور میں کاغذوں کا بڑھتا ہوا بوجھ اور آدمی کی ذہنی کشمکش کا اظہار اس نظم میں بڑی خوبی سے ہوا ہے۔ انہوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ موجودہ دور کا ہر بھارتی شہری ایک شاختی کارڈ بن چکا ہے۔ جس کا استعمال سیاست داں جب جس طرح چاہے اس طرح کرتے ہیں اس کا اپنا اصلی وجود کاغذوں کے بوجھ تلے یوں دب کر رہ گیا ہے کہ باہر تو صرف اس کی تھکان اور سکیوں کو ہی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس کے سماجی اور معاشراتی مسائل کا حل تو کہیں دکھائی ہی نہیں دیتا۔

لہذا بڑا ہی تیکھا جملہ شاداب صاحب نے موجودہ دور کے بھارتی کاغذی کاریہ وہی پر کیا ہے جہاں جمہوریت کا نام پر انسان کو فائدہ تو دور کی بات ہے نقصان بھی نہیں پہنچایا جاتا بلکہ اس کا وجود، ہی اس سے چھین لیا جاتا ہے۔ لہذا شاداب نے یہاں اپنی اس نظم میں سیاسی نظام بد نظری کا اظہار بڑی کامیابی سے کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ غیر ضروری اقدامات تل کا تاثر بنانے کے سوا کچھ نہیں جو کام چٹکیوں میں حل ہو سکتا ہے اسے صد یوں پہ چھوڑ دینا ہمارے سیاسی نظام کا ایک بڑا مرض ہے۔ جس سے وہ ابھی تک آزاد نہیں ہو سکا ہے۔ لہذا ایک حساس اور باشدور شاعر اس مسئلے کو اپنی نظم میں ایسے ادا کرتا ہے کہ قاری اور صامع اس خیال سے قائل ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے۔ عقیل شاداب کی اجلی سوچ ہی نہیں اپنی نظموں کے اعتبار سے اپنے عہد کے تمام شعراء میں منفرد و ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ قلم ہے کہ لکھتا چلا جاتا ہے۔ موضوع ہے کہ تنکیل حاصل کرتا رہتا ہے، سفر ہے کہ جاری رہتا ہے اور کبھی نہ رکھنے کا وعدہ کرتے ہوئے دنیا سے تو رخصت ہو جاتا ہے لیکن ہمارے زبان پر اپنی قابلیت کی ایسی مہر لگادیتا ہے جو ہمارے لئے ناقابل فراموش ہوتی ہے۔

عقیل شاداب تادم حیات کام کرتے رہے انکے قلم کا ان کی سانسوں سے رشتہ آخری لمب تک موجود رہا اور سچائی تو یہ ہے کہ ان کے جانے کے بعد بھی قائم ہے۔ ہم انکی ہر تحقیق و تفہیم کے سرچشمے تلاش بھی کر رہے ہیں اور ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی کرنے پر مجبور ہیں ان کی زندگی میں شاید انہیں نظم کے اعتبار سے اتنی جمایت حاصل نہ ہوئی ہو جتنی ان کے جانے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے ہر موضوع کو ان کی زندگی میں داخل کر شعر کی زبان عطا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اپنی پوتی انسان سے انہیں اپنی تیسری نسل میں سب سے زیادہ محبت تھی لہذا اس عنوان سے بھی انہوں نے نظم لکھی جس کا مفصل ذکر یوں ہے:

ان اپر لکھی گئی نظم بھی ان کی شاہکاظموں میں با آسانی شامل ہو جاتی ہے کیوں کہ اس نظم میں انہوں نے نہ صرف اپنی پوتی سے اظہارِ محبت ہے بلکہ بیٹیوں سے متعلق لڑکیوں سے متعلق اپنی ثابت سوچ کا اظہار بھی بے خوبی کیا ہے۔

بقول فرخ ندیم ان کے یہاں جب پوتیاں اللہ کی طرف سے عطا ہوئی تو انہوں نے فرمایا مجھے بیٹوں سے زیادہ بیٹیاں عزیز ہیں۔ مرے لئے باعثِ مسرت بھی ہیں اور باعثِ فخر بھی۔ لہذا اس تناظر میں اس نظم کا لکھا جانا بھی، میں ضروری سمجھتی ہوں۔

موجودہ دور کی حکومت نے ”بیٹی بچاؤ“ کا نعرہ دیا ہے۔ موجودہ دور لڑکیوں پر بڑا بھاری دور ہے۔ آج لڑکیاں کو کھل میں ہی ختم کر دی جاتی ہے۔ لڑکیوں کا وجود خطرے میں ہیں۔ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں لگاتار تعداد میں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ سماجی نظام بگڑ چکا ہے ایسے دور میں عقیل شاداب کی نظم ”انا“ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور لڑکیوں کے وجود کو ٹھنڈی چھاؤں میں جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔ نظم، ابتدا سے اختتام تک محبت اور شفقت کے جذبے سے لبریز ہے۔ سچے جذبات اور مہکتے احساسات کی آئینہ دار ہے۔ اور ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ بیٹی جو پھولوں کی خوبیوں ہے، پری ہے، حور ہے، شمر کی چھاؤں ہے، آنکھوں کا نور ہے۔ اس محبت کی شہزادی کو آج کا سماج کیوں دنیا میں آنے سے پہلے ختم کر رہا ہے۔ اور اس کے وجود کو لڑکوں کے برابر تسلیم کیوں نہیں کر رہا ہے۔ آخر کیوں! نظم ”انا“ اس کی بہترین مثال ہے:

میرے سینے میں نور پھیلا ہے
میرے آنکن میں خوشبو اتری ہے
چاندنی کا لباس پہنے ہوئے
حور کے روپ میں تو اتری ہے
اے میری ننھی سی پری انو
اے میری جان اے میری بیٹی
تجھ سے روشن ہے کائنات حیات
پھول کی خوبی نور کی پُتلی
تو نے بخشی ہے زندگی مجھ کو
تو محبت کی شہزادی ہے

جیسے پھولوں کا ایک گلدستہ ہے
 جیسے خوابوں کی ایک وادی ہے
 دیکھ کر تجھ کو سوچتا ہوں میں
 تو پردی ہے کہ حور ہے بیٹی
 میرے دل کا سرور ہے بیٹی
 میری آنکھوں کا نور ہے بیٹی
 تو میرے سینے میں دھڑکتی ہے
 میں تجھے دیکھ کر ہی جیتا ہوں
 میری ہر سانس تیرے دم سے ہے
 تجھ پر قربان تیرا دادا ہوں
 چھاؤں ٹھنڈی شجر گھنا ہے تو
 جان ہے تو مری آنا ہے تو ۶

نظم نہ صرف شاداب صاحب کے اپنی پوتی سے محبت کا اظہار کرتی ہے بلکہ تمام نسوی نسل سے بہتر گاؤ، بہتر امیدیں، بہتر مستقبل سے بھی آشنا کرتی ہے۔ جو ایک فکار ہوتے ہوئے بھی انسانی رشتہوں سے بڑا گاؤ رکھتے ہیں ورنہ کبھی کبھی فذکار کا طریقہ عمل اپنے گرد و پیش کی زندگی سے کٹ جاتا ہے اور وہ اپنے سماج سے الگاؤ کا شکار ہو جاتا ہے لیکن شاداب صاحب تو ایک بہتر شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہتر انسان بھی تھے۔

”آدمی نما“ میں شامل ان کی کئی نظمیں جنسیت کو اس حد تک چھوگئی ہیں کہ اس کی تفہیم ہمارے سماج کے لئے ادب کے روپ میں کتنی کمتر بہتر یا کارگر ہے یہ فیصلہ کوئی ذاتی طور پر مکمل تفہیم کے ساتھ نہیں کر سکتا یہ اپنا اپنا نظریہ زندگی کے بارے میں سوچنے کا اپنا اپنا انداز موجودہ وقت اور آنے والا زمانہ ہی طے کر پائے گا کہ ان کا یہ تخلیقی عمل کس حد تک صحیح ہے کیوں کہ ادب صدیوں سے لکھا جاتا رہا ہے۔ اور لکھا جاتا رہا ہے گا۔ لیکن پڑھنے سننے اور سمجھنے والوں نے اس کی تفہیم اور ترسیل کے پیانے کیا طے کئے ہیں یہ سلسلہ وار وقت ہی پر منحصر رہا ہے۔ لہذا اور زمانوں کی طرح ہم بھی اس زمانے میں اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انکی تمام شاعری کسی حد تک قابل تحسین ہے اور کس حد تک قابلِ رد۔ کیوں کہ ادب ہی ایک ایسا شعبہ ہے جو اس حساب سے کسی ایک عہد میں کبھی مکمل طور پر تکمیل حاصل

نہیں کر پاتا بلکہ عہد بے عہد اس کے ثابت و متفق پہلو ثابت ہوتے رہتے ہیں۔ اور معیار بدلتے رہتے ہیں ان کی ایک نظم ”نئی صحیح“، بھی ہمیں ان کے تمام تخلیقی عمل کو، ہتر طور پر سمجھنے کے لائق بناتی ہے یا زندگی کے سفر کو سمجھاتی ہے جہاں وہ لکھتے ہیں:

ماں کی لاج بچانے والے
بیٹے نینق
ہنسنے ہنسنے قربانی دی
اپنی جان پہ
کھیل گیا وہ
اس کے لہو سے
آج ہماری آزادی کے
رُخ پر لامی ہے
نئی صحیح
ہونے والی ہے کے

شاداب کی نظموں کا بغور مطالعہ کرنے پر ان کی نظموں میں جا بجا ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کا رنگ نظر آتا ہے۔ مثلاً ان کی نظم ”فرق“، ”سگ پرست“، ”کنوارہ بوسہ“، ”پازیب“، ”شناسمائی“، ”بدن کے رشتے“، ”ضرورت“، ”سمرپن“، وغیرہ۔ ایسی ہی نظموں میں ہیں۔
نظم ”فرق“، ”ملاحظہ ہو“:

ایک چڑے نے
اک چڑیا نے
ملنے کا وعدہ کیا
لیکن جب ملنے نہیں آیا
چڑیا نے کہا
آدمی تھا یا میرا چڑا تھا

ملنے کا کیوں وعدہ تھا
ایسی نہ ہوتی چڑھے کی فطرت
یہ تو ہے انسان کی عادت ۸

عقلی شاداب نے کئی استعاراتی نظمیں بھی کہی ہیں ان کی نئی استعاراتی نظم ”ریموت“ ہے جس میں عقلی شاداب نے نئے نئے استعارے استعمال کئے ہیں۔
نظم ”ریموت“ ملاحظہ ہوں

میری زندگی کا ریموت
تیرے ہاتھ میں ہے
جب تک تو میرے
ساتھ میں ہے
جب تو مجھے چھوڑ کر
چلی جائے گی
زندگی ریموت سے
عادی ہو جائے گی
سانس لینا بھی
بھاری ہو جائے گی ۹

اسی طرح ان کی نظم ”کیکلش“ ہے جس میں انہوں نے زندگی کے حقیقی رنگوں کو اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف پھولوں میں بلکہ کیکلش میں بھی زندگی کے رنگ دیکھ لئے ہیں۔ کیکلش جو ایک بد نما پودا ہوتا ہے لیکن عقلی شاداب نے اس بد نما پودے میں زندگی کا راز تلاش کر لیا ہے۔ نظم ”کیکلش“ ملاحظہ ہوں:

سب گلاب اگاتے ہیں
میں نے گھر کے آنگن میں
کیکلش اُگایا ہے

زندگی کا اصلی رُخ
 لوگوں کو دکھایا ہے
 یہ حیاتِ دوروزہ
 پھول ہی نہیں ہوتی
 خارزا رہستی بھی
 کارزا رہستی ہے
 جس قدر بلندی ہے
 اس قدر ہی پستی ہے ۱۵

زندگی کے حقیقی رنگوں کو ظاہر کرنے والے نظموں میں ان کی ایک طویل نظم "ڈھنڈ کا لباس" ہے۔ معمولی سے معمولی موضوع کے ذریعہ گھری اور دل کو چھو جانے والے احساس سے دوچار کرنا عقیل شاداب کی شاعری کی خوبی ہے۔ اس نظم میں انہوں نے زندگی کی حقیقت کو دل مودہ بننے والے انداز میں بیان کیا ہے۔
 نظم "ڈھنڈ کا لباس"، ملاحظہ فرمائیں:

ایک دن صحیح سوریے
 میں جا گا تو دیکھا
 ہر طرف کھرا چھایا ہوا ہے
 ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہیں دیتا ہے
 کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے
 میں حبِ معمول
 گھر سے نکل پڑا
 اور سیر کو چل دیا
 جب شہر سے باہر پہنچا
 تو دیکھا شجر، حجر اور جانور
 سب ڈھنڈ میں لپٹے ہوئے ہیں

پچھی دکھائی نہیں دے رہا ہے

بجز دُھند کے

نہ انسان اور نہ حیوان

راستہ بھی دُھند کا شکار تھا

میں حسپ معمول

جھیل کی طرف ہو لیا

پگڈندی بھی

دکھائی نہیں دے رہی تھی

بس انداز سے

میں جھیل تک پہنچ گیا

وہاں جا کر دیکھا کہ جھیل بھی

دُھند اوڑھے ہوئے سورہی ہے

میں نے اپنے کپڑے اُتارے

اور نہانے کے لئے

پانی میں اتر گیا

تخت پانی میں نہا کر جب باہر نکلا

تو مجھے میرے کپڑے نظر نہیں آئے

بہت ڈھونڈ اگر نہیں ملے

سب کچھ دُھند میں غرق تھا، کیا نظر آتا

میں نے سوچا میں بھی تو

دُھند میں لیٹا ہوا ہوں

کس کو کیا نظر آؤں گا

سوچا میں دھیرے دھیرے

گھر کی جانب چل پڑا
 شہر میں داخل ہوا تو
 وہ بھی کہرے میں لپٹا ہوا تھا
 کوئی شخص نظر نہیں آ رہا تھا
 میں خاموشی سے گھر کی جانب
 چلتا رہا
 دفعتاً شہر کے سب سے بڑے
 چورا ہے پر آگئیا
 کہ اچانک سورج
 نکل آیا
 اور ساری دُھن دھپٹ گئی
 اب میں تنہا
 برہنہ چورا ہے پر کھڑا تھا
 سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے
 اور مجھ پر نہ رہے تھے
 میں گھبرا کر اپنے گھر کی طرف بھاگا
 ایک جم غیر میرے پیچے پیچھے ہولیا
 جیسے تیسے میں گھر تک پہنچا
 اور دروازہ کھٹکھٹایا
 میر بیوی نے دروازہ کھولا
 اور مجھے حیرت سے تکنے لگی
 میں شرم کر اندر چلا گیا
 میرے ماں باپ بہن بھائی اور بچے
 مجھے تعجب سے گھور رہے تھے

ان کی نظروں میں کئی سوال تھے
 اور میں لا جواب کھڑا ہوا تھا
 اب میں جب بھی گھر سے
 باہر نکلتا ہوں تو
 لوگ مجھے روک روک کر
 پوچھتے ہیں کہ
 میرا دُھنڈ کا لباس
 کیا ہوا
 کیوں یہ فرسودہ
 روایتی لباس زیب تن کیا ہے
 میں سن کر چپ ہو جاتا ہوں
 اور سوچتا ہوں کہ کیوں نہ
 وہی دُھنڈ کا لباس پھر سے
 پہن لوں اور قدیم سے
 جدید ہو جاؤں
 سب سے الگ منفرد نظر آؤں
 بالکل نیا اور منفرد ॥

احتشام اختر نے اپنی کتاب اندازِ نظر میں عقیل شاداب کو جدید ادب و نظم نگاری میں شامل کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:
 'راجستان کی جدید شعری منظر نامے میں بہت جلد ابھر کر سامنے آنے والے
 شعرا میں عقیل شاداب کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔' ۱۲
 عقیل شاداب کی نظموں نے اپنے عہد کی تمام ہمواری ما یوسی اور تلخ حقائق موجود ہیں۔ مثال کے طور پر
 ان کی نظم "بے حسی" ملاحظہ ہو۔

دنیا والو !

کیوں میرے سینے میں خنجر گھونپ رہے ہو
سرد یوں کی نفرت کا ورثہ
کیوں تم مجھ کو سونپ رہے ہو ؟
بوڑھی دھرتی
میری رشتہ دار نہیں ہے
میں تو

ایک بے جان خلا ہوں
مجھے کسی سے پیار نہیں ہے !

اس نظم کی طرح ایسی کئی نظمیں ہیں جو قاری کے ذہن پر اپنے تاثرات چھوڑتی ہیں۔ اس سلسلے میں نظم بہ عنوان ”ایک نظم“ ملاحظہ فرمائیے۔

ایک دن ایک دوست کا میں کر رہا تھا انتظار
آپ کی جانب اٹھی نظریں دیوانہ وار
آرہی تھی آپ ہمراہ اپنی امی جان کے
اپنی چھوٹی بہن کے اور چھوٹے بھائی جان کے
چاند سے چھرے پہ زلفوں کا عجوب انداز تھا
ہر قدم یوں اٹھ رہا تھا جیسے ایک اعجاز تھا

عقلی شاداب نے مخصوص لب و لبھ کی مدد سے اپنی نظموں کو موثر بنادیا ہے۔ ان کی اسی طرح کی نظموں کی تعریف کرتے ہوئے حبیب الرحمن نیازی نے ایک مضمون میں لکھا ہے :

”عقلی شاداب جدید لب و لبھ کے منفرد شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں نے نادر تر اکیب تشبیہات اور علامتوں کے استعمال سے ایک نئی فضا پیدا کی ہے۔ ان کی نظموں میں زندگی کے مختلف تجربات کا اظہار ہوا ہے۔ شاداب کی نظموں پر میراجی کا اثر نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں نے جنسی کیفیات کو بڑی بے با کی سے پیش کیا گیا ہے۔“ ۳۲

عقلی شاداب کی نظموں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ہندی الفاظ کو بڑے موزوں اور موثر انداز میں استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ نظم ملاحظہ فرمائیں۔

خون کے دریا بہادو

تاکہ۔ دھرتی اپنی پیاسی آتما سیراب کر لے
آگ ہرشئے میں لگادو

تاکہ۔ یہ ٹھہری ہوئی دنیا حرات کے قحط سے مرنے جائے
عورتوں کو۔ عصموں کے بو جھ سے آزاد کر دو
بچوں، بُڑھوں اور جوانوں کو کچل دو
گویا جو کچھ بھی نظر آتا ہے سب بر باد کر دو
تاکہ۔ مرگ ناگہانی اس سستی زندگی کا انت کر دے
از ز میں کے۔ ہرگ وریشے میں مکر زہر بھر دو

مندرجہ بالا نظم میں انسانیت کو نوحہ، قومی تکھیتی اتحاد کا بیان بڑے درد انگیز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ عقلی شاداب نے زندگی کے جذباتی پہلوؤں کو بڑے خوبصورت انداز میں قلم کیا ہے۔

راجستانی اردو اکادمی کے سابق چیر مین انعام الحق صاحب نے انتخاب نظم کے پیش لفظ میں عقلی شاداب کی نظم نگاری کے بارے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ:
”عقلی شاداب کے یہاں حقیقت نگاری اپنی تلمیخوں کے ساتھ آشکار ہے۔“

ظاہر ہے اس میں مشاہدہ حقیقت آمیز یہی وجہ ان کے Straight expression کی ہے۔ جس سے شکفگی تو دور ہے لیکن ان کا تلخ حقائق پر Emphasis قابل تعریف ہے۔“^{۱۷} مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ عقلی شاداب نے اگرچہ غزل کے مقابلے میں نظموں کم کی ہیں تاہم ان کی نظموں نے جو رکھ رکھا اور قتنی دلکشی نظر آتی ہے وہ انہیں راجستان کے بعض نمائندہ نظم گوشے راء کے قریب لاتی ہے۔

عقلی شاداب نے کئی مختصر نظموں بھی کہی ہیں۔ اور چند الفاظ میں اپنی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی مختصر نظموں میں مثلاً ”زندگی کا سایہ“، ”ممتاز“، ”آزمائش“، ”گنہگار“، ”بندگی“، ”پہچان“، ”سوالی“، ”خاندار“، ”لامحالہ“، ”میں اور تو“، ”کانابائی“، ”سرمایہ“، ”الزام“،

”خلوت کدہ“، ”تازیانہ“، ”کرامت“، ”نام“، ”کلر بلاسند“، ”سرزنش“، ”ثبوت“، ”اسعیارہ“، ”رمیز کائنات“، ”نجات“، ”پیش و کم“، ”زندگی کاذائقہ“، ”ماجرہ“، ”بریک“، ”لغٹ“، ”شامت“، ”پھر“، ”جنگل کا قانون“، ”نیاروپ“ - ”ریموٹ“، تمہارے بنا، ”ٹوائے بم“، ”زندگی کا سایہ“، ”ایک بوند پانی“، ”احسان“، ”آلوجنا“، ”کھلونا“، ”ضروت“، ”جرم“، ”میٹھائی کاراپانی“، ”اللہ دین“، ”نائک“، ”عنی صحح“، ”جہانسی کی رانی“، ”عزت کی مدت“، ”نیا منظر“، ”راونجات“، ”سلسلہ“، ”غدار“، ”آزادی کی جنگ“، ”دہشت گردی“، ”دائرہ“، ”نقضان“، ”حادثہ“، ”سنگ باری“، ”انتظار“، ”رشته“، ”معمول“ وغیرہ قبل ذکر ہیں۔

تقریباً ہر شاعر اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں بڑا معمول ہوتا ہے۔ یہ مخصوصیت اس کی شاعری میں آہستہ آہستہ پختگی میں تبدیل ہوتی ہے۔ اور اس طرح شاعر میں فکری ملوغیت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کیفیتیں سمجھنے لگتا ہے۔ فکروں کو سمجھنے لگتا ہے یہی خوبی عقیل شاداب کی شاعری میں موجود ہے۔ غزل ہو یا نظم وہ ابتداء سے زیادہ آہستہ آہستہ باشعور ہوتے اور قاری کے دل و دماغ پر دستک دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں جمالیات اور احساسات خوبصورت رنگ کے ساتھ عہدِ حاضر کے انسانی کرب اور ذاتی معاملات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ اور یہ وہی شاعری ہوتی ہے۔ جس میں خالص انسانی جذبات موجود ہوتے ہیں۔ اور یہی شاعری تصنیع سے پاک ہوتی ہے۔ یہ دل کے جذبوں سے ابھرنے والی وہ آواز ہوتی ہے جس میں سچائی، محبت اور خلوص کی آمیزش ہوتی ہے۔ عقیل شاداب کا ادبی سفر زیادہ طویل نہ رہا۔ لیکن جتنا رہا اس میں منزل بہ منزل مشاہدہ اور مطالعہ بڑھتا رہا۔ اور کلام میں پختگی آتی رہی۔ غزوں کی طرح نظموں میں بھی یہی انداز نظر آتا ہے۔

ختم شد

☆☆☆

حوالاجات (باب-پنجم)

نمبر شمارہ	نام کتاب/رسالہ	مصنف/مرتب	صفحہ نمبر سن اشاعت
۱.	انتخاب نظم شعراۓ راجستان	روشن اختر کاظمی	۹۹۳ء
۲.	آدمی نما	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء ۱۶
۳.	آدمی نما	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء ۱۳
۴.	آدمی نما	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء ۸۳
۵.	آدمی نما	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء ۲۰۳
۶.	آدمی نما	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء ۷۰
۷.	آدمی نما	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء ۱۳۳
۸.	آدمی نما	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء ۱۰۵
۹.	آدمی نما	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء ۱۲۳
۱۰.	آدمی نما	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء ۱۰۶
۱۱.	آدمی نما	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء ۱۰۸
۱۲.	انداز نظر	اخشم اختر	۲۰۱۱ء ۷۳
۱۳.	آزادی کے بعد راجستان میں ڈاکٹر حبیب الرحمن نیازی	نظم نگاری - ایک مختصر جائزہ	۹۹۳ء ۱۲۳
۱۴.	تعارف و انتخاب کلام عقلیل	اخشم اختر	۹۹۳ء ۳
	شاداب (مونوگراف)		

بَابُ شَشْمَنْ

ما حصل

ما حصل

کوٹہ شہر کا تعلق اردو زبان سے اتنا ہی پُرانا ہے جتنی پُرانی اردو زبان ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کوٹہ شہر اردو ادب کے تخلیقی مزاج کے اعتبار سے کافی زرخیز رہا ہے۔ یہاں ابتدا ہی اعلیٰ درجے کے شاعر اور ادیب پیدا ہوتے رہے اور اپنے عمل تخلیقی سے شعر و ادب کے چار غروشن کرتے رہے۔ راجہ مہاراجا ڈل کی تاریخ سے ابھی تک یہ عمل جاری ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیوں کہ ادب ایک ایسا شعبہ زندگی ہے جو ایک باراً گرو جود میں آجائے تو پھر اس کا قیام تادم حیات جاری رہتا ہے اور وہ اپنے عمل کے ذریعہ زندگی کے تمام راستوں کا تعارف پڑھنے لکھنے والوں سے کرواتا ہے۔

الہنا کوٹہ شہر تو ویسے بھی جغرافیائی اعتبار سے بڑا خوبصورت اور پُرفشا شہر ہے۔ یہاں کہ قدرتی فضانہ صرف ادبيوں اور شاعروں کے لئے سازگار ہے بلکہ ہر شعبہ زندگی میں کام کرنے والے شخص کے لئے بہترین ہے۔ کوٹہ ضلع راجستان کے جنوب مشرق میں دریائے چمبل کے دونوں کناروں پر بسا ہوا ایک خوبصورت شہر ہے۔

کوٹہ میں اردو شعر و شاعری کو مقبول کرنے کا شرف مولوی سید افضل حسین ثابت لکھنوی کو حاصل ہے۔ جو ۱۸۸۲ء میں عدالتی ملازمت کے سلسلے میں کوٹہ تشریف لائے تھے ان کی کوششوں اور کاوشوں کی بدولت یہاں شعری نشستوں اور مشاعروں کا سلسلہ عام ہونے لگا۔ کئی ادبی انجمنیں قائم ہونے لگی۔ ۱۹۷۶ء کے آس پاس اپنی پہچان بنانے والوں میں عقیل شاداب، احتشام اختر، ظفر غوری اور ظفر احمد پرواز کے نام بہت اہم ہیں۔

موجودہ دور میں کوٹہ جدید تعلیم (سائنس اور ٹیکنالوجی) کے حوالے سے پورے ہندوستان میں اپنی شناخت بنا چکا ہے۔ لیکن ہمیشہ سے ہی اس شہر نے اردو زبان و ادب کو صحبت مند ماحول عطا کیا۔ اس لئے کوٹہ میں ایسی ہستیاں موجود ہیں جو اردو زبان و ادب کے لئے خلوص دل سے کام کرتی رہیں اور جن کی وجہ سے یہاں کی علم و ادب کی فضاسازی اور ذہن سازی ہوتی رہی۔ ایسی ہستیوں میں عقیل شاداب کا نام سر فہرست ہے۔

عقیل شاداب راجستان کی ایک تاریخ ساز شخصیت شعری اور ادبی اعتبار سے جو کام کیا توجہ سے اور ڈوب کر کیا اور اپنی الگ شناخت قائم کی۔ چاہے وہ شعبہ مالی زندگی سے متعلق ہو یا ادبی زندگی سے یا انسانی برداشت سے کسی بھی کام میں جب داخل ہوتے تھے تو اسے پوری توجہ اور انہاک (Consontration) سے نوازتے

تھے اس لئے نتائج زیادہ تر ثابت ہوتے ہیں۔ شاعری کی ابتداء اول عمری سے ہی ہو گئی تھی تعلیمی سلسلہ انجینیر نگ کی ڈگری سے بھی وابستہ رہا۔ لیکن کبھی حالات کی وجہ سے اسے تمکیل تک نہیں پہنچا پائے اور جو کام کرنے دنیا میں آئے اُسے ہی پوری سچائی اور ایمانداری سے پورا کیا یعنی شعر و ادب کی خدمت شاعر بہت ہوئے اور ہونگے لیکن شادا بَ کے یہاں ایک انفرادی خوبی اس لئے انہیں سب سے الگ کرتی ہے اور ایک منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتی ہے کہ وہ نہ صراحتی شاعری کرتے تھے بلکہ تمام اپنے شاعروں کی صلاحیتوں کو بھی تھہ دل سے قبول کرتے تھے۔ مطلب یہ کہ ڈھنی طور پر وہ اپنے اس کام کے لئے مکمل Divoted ہے۔ اس لئے انہوں نے ابتداء سے ہی بڑے سترے اور پختہ شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ ایک اہم بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ شادا بَ صاحب جو بھی جتنا بھی پڑھتے تھے اس کا استعمال تجربے کے طور پر ضرور کرتے تھے یعنی اس علم کو وہ خود تک محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ اسے مسلسل تقسیم کرتے رہتے تھے۔ وہ نہ صرف زبان کے اعتبار سے شاعر تھے بلکہ برتاؤ، مجاز، اخلاق اور بہ حیثیت مجموعہ زندگی ہر نظریہ کے اعتبار سے مکمل شاعر تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے شاعر صدیوں کی دین ہوتے ہیں۔ جو اپنے کام کو ایسا نہیں لگتا کہ بذاتِ خود ہی کرتے ہوں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دنیا میں آتے ہی اس کام کو کرنے ہیں۔ الہanza کی یہ ایمانداری ان کی مکمل زندگی کا اعتراف ایک بہترین ادبی اور شعری شخصیت کے طور پر کروائی ہے۔

شادا بَ صاحب بڑے آزاد منشِ، جذباتی اور کافی حد تک پچ انسان ہیں جہاں کہیں انہیں جھوٹ پر پیشان کرتا ہے وہ ایمانداری سے اُسے بھی اسی روپ میں تسلیم کر لیتے ہیں ان کی اس Transprecy نے ان کی شاعری میں ایسا Confession پیدا کر دیا ہے جو خود شناسی کے عمل کے ساتھ لوگوں کے لئے ایماندار انسانی رشتے کی بھی بنیاد بن جاتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ۔

بقول اقبال

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

پر نہیں طاقت پرواہ مگر رکھتی ہے

شادا بَ صاحب جب لکھتے ہیں تو کہیں یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ان کا تحریری سفر کامل ہے بلکہ اپنے کام کی ابتداء سے لے کر آخر تک وہ اس سچائی کو تھہ دل سے تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی بھی فن یا فنا کا تبھی تک زندہ جاوید ہے جب تک کہ اس میں مسلسل سیکھتے رہنے کا جذبہ برقرار رہتا ہے۔ جہاں وہ اس غلط فہمی کا شکار ہوا کہ اس کے فن کو تمکی حاصل ہو چکی ہے سمجھ لیجئے اس کافی سفر ختم ہو گیا اس لئے اپنی زندگی کی آخری سانس تک انہوں نے الفاظ کی دنیا کے اس سفر کو جاری رکھا اور شاید جانے کے بعد بھی ان کی خاموشی آواز کی صورت میں ہم سے مخاطب ہے تبھی تو ایک

لمحہ بھی ان سے والبستگی رکھنے والا کوئی بھی شخص ان کے ڈھنی سفر سے کٹ نہیں پایا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شاداب صاحب اچھے شاعر تھے اس سے بہتر انسان تھے وہ اپنی عملی زندگی میں لوگوں کی مدد اس طرح کیا کرتے تھے یا اس طرح ساتھ دیا کرتے تھے کہ کسی کی خدا ری کو کہیں ٹھیس نہ پہنچے اور مدد حاصل کرنے والا بھی ہر لمحہ ایک بہتر انسان کے طور پر ان کا ہدم ان کا ہمقدم اور ان کا دوست بنار ہے۔

واقعات تو ان کی ذات سے والبستگی رکھنے والے بہت ہیں جن کا ذکر پچھلے ابواب میں کیا چکا ہے۔ ان کی سوچ کی انفرادیت کہیں کہیں کئی بارا نہیں عجیب و غریب بھی ثابت کرتی ہے وہ چونکا تے بہت ہیں تیکھی بات کہنے کی سچائی کبھی کبھی اس قدر ہو جاتی ہے کہ ممکن ہے کسی موقع پر شعر و ادب سے ناواقفیت رکھنے والا حلقة پر یشان ہو جائے مگر تھوڑے سے عمیق مطالعہ کے بعد یہ سچائی اجاگر ہو جاتی ہے کہ وہ جو بھی لکھ رہے ہیں اس سے پہلے وہ اُسے جی رہے ہیں اور جی بھی بڑی بہادری سے رہے ہیں۔ لہذا اس بے باقی کے سبب اپنی زندگی میں کئی مرتبہ کتنے ہی ناخوشنگوار لمحات کا سامنا انہوں نے کیا اور فتح یا بھی رہے۔

کیوں کہ یہ امر تو یقینی ہے کہ اگر آپ واقعی سچ بول رہے ہیں تو آپ کو قبولیت حاصل ہونا طے ہے۔ بعض لوگ سچ کو صرف سلیب زہرا اور ناکامی سے ہی جوڑتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں کامیاب اور خوشحال انسان سچ کا رشتہ خدا سے جوڑتا ہے اور جس کے ساتھ خدائی طاقت شامل حال رہتی ہے وہ زندگی میں کبھی کچھ موقوں کو چھوڑ کر زیادہ تر خوشحال اور اطمینان بخش زندگی جیتا ہے۔ جدت اظہار کے اعتبار سے بھی شاید ہی کوئی شاعر شاداب صاحب کا مقابلہ کر پائے خصوصاً نظموں میں ان کی یہ بہادری بہت واضح ہو کر ابھرتی ہے۔

کہیں کہیں قاری کو شک و شبہات میں بھی مبتلا کرتی ہے اور نظریاتی اعتبار سے قبل بحث بھی ہو سکتی ہے۔ میں یہاں اس بات کا دعویٰ نہیں کرتی کہ شاداب صاحب اپنے شعری رویے کے حساب سے بے حد Civilized شاعر ہیں لیکن اتنا تو کہہ ہی سکتی ہوں کہ لکھا انہوں نے وہی ہے جو زندگی نے انہیں دیکھایا۔ کہیں کہیں جیسے پر مجبور کیا اور کبھی ان کے جذباتی حس کو جنسی تسکین سے آشنا کیا۔ ہمارا اردو ادب زندگی کی جنسی عکاسی کے اعتبار سے بہ حیثیت مجموعی بہادر اور بے باک ہے لیکن اس جانکاری کے لئے وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے۔ تبیہی جا کر شاداب صاحب کی کچھ نظموں کو ہم Justify کر سکیں گے۔ کیوں کہ کہیں ایک قول ہے آدمی جانکاری علمی سے بھی زیادہ خراب ہوتی ہے۔

اردو نظم نگاری مولانا حائلی کی کاؤشوں کا نتیجہ کہی جا سکتی ہے۔ حائلی کی نظم نگاری اردو نظم نگاری کی ترقی کا پہلا قدم مانی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت میں نظیراً کبر آبادی سے اردو نظم نگاری نے ایک مکمل صورت اختیار کر لی تھی۔ نظیر،

حالی اور آزاد نے اردو نظم نگاری کوئی راہ دکھائی۔ پھر ترقی پسند تحریک نے نظم نگاری کے فن اور اندازِ بیان کو ہی بدل دیا۔ نظم کی دنیا میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی۔

اردو نظم نگاری کی ان تبدیلیوں کا اثر راجستان پر بھی پڑا۔ راجستان کے شاعر بھی نئے رجحانات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اختر شیرانی نے اپنی نظموں سے عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ کوٹھ میں عقیل شاداب نے بدلتی ہوئی فضاض پر لبیک کہا۔ ان کی نظموں نے روایت سے بغاوت نہیں ہے بلکہ ماضی کے احساس میں نئی روشنی کی تلاش موجود ہے۔

عقیل شاداب نے اردو غزل کے روایتی موضوعات کو نئے انداز سے پیش کیا۔ حسن و عشق، ہجر و وصال، گل و بلبل، خزاں و بہار، حرم و دری، شیخ و برہمن وغیرہ نفاست اور تازگی کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھال دیئے۔ غزل کا فن بڑا نا زک فن ہے اس کو برتنے میں کافی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی لغزش غزل کی نزاکت کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ عقیل شاداب نے غزل کی اس نزاکت کا احساس رکھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

انگنت جلوے ہیں منظر ایک ہے

پیہ، ہن لاکھوں ہیں پیکر ایک ہے

عشق میں اپنی یہ حالت ہو گئی

اس کا جا کہنا بھی "آ" لگنے لگا

عقیل شاداب کسی ادبی تحریک سے وابستہ نہیں رہے۔ اس لئے ان کے کلام میں نہ تو قدامت پسندی ہے اور ترقی پسندی کا رجحان بلکہ کلاسکی مزاج کے باوجود ایک طرح کی تازگی موجود ہے۔ فنی اقدار اور شاعرانہ رکھرکھاؤ ہے۔ زندگی کا شعور، محبت کا نور، عصری مسائل کا احساس، حسن کی شوخیاں، وصال کی سرمستیاں دلکش انداز میں موجود ہیں۔ روایتی مضامین کو عصرِ حاضر سے ہم آہنگ کا ہنر ان کے اسلوب کی شناخت ہے۔

آج کا دور بڑا افرات الفری کا دور ہے۔ مغربی تہذیب نے مشرقی تہذیب بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ رشتہ پامال ہو رہے ہیں، انسان خود غرض اور مطلب پرست ہو گیا ہے، انسان جن حالات سے دوچار ہو رہا ہے اس کی تصور کیشی عقیل شاداب نے بڑے سلیقے سے کی ہے۔

لہذا کسی بھی شاعر کے فن کو سمجھنے کے لئے اس کی سوانح ماحول کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ اور ادبی مطالعہ بھی وسیع اور مستحکم ہونا چاہیے تبھی عقیل شاداب کی شاعری کے ساتھ مکمل انصاف کر پائیں گے۔

عقیل شاداب نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل سے کی۔ غزوں کی سطح پر کہیں بہت عام انسان دکھائی دیتے

ہیں تو کہیں بے حد خاص ان کی یہ خوبی انہیں اُنکے آزادانہ مجاز سے حاصل ہوتی تھی۔ مکمل شاعری پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کسی موضوع کا انتخاب شعر کہنے سے پہلے کم ہی کیا کرتے تھے۔ ان کی زیادہ تر غزلوں میں آمد موجود ہے۔ مثلاً انتہائے جذبات کا یہ اظہار ملاحظہ فرمائیں۔

اپنی نظروں سے مجھے دور کبھی مت رکھنا

گر محبت نہیں رکھنا ہے تو نفرت رکھنا

تعلق کی یہ مضبوطی شاداب کے شعری مجاز کا نہ صرف بے خوبی اظہار کرتی ہے اور نہ صرف ایک اچھے شاعر کے طور پر ان کا تعارف کرواتی ہے بلکہ ایک مردِ کامل کا تصور بھی اس طرح مستحکم کرتی ہے کہ ذہن سے نکلا دشوار ہو جاتا ہے۔ ان کے بیہاں ان کی شاعری کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ تضاد بہت کم پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ مزاج کی قلندری تو کہیں بھی با آسانی ظاہر ہو جاتی ہے، بے ساختگی بھی ان کا حسنِ سخن ہے۔ ان کے شعر Preplanned نہیں لگتے۔ منظر کشی نہیں لگتی، رومانیت نہیں لگتی بلکہ وہ سچائی لگتی ہے۔ جو جس انداز سے جی گئی اُسی انداز سے پیش کر دی گئی۔ کئی جگہ تو انہوں نے اپنے جذباتی خود رے پن کو بھی بڑی خوبی سے حسنِ شعر کا جامہ پہنادیا اور پڑھنے والے کو کہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ بات اس پیرائے میں ادا نہ کر کے کسی دوسری طرح کہی چاہئے تھی۔ بس اظہار کی یہ صداقت ہی انہیں اپنے عہد کے دوسرے شعرا سے منفرد و ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

اُنکی غزلوں میں اگرچہ تغزل کی کمی ہے لیکن خیال آرائی (Equrecy) ہمیشہ قائم رہتی ہے کیوں کہ وہ لفظی کارگیری کے قائل نہیں بلکہ اپنے قاری اور سامع سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے اشعار کی زیبائش میں نہ کھو جائیں بلکہ صرف اس کے اصلی اور سچے مفہوم تک پہنچے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاداب صاحب نے جو شاعری کی وہ عین ان کے نظریہ حیات کے حساب سے کی۔ نظموں کے ذکر کے حوالے سے یہ تحریر کر دینا بہت ضروری ہے کہ عقیل شاداب اپنی بات کو کہنے کے لئے جتنے بیباک نظموں میں دیکھائی دیتے ہیں اتنے نسبتاً غزلوں میں نہیں ہیں۔ خاص طور سے نظموں میں جنسی پہلوؤں کا اظہار کبھی کبھی کہیں کہیں اس درجہ شدت اختیار کر لیتا ہے کہ وہ قاری یا سامع کے لئے باعثِ اعتراض بن جاتا ہے۔ کیوں کہ کہیں کہیں نظموں میں حد سے زیادہ بڑھی ہوئی جنسیت معنی کے اعتبار سے بونی نظر آتی ہے۔ اور اس سے کوئی معنوی پہلوادبی مطلب یا بہتر مفہوم نکال پانا بہت مشکل یا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے لیکن اگر موجودہ دور میں دیکھا جائے تو ان کی شاعرانہ Boldness کہی جاسکتی

ہے۔ مثال کے طور پر نظم کے اشعار ملاحظہ ہو۔

میرے تکیے پہ لمس کس کا ہے
خوبی کس کی ہے بال کس کا ہے
کون جا گا ہے میری آنکھوں میں
میرے بستر پہ کون سویا ہے

کسی بھی فنکار کے مکمل فن کا احاطہ کرنے کے لئے اس کی سوانح عمری کا جائزہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ شاداً صاحب کی ڈینی تربیت تعلیمی پروگرام جس ماحول میں ہوئی وہ Family یا خاندان کے حساب سے ایک جاگردار انہوں نے اپنا وسیلہ اظہار ہی بنایا پیشہ نہیں۔ شاید اسی وجہ سے کہیں کہیں ان کی شاعری عوامی ذوق سے بڑھ کر اس تیش پرستی کوچھوکی ہے جسے خواص کے حلقوں میں تفنونِ تب سے تعمیر کیا جاتا ہے۔

عقلی شاداً بکا تخلیقی سفر ایسے دور سے گزرا جہاں بحیثیت شاعر کئی جگہ وہ بڑے پختہ اور مکمل کامل دین نظر آتے ہیں۔ کئی جگہ Social reformer، کئی جگہ عاشق زندگی نظر آتے ہیں، کئی جگہ افسر دہ اور مایوس لیکن جو پہلوان کی شاعری کا سب سے مضبوط پہلو ہے وہ کردار ایک مردِ مجاہد کا ایسا کردار ہے جس نے ندگی کو جہد میں مسلسل سمجھ کر جیا ہے لہذا ایک عام آدمی کی طرح کہیں مایوس ہوتے ہیں کہیں خوش ہوتے ہیں کہیں غصہ اور جھنجلا ہٹ کا شکار ہوتے ہیں، اور کہیں ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔
کہتے ہیں۔

متاع و مال نہ دے دولتِ تباہی دے
مجھے بھی مملکتِ غم کی بادشاہی دے

یہاں شاداً صاحب نے حزن و یاس کو بھی کامیابی اور کامرانی میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور اللہ پر اپنے مستحکم یقین کو ثابت کر دیا ہے کہ وہ جو بندے کو عطا کرتا ہے دراصل وہ اس کا حق دار ہوتا ہے اور اس کو اس میں خوش اور مطمئن رہنے کی عادت ڈال لینی چاہیے کیوں کہ حد سے زیادہ توقع اُسے بھٹکاؤ کے اس صحرائیں لاچھوڑتی ہے جو زندگی جینے کی لئے Inspiration کا سبب بنتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ سبق بھی سکھاتا ہے کہ زندگی از لی اور ابدی ہے اس میں کہیں ٹھراو نہیں بلکہ سفر کی دلچسپی ہے جو مسافر کو ہمیشہ خوشحال بنائے رکھتی ہے۔ لہذا عقیل شاداً یہاں اپنے تخلص کی حفاظت پوری سچائی اور تازگی سے کرتے ہیں۔ زندگی کے بو جھ کو آسانی سے ڈھوتے

ہیں اور اسے ناگوار سمجھنے والوں کے لئے مشعل راہ بن جاتے ہیں۔

عقل شاداب یہاں ایک **Idia** شاعر کی طرح ان کے ہر شعر میں ایک تہہ داری اور معنویت پوشیدہ ہوتی ہے جسے حاصل کرنے اور سمجھنے کے لئے ہمیں ایک مخصوص ذہنی محنت سے گزنا ہوتا ہے اپنی بات خصوصاً نظموں میں وہ اس انداز سے کہتے ہیں کہ ان کی علامات اور استعاروں کو سمجھنے کے بعد ہی ہم ان کی نظم کے اصلی مفہوم تک پہنچ پاتے ہیں۔ کچھ نظموں کو چھوڑ کر زیادہ تنظیمیں اسی طریقے سے لکھی گئی ہے۔ یہ خوبی اکثر غزوں میں بھی پوشیدہ ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں

بے نگ و نام ہوں میں کوئی نام دو مجھے
ایک شہر گم شدہ ہوں برآمد کرو مجھے

یہ ایک ایسا شعر ہے جس کے مطلب تک رسائی ہر دوسرے انسان کے بس کی بات نہیں۔ کیوں کہ یہ دونوں مصرعے انسانی نظام کی ایک تاریخ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ خود کو مثال بنا کر پورے اسلامی یا انسانی معاشرے سے شاداب صاحب کا خطاب اس شعر میں ایک انوکھا منظر نامہ بن گیا ہے۔ کوئی شاعر اگر اپنی تفہیم کے لئے یہ کہے کہ میری پہچان کو ثابت کیا جائے تو یہ دراصل صرف اس کی پہچان کی کہاں بلکہ یہ تو جس انسانی معاشرے کا وہ نمائندہ ہے موجودہ دور میں نہ یہ شاعر سمجھ پایا ہے نہ اس کا معاشرہ۔ اس لئے اس تضاد کو عقل شاداب لفظوں میں ادا کر رہے ہیں۔ براۓ راست بھی اور بلا واسطہ بھی یہ شعر ہمارے انسانی سماج کو Challenge کرتے ہوئے ہماری شناخت کی جڑیں اور ان کی جانکاری ہم تک پہنچا رہا ہے کہ اس دور کی بیدارہ روی ہمیں بتائے کہ دراصل ہم کس نظام حیات کے علم بردار ہیں۔؟ موجودہ انسانی طریقہ کار کیا زندگی کی صحیح رہنمائی کر پا رہا ہے۔ اور اپنے پیروکار کو اس کی پہچان سے ملوپا رہا ہے یا وہ صرف ایک لیبل (Label) بن کر رہا گیا ہے

آج کا انسان باحالت مجبوری ایک مشینی کردار کی طرح جینے پر مجبور ہے۔ یہاں ہمیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ عقل شاداب اسلامی تہذیب کے بڑے ماننے والے اور بالیقین مجاہد ہیں تبھی تو یہ قرب ان کے ان دونوں مصروعوں کی زبان بن گیا ہے۔ کہ خدا کے لئے گم شدہ شہر، گم شدہ آدمی کو گم شدہ انسانیت کو گم شدہ کردار کو گم شدہ اصلی طریقہ کار کو بنیادی وجود عطا کیا جائے جس کا وہ سچا حقدار ہے اور جس کے بلبوتے پروہ پورے یقین سے کہہ سکے کہ وہ زندگی کے کس مسلک سے واپسی رکھتا ہے۔ کیوں کہ Globalization کے اس دور میں انسان کے پاس بہت کچھ سے زیادہ لامحدود مادی دولت موجود ہے ان سب کے باوجود اس کا دل اس اطمینان سے خالی ہے جسے

حاصل کرنے کے لئے اُس نے اتنا بوجھا کٹھا کر لیا ہے۔ لہذا یہاں آکر ایک حساس شاعر پوری دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی بہادری سے یہ کہہ رہا ہے کہ کیا واقعی زندگی کو کسی مخصوص نظامِ حیات کی ضرورت ہے یا اُسے Material طرز پر جی لینے سے بھی سب کا بیڑا پار ہو سکتا ہے۔

سوچ کے اس سفر کو شاداب صاحب نے مذکورہ بالا دونوں مصروعوں کا موضوع بنایا ہے اور ہمیں ہمارے احساس کی آخری حدود تک جھنگھوڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے
 شاید مجھے میری کوئی پہچان مل سکے
 شور و شغب سے دور کسی دن سنو مجھے

عقل شاداب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تو انسان کے تخلیقی سفر کے صرف اس پہلو پر نظر رکھتے ہیں کہ آگے بڑھتے رہنے کے لئے کیا کبھی پیچھے مُڑ کر دیکھنا ضروری ہوتا ہے یا صرف آگے بڑھتے رہنا ہی اصلی زندگی ہے اس Confusion کو عقل شاداب نے اپنے شعر میں یوں نظم کیا ہے کہ وہ ایک ایسا فسفہ بن گیا ہے جسے سلبھانے کے لئے فرد واحد کو انہوں نے تمام نظامی جگڑنوں سے آزاد کر دیا ہے اور ہر ایک کو اپنی اپنی تہلیل نفس کے دروازے کھولنے پر مجبور کر دیا ہے لہذا ایسے شعر بہت کم پڑھنے اور سُننے کو ملتے ہیں جو قاری اور سامع کو فکر کی اُن لامحدود انچائیوں تک پہنچا دیتے ہیں جہاں اس کے پاس ٹھہر نے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ صرف اور صرف جہدے مسلسل کی کیفیت اور یقین ہی اس کے سفر کو زندہ رکھتا ہے:

نئی دنیا کے تقاضے شاداب صاحب نے محسوس بھی کئے اور تحریر بھی اس انداز سے کہ آج کے عہد کی زندگی ان کی نظروں میں وہ معنویت حاصل کرتی ہے جس کی اصلیت تک پہنچتا شاید ہر ایک کے بس کی بات نہیں اس خیال کی نمائندگی ان کی اس نظم سے با آسانی ہو جاتی ہے جہاں وہ یہ کہتے ہیں۔

ایک نئے اتھاں کی بنیاد رکھنا ہے ہمیں
 ضائقہ اپنے ہوا کا آپ چکھنا ہے ہمیں
 جان دے کر زندگی کو پر کھتنا ہے ہمیں
 آؤ مل جُل کر نئے فرمان ہم جاری کر لیں
 ایک عالم آج ہم سے بر سر پیکار ہے
 ہر کنارہ ہمارے واسطے ابا مجدھار ہے

گالیوں کی بارشِ ہیں وینگ کی بوچھا رہے
کان اب تک آشنا ہیں کرشن کی آواز سے
لڑ رہے ہیں ہم مہا بھارت نئے انداز سے
دوستوں اب نوجوانوں کا زمانہ آگیا
سر پھیروں کا اور دیوانوں کا زمانہ آگیا
انگنت ہندوستانیوں کا زمانہ آگیا
فرق مٹ جائے گا ہر انسان کا انسان سے
ایک نیا سورج اگے گا خاکے ہندوستان سے

دوسرا حاضر میں سیاسی نظام کی تبدیلیاں شاید ایسے ہی شاعروں کی سوچ کا نتیجہ ہے جو ہماری اسی حسین دنیا پر
صرف انسانی حکومت یا انسانی انتظام تسلط دیکھنا چاہتے ہیں اور تاریخ کے اس بے حصر Classification کو ختم کر دینا چاہتے ہیں جس نے ذات اور برادری کے نام پر کسی کو چھوٹا اور کسی کو بڑا قرار دے کر ایک ایسی تفریق ایک ایسا Design انسانیت کے لئے پیدا کر دیا ہے جو اس کی زندگی کو محال سے محال کرتا چلا گیا لہذا یہاں شاداب صاحب کی ہی طرح ان کے ہم عصر شاعر محترم راحت اندوری بھی اسی خیال کو اسی طرح پیش کرتے ہیں کہ۔
آپ کی نظرؤں میں سورج کی ہے جتنی عظمت
ہم چرانوں کا بھی اتنا ہی ادب کرتے ہیں

راحت کیوں کہ عقیل شاداب سے عمر میں چھوٹے ہیں لہذا ان کا وسیلہ اظہار ان سے نیا مختصر اور دلچسپ ہے۔ شاداب چاہتے بھی یہی تھے کہ آنے والی نسل ان کے ذہنی سفر کو زندگی کے اس عجیب تعریف کو اور سجا کر پیش کرے اور راحت اندوری نے اس طریقہ کار کو بڑی آسانی سے ثابت کر دیا ہے۔

شاعری دراصل نام ہی زندگی کے سچے تعریف کا ہے شاعر ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ زندگی جیسی بھی ہے اُسے ویسا ہی سمجھایا جائے اور جینے کے لئے انسانی الجھنوں کو اپنے اشعار میں اس طرح پیش کئے جائیں کہ سُننے والوں کے لئے وہ مشعلِ راہ ثابت ہو اور جہاں کہیں انہیں زندہ رہنے کے لئے ذرا سی بھی مشکل مایوسی، پریشانی کا سامنا کرنا پڑے وہ کسی بھی شعر کے ذریعہ فوراً یہ سمجھ جائے کہ ایسی انوکھی صورتِ حال صرف ان کے ساتھ ہی پیش نہیں آتی ہیں بلکہ یہ انسانی عمل تو صدیوں سے جاری ہے اور سبھی جینے والے اسی سیلا بزدہ دریا کے تیراک ہیں۔ اب جو تیراک اپنے ارڈگر کی لہروں کو جتنا سمجھ کر تیر سکتا ہے اس کا سفر اس دنیا روپی سمندر میں اُتنا ہی کامیاب و کامران

اور خوشحال رہتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت عقیل شاداب نے اس طرح بیان کی ہے:

یوں ایک اچھے پڑوئی کا حق بھاؤں گا
وہ آگ دے گا میرے گھر کو میں ہوادوں گا

یادوسری جگہ فرماتے ہیں:

جب میرے گھرنے آگ پکڑی تھی

ملنے آیا تھا وہ ہوا کی طرح

الہذا دونوں ہی شعر انسانی سفر کے اس مرحلے کو بہت آسانی کر دیتے ہیں کہ زندگی کی پریشانیاں یا ان کا سامنا کرنا تب اور آسان ہو جاتا ہے جب ان کے سامنے کوئی حریف آ کر انہیں اس انداز سے Challange کرے کہ ان حالات میں آپ کو زندگی جینا محال ہو جائے گا تب دل چاہتا ہے کہ دراصل زندگی کو ثابت کرنے کا اصل وقت ہمیں ابھی ہی سے میسر ہوا ہے۔ کیوں کہ مخالفت ایک ایسا بہترین عمل ہے جو ایک انسان کو زندہ رہنے کے لئے بے حد مظبوط و مختکم بناتا ہے۔ ہمیں ہماری صلاحیتوں کا احساس جتنا اپنے ہمدردوں اور دوستوں کی حمایت سے نہیں ہوتا اس سے زیادہ اپنے دشمن کی مخالفت سے ہوتا ہے۔ تبھی تو بیش بر کہتے ہیں:

مخالفت سے میری شخصیت سنورتی ہے

میں دشمنوں کا بڑا احترام کرتا ہوں

یا ایک جگہ اور اسی طرح ہم کلام ہیں کہ:

جس کی مخالفت ہوئی مشہور ہو گیا

ان پھروں سے کوئی پرندہ گرانہیں

اس روڈِ عملِ عقیل شاداب نے پوری زندگی بڑی یقین اور اعتماد سے جیا اور ثابت کر دکھایا کہ وہ دنیا میں زندگی گزارنے نہیں بلکہ اسے جینے آئیں ہیں اس سے مخلوق ہونے آئے ہیں اور نہ صرف وہ خود اُسے جینے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ اپنے فن کے تعلق سے جتنے زیادہ لوگوں تک ممکن ہو سکتا ہے اپنے اشعار کے وسیلے سے زندہ رہنے کا صحیح طرزِ عمل سکھاتے ہیں اور سوچ کیا ہے کہ انسانی اور اخلاقی ضابطوں پر ہمیں عمل کرنا چاہئے۔ اور کسے چھوڑ دینا چاہیے۔ الہذا ایک اچھے اور سچے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ زندگی کے اس میدان کے بہترین کھلاڑی ہے جہاں زندگی کا یہ کھیل کھیلنے کے لئے قدرت نے انہیں پختا ہے۔ ایک جگہ شاداب اپنی مذہبی خیال کی نمائندگی اس شعر میں یوں کرتے ہیں:

ہم اپنے عہد میں جنسِ فضول بن کر رہے
یہود یوں میں خدا کے رسول بن کر رہے

یہ شعر تاریخی اعتبار سے بھی انسانی اعتبار سے بھی اور اخلاقی اعتبار سے بھی بہترین شعر ہے۔ جہاں ایک شخص پیدا ہوتا ہے زندگی کا سبق سیکھتا ہے۔ بالغ الذہن ہو جاتا ہے، ایک مخصوص Ideology جانے والا یا پہچانے والا مانا جاتا ہے اور اس علم اور تجربے کے چراغ کو لے کر جب وہ زندگی کے نام و نہاد انہیروں کو دور کرنے کے لئے نکلتا ہے تو جن چیزوں اور کرداروں سے اس کا سامنا ہوتا ہے وہ اس کو اس سبق کے حساب سے صرف اور صرف چلے پھر تے Time table دیکھا دیتے ہیں۔ حیرت تب اس کی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب یہ لوگ اکثر اور بیشتر اپنے ہی بنائے ہوئے نظام سے بھی منکر ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک حساس ذمہ دار تجربہ کا رشا عری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اب اس کی ذمہ داری اس نظام کو سمجھانے کے اعتبار سے کیا بنتی ہے۔ لہذا وہ با آسانی لوگوں تک مندرجہ بالا شعر کی صورت اس تضاد کو یوں حاصل کرتا ہے کہ تمام تر عقیدے جن کے گھرے میں انسان حیران اور پریشان ہے کیا وہ واقعی عقیدے ہیں یا صرف مذہبی یا تہذیبی دیکھا وہ تو ظاہر ہے کہ عقیل شاداب ایسی صورت حال میں اپنے قاری اور سامع سے ان دو مصروعوں کے علاوہ اور کسی زبان میں بات کر سکتے تھے۔

بدلاو زندگی کی وہ اہم ترین سچائی ہے کہ جسے کوئی بھی انسانی سماج کبھی نہیں روک پایا۔ بدلاو کی سمت کیا ہوگی یہ بھی خود بدلاو ہی طے کرتا ہے انسان کو تو بس اس کے ساتھ جیتے ہوئے اپنے مسائل کے حل نکالنے ہوتے ہیں۔

یعنی بقول سرسید احمد خاں:

”اپنی مدد آپ کرنی ہوتی ہے“، اپنا بچاؤ آپ کرنا ہوتا ہے اپنی زندگی کے راستے اور منزلیں بھی خود طے کرنا ہوتا ہے اس میں جو جتنا ساتھ دیتا ہے حاصل کرتا ہے اور صرف ایک انجانے انجام تک پہنچنے کے لئے سفر کو مسلسل جاری رکھا جاتا ہے ظاہر ہے کہ طے شدہ انجام تو موت ہی ہے لیکن موت کے ڈر سے زندگی کی غلط سلط باتیں مان لیتا زندگی ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں بلکہ شاید اس طرزِ عمل کو ہمیں زندگی کہنے میں بھی دقت پیش آ سکتی ہے کیوں کہ زندگی تو یہی ہے جو زندہ رہنے کی حقیقوں کے ساتھ جی جائے اور زندہ رہنے کی علامت غلامی نہیں بلکہ وہ جائز آزادی ہے جس میں انسان اپنے حقیقی وجود کی حفاظت کرتا رہے اور جب جائے تو ممکن ہو اپنے بہتر طرزِ عمل کے نقوش چھوڑ جائے۔ نہ چھوڑ پائے تو بھی کوئی کمی نہیں بلکہ اس کے سفر کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اس عمل میں اگر بہتر زندگی اچھی زندگی، خوشحال زندگی، کامیاب زندگی کا بہ ذات خود زندگی کا سبب اگر ہم کس کو سکھا سکتے

ہیں تو یہ بھی قابل فخر ہے لیکن اس میں کہیں بھی ذرہ برابر بھی زور زبردستی اور ظلم کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ یہ عمل بے حد فطری خوش گوار ہونا چاہئے۔ ایک فوکار جو شاعر کے روپ میں کام کرتا ہے اپنی تخلیق کے وجود میں آنے پر اس فکر سے پوری طرح آزاد ہو جاتا ہے کہ اب پڑھنے اور سننے والوں یا سماج پر اس کا کیا اثر ہوا کیوں کہ اس فکر کے مرحلے کو تو وہ شعر کی تخلیق سے پہلے ہی اپنالیتا ہے اور یہ یقین ہونے کے بعد ہی اسے وجود عطا کرتا ہے کہ اس خیال کا شعر کی صورت میں ڈھننا لازمی ہے لہذا جب یہ تخلیق قاری اور سامع تک پہنچتی ہے تو پہنچتے ہی رسائی حاصل کر لیتی ہے اس یقین کو بھی عقیل احمد خاں شاداب نے اپنی ایک نظم میں بڑے اعتناد سے ادا کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں:

موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
مسکرانے کی توانائی ملی
ماتر بھومی ترے کن کن سے ہمیں
ماں کی ممتاکی سی گھرائی ملی
ہم تیرے آنکھ کئے پالے ہوئے
ہیں سراپا وجہ میں ڈھالے ہوئے
تو نے ہم کو بارہا بر کھا ہے ماں
ہم گداہیں بھیم کی ارجمن کا بان
ہم شوارانا ظفر ٹیپو ہیں ہم

مندرجہ بالا نظم شاداب صاحب کے فلکری تقاضوں کی بہترین عکاسی ہے حب الوطنی کے حوالے سے جو خیالات ان کے ذہن میں آئے اسے نظم کی صورت میں انہوں نے ویسے ہی کاغذ پر اتار دیا کیوں کہ سچائی ہمیشہ سرفراز رہتی ہے Convinciable ہوتی۔ لہذا یہاں ان کی یہ بات سمجھی کے لئے قبل قبول اور مستحکم ہے اور ہر وطن پرست ہندوستانی کے لئے Ideal بھی۔ شاداب بھی ایک عام آدمی کی طرح شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو کبھی کبھی بے حد اکیلے ہو کر محسوس کرتے ہیں زندگی کا حساب کرتے ہیں تو پھر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

نقد حیات جان سے مہنگی ملی ہمیں
لیکن ہمارے ہاتھ سے سستی چلی گئی

عُقیل شاداب کا یہ شعرو بسیع النظری سے سوچا جائے تو اقبال کے اس شعر کی نمائندگی کرتا ہے جو انہوں نے کبھی اس طرح لکھا تھا۔

تو بچا بچا کے نہ رکھا سے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

الہذا یہ شعر ہمیں زندگی جینے کا حوصلہ عطا کرتا ہے اور ہم تک یہ Message با آسانی پہنچاتا ہے کہ

کاروبارِ عشق میں اتنا تو ہونا چاہیے

اس کو پانے کی طلب میں خود کو کھونا چاہیے

میرے قاتل سے کہو کہ کام پورا ہو چکا

اب تو اس کو دشمنی کا ہاتھ دھونا چاہیے

الہذا یہاں ایک شاعر ایک قربان گاہ کی صورت زندگی کو عشق کے علاوہ میں اس طرح جھونک دیتا ہے کہ کھونے اور پانے کا فرق ختم ہو کروہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جو زندگی جینے کی اصلی معنویت ہے۔ یعنی کسی تخلیق کا عمل میں آنا دوسرا صورت میں Creation ہے اور جب کوئی کسی شاعر کے قلم سے کاغذ پر اترتا ہے تو وہ اس کی شناخت کو مستحکم کرتا ہے اس کام سے شاعر کو بھی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا نصب العین ہوتا ہے اور جب نصب العین حاصل ہوتا ہے سفرت بھی جاری رہتا ہے اور اس طرح منازل حاصل کرتے ہوئے شاعر مسلسل اپنے تخلیقی سفر کو تادمِ حیات جاری رکھتا ہے۔ ایک شاعر اپنے تخلیقی تسلسل کو اگر پوری ایمانداری سے جاری رکھتا ہے تو یہ سلسلہ ہی اس کی شخصیت اور شعری تعریف کے لئے کافی ہے۔

شاعر دراصل زندگی کا مصور ہے۔ الہذا اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے جس بھی کسی جذبے واقع یا کسی تاثر جو بھی کچھ نظم کرنا چاہتا ہے اس کی منظر کشی اور Expression اتنا سمجھا ہوا ہونا چاہیے کہ جب قاری صامع یا کوئی بھی اس سے ملے تو وہ سو فصد اس کا قائل ہو جائے اور بات اس کے دل و دماغ پر ایسے موثر طریقے سے اس کے ذہن و دل کو اپنی گرفت میں لے کر جس جذباتی سچائی کا اظہار وہ کرنا چاہتا ہے وہ ہو بہ محسوس ہوتی نظر آئے بس یہی دراصل شاعری ہے اس لئے شاعر کے لئے سچا ایماندار اور ایک Ideal ہونا ضروری نہیں اس کی کامیابی کا راز تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ جس طرح اپنے Responded تک پہنچانا چاہتا ہے وہ اس کی امید کے مطابق ہی پہنچ اور اس مخصوص موضوع کو جیسے اس نے اپنے شعر میں نظر کیا ہے بہترین طور پر اپنے Responded کو سمجھا سکے۔

الہذا شاعری جذبہ و احساس اور دنیا کی منظر کشی کے سوا خود بہ خود اگر اچھی ہوتی ہے تو زندگی کا سبق بھی

سمجھاتی ہے اسے سمجھاتی بھی ہے اور زندگی جینے میں سمجھی کے لئے مددگار بھی ثابت ہوتی ہے۔

یہاں اگر ایک پہلو نظر انداز کر دیا جائے گا تو یہ پوری بات غیر مکمل رہ جائے گی اور وہ ہے شاعر کی Entertainment کا پہلو کیوں کہ یہ شاعری ہی کی خوبی ہے کہ وہ جس بات کو کہتی ہے اس کا پیراۓ اظہار اتنا موثر ہوتا ہے کہ وہ بات دل و دماغ پر نصیحت یا سبق کی طرح ہی اثر نہیں کرتی بلکہ بڑے مزیدار طریقے سے سمجھ میں آتی ہے۔ اگر یہ مزاح کسی شاعری کا حصہ نہیں ہے تو ایسی شاعری بھی اظہارِ خیال کے اعتبار سے کمزور مانی جائے گی۔ کیوں کہ شاعری میں تفہونِ تب کی خوبی ہونا بے حد ضروری ہے ورنہ تو خیال اور باتیں تو سمجھی کے ذہن میں ہوتی ہیں۔ اپنی اپنی طرح ان کا اظہار کرنا بھی سمجھی کو آتا ہے لیکن شاعر کا کام یہیں ہے کہ جب وہ اپنی بات کہتا ہے تو اس کے اظہار کا طریقہ انتہی Impressiveness ہوتا ہے کہ اور وہ مقابلے میں وہ اپنی بات بہت کم لفظوں میں اور بہت اچھی طرح ادا کرتا ہے لہذا اس کی یہی خوبی اسے شاعر بناتی ہے یا اس کی یہی خوبی اس کی بہترین شاعر ہونے کا ثبوت ہے۔

عقلیل شاداب بہت اچھے منظر کش تونہیں اس کی وجہ شاید یہی لگتی ہے کہ رومانی سطح پر وہ متوازن نہیں ہیں اور ان کی شاعری میں جنسیت کی زیادتی کہی کہی ان کی تخلیقات کو غیر متوازن کر دیتی ہے جو قابلِ اعتراض بھی ہو سکتا ہے بحث کا موضوع بھی ہو سکتا ہے اور ممکن ہے کہ کہیں پر تو قبلِ رد بھی ثابت ہو جائے۔

ایک جگہ عقلیل شاداب اپنے کسی شعر میں کہتے ہیں:

” یہ شاعری ہے میری جان کا رو بار نہیں ”

یہاں ان کی شاعری تخلیق کی نیت کا احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کے کسی بھی حصے میں شاعری کو کبھی تجارتِ تصور نہیں کیا لہذا یہ تو طے ہے کہ شاعری کی طرف سے ان کی نیت صاف ہے کیوں کہ وہ شاعری کو ان کی تخلیقی عبادت مانتے ہیں نہ کہ تجارت۔ کسی بھی شاعر کی تخلیق یا عمل میں اس کے تینوں زمانے کا فرماتے ہیں۔ شاداب صاحبِ ماضی پرست تونہیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنی روایت سے بالکل گریزاں ہیں تو ٹھیک نہیں ہو گا کیوں کہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

جب بھی یاد آتی ہے ماضی تیرے افسانے کی
ذہن بن جاتا ہے دل دل کسی ویرانے کی
ابنِ آدم کے ہر ایک جرم کے پیچے اکثر
داستان ہوتی ہے گندم کے کسی رانے کی

یہاں ایک بات قبل ذکر ہے کہ کیا شادا ب صرف جدید شاعر ہیں کیوں کہ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے:

روائیوں سے گریزاں رہے جئے جب تک

گلاب زاروں میں تنہا بول بن کر رہے

لیکن وہ ہی عقیل شادا ب کہیں یہ بھی لکھتے ہیں:

میرا کلام ہے آئندہ عصر حاضر کا

”جدیدیت کا میرے ذہن پر بخانہیں“

اول شعر کافی پہلے کا ہے لیکن اس کے بعد کے شعر ان کے آگے کے ڈنی سفر کی تشكیل ہے لہذا ہماری نظر میں عقیل شادا ب صرف جدید شاعر نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے کے شاعر ہیں تقریباً ہر جذبہ و احساس کے شاعر ہیں اور آزاد فکر شاعر ہیں۔ لہذا ایسا آزاد فکر بلند درجہ اور عظیم شاعر ہی یہ لکھ سکتا ہے:

ہے فقر و فن میں میرے زندگی ہر پہلو

کسی بھی ازم کا اب تک میں زیر بار نہیں

لہذا ایک فنکار اپنے فن کے حوالے سے تادم حیات مصروف سفر رہتا ہے اور سفر کی ہر لندت ہی اس کی منزل ہوتی ہے لہذا اسے سفر سے الگ کر کے دیکھنا صداقت سے گریز ہے کیوں کہ اس کے لگاتار مخلوق نظر ہنے کا یہ عمل اُسے متممین رکھتا ہے اور زندگی اس ایک بہاؤ میں جیئے کا عادی ہوتا ہے تبھی تو اس کی کہی ہوئی بات سننے پڑھنے اور محسوس کرنے والوں کے لئے بے روک ٹوک اظہار کا وسیلہ بن جاتی ہے۔

عقیل شادا ب پیدائش سے آخر تک ایک بے حد زندہ دل اور لا جواب ولازوں شخصیت کے مالک ہیں بقول ہماری اسلامی سوچ کے حساب سے وہ اگر دائیں ہاتھ سے کسی کی مدد کرتے تھے تو بائیں کو خبر نہیں ہو پاتی تھی۔ نہ صرف وہ اپنے عہد کے بے حد کامیاب اور کامران شاعر تھے بلکہ بڑے بھجے ہوئے انسان تھے۔ صاف گوئی انکا شیوه تھا ہاں بطور شاعر یا فنکار ہمارے معاشرے سے تھوڑی ناراضگی ان کے مجاز میں بنی رہتی تھی لیکن ان کی شاعری میں اس کا اظہار بھی اتنا Enagry Positive کے ساتھ کرتے تھے کہ ان کی کہی ہوئی بات ہمارے لئے مفید ہی ثابت ہوئی تھی۔ نہ صرف نظموں اور غزلوں پر بلکہ انہیں گیتوں، روایات، قطعات یعنی اردو ادب سے وابستگی رکھنے والی ہر صنف سخن میں قدرت حاصل تھی۔

الغرض عقیل شادا ب ایک یہ سے اعتدال پسند شاعر تھے جنہوں نے نظریاتی تحریکوں سے دامن بچاتے ہوئے اپنے لئے اعتدال کی راہ اختیار کی۔ اپنے فن سے نہ صرف ریاستی بلکہ ملکی سطح پر بھی اپنی شناخت قائم کی۔ اور کئی شاعروں کی محفلوں میں رنگ آمیزی کی۔ یہی ایک فنکار کی کامیابی کی دلیل ہے۔

اختیابِ کلام

انتخابِ کلام

غزلیں

بے نگ و نام ہوں میں کوئی نام دو مجھے
 اک شہر گم شدہ ہوں برا آمد کرو مجھے
 اک حرفِ آخری ہوں حکایاتِ عشق کا
 خونِ جگر سے دامنِ دل پر لکھو مجھے
 تریاقِ ہوں کہ سم ہوں، مرا تجزیہ کرو
 بازی لگا کے جان کی اک دن چکھو مجھے
 بے کار وقت کی طرح یوں ہی گزار دو
 سگرٹ کی طرح پی کے کہیں پھینک دو مجھے
 سڑکوں پر لکھ دیا ہے مجھے میرے وقت نے
 تلوؤں سے تم بھی اپنے کسی دن پڑھو مجھے
 کب سے بجھی ہوئی ہے میری مشعلِ وجود
 اپنے بدن کی آگ سے روشن کرو مجھے
 شاید مجھے میری کوئی پہچان مل سکے
 شور و شغب سے دور کسی دن سنو مجھے
 میں نے سہا ہے ایک زمانے کو ایک عمر
 جیسا بھی کچھ ہوں میرے رفیقوں! سہو مجھے
 میری زبان کو میرا ہی ہمزاد ڈس نہ لے
 شاداب کوئی لہجہ نیا بخش دو مجھے

غزل

دل کی بات زبان پر لاتے ڈرتا ہوں
 میں اندر سے باہر آتے ڈرتا ہوں
 جس پر ماضی کی یادوں کے معبد ہیں
 اُس رستے سے آتے جاتے ڈرتا ہوں
 جانے کیسے اندیشوں نے گھیرا ہے
 جھونٹوں میں سچا کھلاتے ڈرتا ہوں
 اتنے گھر جلتے دیکھے ہیں آنکھوں نے
 اپنے گھر میں دیا جلاتے ڈرتا ہوں
 کھلانے کا دم رکھتا ہوں دنیا سے
 تیرے آگے آنکھ اٹھاتے ڈرتا ہوں
 کوئی جاگ نہ جائے، میری آہٹ سے
 رات گئے اپنے گھرانے سے ڈرتا ہوں
 مستقبل کا خوف مسلط ہے مجھ پر
 گیت اپنے ماضی کے گاتے ڈرتا ہوں
 جانے پڑھ کر ان کے دل پر کیا گزرے
 شعروں میں شاداب سماتے ڈرتا ہوں

غزل

انگنت جلوے ہیں منظر ایک ہے
 پیر ہن لاکھوں ہیں پیکر ایک ہے
 سامنا دو دشمنوں کا ہے، مگر
 زندگی اور موت کا ڈر ایک ہے
 آئینے ہی آئینے ہیں ہر طرف
 اور میرے ہاتھوں میں پھر ایک ہے

اپنے گھر میں اس لئے ہوں اجنبی
 میرا ندر اور باہر ایک ہے
 ہر طرف ہے بارشِ سنگ ہوں
 اور میرے دوش پر سر ایک ہے
 ایک عالم طالبِ تریاق ہے
 زہر کی قسمت میں شنکر ایک ہے
 پاؤں کے بیچے زمین ہیں بہت
 آسمان کی سرپہ چادر ایک ہے

غزل

اونج پر ہیں یہ پستیاں کتنی
 سر نگوں ہیں بلندیاں کتنی
 ان کہی کتنی داستانیں ہیں
 آن سُنی ہیں کہانیاں کتنی
 اجنبی پانیوں کی نذر ہوئیں
 کورے کا غذ کی کشتیاں کتنی
 یہ پرانا درخت آنگن کا
 جھیل پائے کا آندھیاں کتنی
 کھارے ساگر میں ڈوب جاتی ہیں
 میٹھے پانی کی ندیاں کتنی
 کتنی تاریکیاں ہیں ہر جانب
 اور ماچس میں تیلیاں کتنی
 دریا دریا پکاتا ہے کوئی
 پانی کتنا ہے محچلیاں کتنی

جان دیتے ہیں کتنے کرسی پر
 جان لیتی ہیں کرسیاں کتنی
 ہیں لباس حیات نوشاداب
 میرے دامن کی دھجیاں کتنی

غزل

ایسا کوٹھ ایسی چجمل ایسا گھر
 کھاں ملے گا یہ گنگا جل ایسا گھر
 بہنا کی کھٹھی میٹھی باتوں جیسا
 بھابی کی آنکھوں کے کا جل ایسا گھر
 ابا کی اکھڑی سانسوں ایسا
 ماں کے گیلے گیلے آچل ایسا گھر
 جس دن سے وہ چلی گئی اپنے میکے
 اس دن سے لگتا ہے جنگل ایسا گھر
 مہکی مہکی زلفوں ایسا سایا دار
 گورے گورے تن کے محمل ایسا گھر
 سردی میں کشمیر شال دو شالے سا
 گرمی میں ڈھاکے کی ممل ایسا گھر
 آگ خون کی ہولی کھینے والوں نے
 بنا دیا پل بھر میں مقتل ایسا گھر

غزل

نامہ اعمال کالا ہو گیا
 زندگی کا بول بالا ہو گیا
 دیکھ کر تجھ میں جنم جما نظر
 میں ایسر دیو مala ہو گیا

مل گئی میری کسی سے کنڈلی
آج میں تقدیر والا ہو گیا
خواہش پانی چڑھانے آگئیں
اب مرا دل بھی شوالا ہو گیا
بھنس گیا ہر شخص اس کے جال میں
یہ جہاں مکڑی کا جala ہو گیا
رات ندی پر نہانے آگئیں
سب دشاوں میں اجالا ہو گیا
آخر شش شاداب بھی تھک ہار کر
مکر دنیا کا نوالا ہو گیا

غزل

انگنائی چھٹپٹا رہی ہے واپس آ
گھر کی چوکھٹ بلارہی ہے واپس آ
کچا آنگن اور اکیلی گوریا
دوپھری چلچلا رہی ہے واپس آ
آنکھیں سونا بھول گئی ہیں راتوں میں
چارپائی چرم رہی ہے واپس آ
سردوںے پر کب سے ادھ کچی روئی
چوہے کا منہ چڑا رہی ہے واپس آ
محل رہا ہے سنٹا سونے گھر میں
تہائی کسمسا رہی ہے واپس آ
ماںگ سریکی یہ سندھی پگڑنڈی
یاد کسی کی دلا رہی ہے واپس آ

پنگھٹ سونا ہے چوپال اکیلی ہے
 برکھا آنسوں بہارہی ہے واپس آ
 کپڑے لتے سوکھر ہے ہیں ڈولی پر
 دھوپ اکیلی نہارہی ہے واپس آ
 پنجھی لوٹ چکے ہیں اپنے ڈیروں پر
 رات منجیرے بخارہی ہے واپس آ

غزل

یوں ایک اچھے پڑوئی کا حق نبھادوں گا
 وہ آگ دے گا میرے گھر کو میں ہوادوں گا
 مری طرح کوئی اس کونہ لوٹ لے یارب
 میں اپنے لوٹنے والے کو یہ دُعا دوں گا
 کہیں نہ حرمتِ ہمساگی پہ حرف آئے
 میں اپنے ہاتھ سے اپنا ہی گھر جلا دوں گا
 مجھے اُجاڑنے والوں سے کیا شکایت ہے
 کسی نے پوچھ لیا تو جواب کیا دوں گا
 نہ ہو کہیں میرے قاتل کو کچھ پشیمانی
 چراغ گھر کے سرِ شام ہی بجھا دوں گا
 بنے بنائی کھلوانے جو ٹوڑ دیتا ہے
 میں اس کوششہ گری کا ہنر سکھا دوں گا
 ہمارے نقچ میں کوئی نہ بھید بھاؤ رہے
 میں اپنے جسم کی دیوار بھی گرا دوں گا

غزل

برقِ رفتاری کے باعث ہانپتا رہتا ہے وقت
 خوفِ انعام سفر سے کانپتا رہتا ہے وقت

زندگی اس کے تسلسل کی ہی اک تصویر ہے
 ڈس نہ لے جب تک اجل کا سانپ تارہتا ہے وقت
 لمحے لمحے پر تنی رہتی ہے چادر وقت کی
 ہر نفس عریانیوں کو ڈھانپتا رہتا ہے وقت
 گردش حالات کے آگے جو ہمت ہار دیں
 ایسے لوگوں کے گھروندے بھانپتا رہتا ہے وقت
 میرا اس کا معركہ شاداب کتنا سخت ہے
 ہانپتا رہتا ہوں میں اور کانپتا رہتا ہے وقت

غزل

نہ کچھ اندر بدلتا ہے نہ کچھ باہر بدلتا ہے
 نیا سال آکے دیواروں سے کیلندر بدلتا ہے
 نکلتا ہے اسے پھر تین سو پینٹھے اڑاؤں پر
 پرندہ وقت کا پھر اپنے بال و پر بدلتا ہے
 زمین پر آسمان اوڑھے ہوئے لیٹا ہے دیوانہ
 نہ وہ چادر بدلتا ہے نہ وہ بستر بدلتا ہے
 جڑے ہیں آئینے ہی آئینے ساری دشاوں میں
 زراسا زاویہ بدلتے تو ہر پیکر بدلتا ہے
 گھٹری کی انگلیاں دن رات گردش کرتی رہتی ہیں
 بدل کر بھی کہاں یہ وقت کا چکر بدلتا ہے
 نمائش گاہ میں کے کھلونوں کی ہے یہ دنیا
 نہ رقص چاک تھمتا ہے نہ کوزہ گز بدلتا ہے
 نئے پھولوں پھلوں سے لد گئیں شاداب پھرشاخصیں
 ہمیشہ کی طرح موسم نئے زیور بدلتا ہے

غزل

سارے نام و نسب بے معنی
 جو بھی کچھ ہے سب بے معنی
 اس کے ساتھ بسر کرتا ہوں
 دن ہے مصروف شب بے معنی
 اپنی نظروں میں ہو جاؤں
 میں بھی جانے کب بے معنی
 بے جامیری کارگزاری
 اور دنیا کا ڈھب بے معنی
 ہر تفریق و جمع بے مقصد
 ہر تقسیم و ضرب بے معنی
 کھیل تماشہ دکھلاتا ہے
 کیوں طفل مکتب بے معنی
 ہوتے ہوتے ہو جاتے ہیں
 سب راکب مرکب بے معنی
 اس کی ہر اک عطا بے ماہی
 میری ہر اک طلب بے معنی
 اتنا ہے شاداب خلاصہ
 سارا شعر و ادب بے معنی

غزل

قد بر انہیں ہوا کرتے	ہے مسلسل اڑان میں لیکن
سب سکندر نہیں ہوا کرتے	وقت کے پر نہیں ہوا کرتے

جن میں رشتؤں کی دھوپ چھاؤں ہوں	ڈوپنے کا جنہیں شعور نہیں
اسے گھر گھر نہیں ہوا کرتے	وہ شناور نہیں ہوا کرتے
اپنے اندر میں ڈھونڈ لیتا ہوں	جو بھی کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے
جب وہ باہر نہیں ہوا کرتے	چاند چھت پر نہیں ہوا کرتے
مندلِ زخم اپنے پیاروں کے	راستہ اپنا خود تلاش کرو
زندگی بھر نہیں ہوا کرتے	اب پیغمبر نہیں ہوا کرتے
ظرف رکھتے ہیں جو سمندر کا	جسم ہوتے ہیں بر سر پیکار
حد سے باہر نہیں ہوا کرتے	زر بکھر تیں ہوا کرتے
کب تیری عاشقی میں پیرا ہیں	پیڑ، جن کی جڑ ہیں نہیں ہوتیں
خون سے تنہیں ہوا کرتے	بار آور نہیں ہوا کرتے
دھوپ کے دشیت بے اماں میں کمھی	دل نہ جن کے گداز ہوں شاداً بـ
وہ خن ور نہیں ہوا کرتے	موم کے گھر نہیں ہوا کرتے

کاش اس در کا سہارا مل جائے	اس کی محفل میں نہیں میری جگہ
زپر دیوار اماں بیٹھ رہوں	اب کہاں خلوتِ جاں بیٹھ رہوں
سامنے سے مرے ہٹتا ہی نہیں	وقت نے آگ لگائی گھر میں
ذات کا سنگِ گراں بیٹھ رہوں	دل سے اٹھتا ہے دھواں بیٹھ رہوں
	کوئی آئے کہ نہ آئے شاداً بـ
	دے کے صحراء میں اذال، بیٹھ رہوں

غزل

بزرگ ہاتھ تصور میں تھپتھا تے ہیں
گزر چکے ہیں جو ماں باپ یاد آتے ہیں

یہ کیسا شور شراب ہے میرے آنگن میں
 یہ لوگ بیچ میں دیوار کیوں اٹھاتے ہیں
 وہ ساتھ لے گیا سارے گلاب آنگن کے
 ہم اپنے گملوں میں اب کیکٹس اُگاتے ہیں
 ہے جس میں درج ہر لمحے کا حساب کتاب
 ہمارے پاس وہ تنہائیوں کے کھاتے ہیں
 وہ کون ہیں جو کئی منزلوں کے بانی تھے
 وہ کون ہیں جو نئے راستے بناتے ہیں
 بلا ورزی کا برتر ہے ہر تعلق سے
 پرندے اپنے نشیمن بھی چھوڑ جاتے ہیں
 کریں تو کیسے کریں پار آگ کا دریا
 ندی چڑھنے کے نو کنارے بھی ڈوب جاتے ہیں
 خدا معاف نہیں کرتا ایسے بیٹوں کو
 جو ان کے جو ماوں کو چھوڑ جاتے ہیں
 یہ کیسے لوگ ہیں کیا ہو گیا انہیں شادا بـ
 پرانی آگ میں کیوں انگلیاں جلاتے ہیں

ہم نے بھی اب جینے کے دھب سیکھ لیے
 پہلے نہیں سیکھے تھے سو اب سیکھ لئے
 کہاں کہاں سے گزرے ہیں کیا ذکر کریں
 ٹھوکریں کھا کھا کر سب کرتبا سیکھ لئے
 مصنوعی مسکان لبوں پر چپکائی
 لفظوں کے پیچھے کے مطلب سیکھ لئے

دھوکے کھا کھا کر یہ آئی مشائق
 کیا کیا کھیل تماشے یارب سیکھ لئے
 اپنے آپ سے اکثر پوچھا کرتا ہوں
 طور طریقے دنیا کے کب سیکھ لئے
 ساری زندگی یہی سفید و سیاہ کیا
 جو بھی سکھاتے تھے روز و شب، سیکھ لئے
 ہار مان کر جیت گئی دنیا شاداب
 ہم نے سارے داؤ پنج جب سیکھ لئے

زبانِ رقم سے جب گفتگو کی	شکستہ آئینے اور مسخ چہرے
تو بُو آنے لگی تازہ لہوں کی	عجب حالت ہے شہر آرزو کی
ادائے روح تک ہے پارہ پارہ	بس اتنی بات پر تھا حشر برپا
نہیں ہے اب کوئی حاجب رفو کی	شکایت اس کی اس کے روپہ روکی
نہ چھوڑی دشمنی تا عمر، لیکن	وہ میرا اور میں اس کا آئینہ تھا
نہ کی اک دوسرے سے بد سلوکی	برائی کس طرح کرتا عدو کی
لگا شاداب جب دل پر کچو کا	غزل تخلیق ہونے سے نہ چکلی

غزل

متاع و مال نہ دے دولتِ تباہی دے
 مجھے بھی مملکتِ غم کی بادشاہی دے
 میں اپنے آپ کو کیسے نہ سنگسار کروں
 مرے خلاف مرا دل اگر گواہی دے

کھڑا ہوا ہوں میں دستِ طلبِ دراز کیے
 نہ میرے سر کو تو الزامِ کج کلا ہی دے
 میں ٹھہرے پانی کی مانند قید ہوں خود میں
 کنارے توڑ کے کوئی مجھے بہا ہی دے
 کبھی تو لذتِ کام و دہن دو بالا کر
 ہم ایسے فاقہ کشوں کو بھی مرغ و ماہی دے

غزل

آستین میں سانپ پالتا رہتا ہوں
 لوگوں کو حیرت میں ڈالتا رہتا ہوں
 واقف ہوں پھولوں کے سیاستِ دانوں سے
 کانٹے سے کانٹا نکالتا رہتا ہوں
 بازروں میں بھاؤنہ اپنا گرجائے
 کھوٹے سکے ہی اچھاتا رہتا ہوں
 تازہ کرتا رہتا ہوں ماضی کے پل
 زنگ لگے برتن اجالتا رہتا ہوں
 کبھی گزارے تھے جو کسی کی رفاقت میں
 پھٹے پرانے دن سنبھالتا رہتا ہوں
 ترشنا چین نہیں لینے دیتی ہے مجھے
 اندھے کنوں میں ڈول ڈالتا رہتا ہوں
 رفو کیا کرتا ہوں گزشتہ لمحوں کو
 ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جھالتا رہتا ہوں
 انسانوں میں خونے وفا نہیں ملتی
 کئے اسی لئے پالتا رہتا ہوں

امر نہیں گرل پال کی عادت ہے
اسی لئے ساگر کھنگاتا رہتا ہوں

غزل

ہے نیا منظر نئے ایوان میں
سچ رہے ہیں کیکٹش گدران میں
پھر پھڑاتا ہے پرندہ رات کا
دھوپ کی بلی ہے روشن دان میں
اس کو پوجا پاٹھ کرتے دیکھ کر
آستھا پڑھنے لگی بھگوان میں
آرہی ہے اُسے کے ہنسنے کی صدا
گھنٹیاں سی نج رہی ہے کان میں
گھر کا ہر گوشہ متور ہو گیا
وہ نہا کر آگئی دلان میں
تیری چاہت نے برآمد کر لیا
میں پڑا تھا گوشہ نسیان میں
سب نے بھر لیں اپنی اپنی جھولیاں
میں اکیلا ہی رہا نقصان میں
کٹ رہی ہے ایسے اپنی زندگی
جیسے ہورہی کی کٹی گودان میں
اجنبی ہوں اپنے گھر میں اس طرح
اک مہاجر جیسے پاکستان میں

غزل

جسم اور جاں کی اسیری کی ہے
 ایک عالم کی سفیری کی ہے
 ہم ہیں وہ ٹاط نشینِ عالم
 ہم نے شاہی میں فقیری کی ہے
 عمر نے برف لکھی بالوں پر
 یہ عبارت میری پیری کی ہے
 جب کبھی وقت نے بازی پلٹی
 ایک پیادے نے وزیری کی ہے
 بندہ وہ جائے سگ زر ہو کر
 آخری حد یہ امیری کی ہے
 جنْ نے حالات کا رُخ موڑ دیا
 وہ کمک ایک نفیری کی ہے
 اک نیا پھول کھلا ہے گھر میں
 خوشبو آنگن میں پنجربی کی ہے
 عمر بھر اپنے قلم سے ہم نے
 ڈھائی آکھر کی کبیری کی ہے
 ہم نے ایوانِ غزل میں شاداب
 غالبی کی کبھی میری کی ہے

غزل

ہر مری دھر شیام نہیں ہوتا جاناں
 ہر بخواں رام نہیں ہوتا جاناں
 اندر سے باہر آنا ہی پڑتا ہے
 گھر بیٹھے تو نام نہیں ہوتا جاناں
 موت کا وقفہ تو اک عارضی وقفہ ہے
 کومہ، پورن درام نہیں ہوتا جاناں
 عشق سے حسن کی قدر و قیمت بڑھی ہے
 عاشق کوئی غلام نہیں ہوتا جاناں
 کب گھر میں سنائٹا شور نہیں کرتا
 کب دل میں کہرام نہیں ہوتا جاناں
 اک روشن تاریخ بنانی پڑتی ہے
 ہر پیا ساتو امام نہیں ہوتا جاناں
 جانے کس کونے میں وہ ویرام کرے
 ہر دل اس کا دھام نہیں ہوتا جاناں
 شردھا بن پتھر، پتھر ہی رہتا ہے
 ہر پتھر میں رام نہیں ہوتا جاناں



جوش پہ بھر میں مرمر کے گزاری جائے
 زندگی مجھ کو ملی ایسی سزا ہو کر کے
 اک زمانے میں اکیلا ہوں میں بندہ ہو کر
 دونوں عالم میں وہ تنہا ہے خدا ہو کر کے

ظرف نے میرے رکھی لاج بیابانوں کی
 خار زاروں پر چلا آبلہ پا ہو کر کے
 تیری خوشبو سے مہلتا ہے میراغم خانہ
 ابھی آئی ہے تیرے گھر سے صباہر کر کے
 وقت دیمک کی طرح چاٹ چکا تھا اس کو
 کیا پتاوں وہ ملابھی ہے تو کیا ہو کر کے
 سب تو سنتے ہیں مگر وہ نہیں سنتا شاداب
 گونجتا رہتا ہوں گنبد کی صدا ہو کر کے



غزل

پھول، خوشبو، دھنک، شفق لکھنا

جب بھی لکھنا نیا ورق لکھنا
 مجھ کو لکھنے سے کون روکے گا
 ہے بہر حال میر احق لکھنا
 زندگی کا سفر کٹا کیسے
 داستان یہ طبق طبق لکھنا
 صرف انگلی کے ایک اشارے سے
 ہو گیا چاند کیسے شق لکھنا
 یاد کرنا پھر ان وفاوں کو
 پھر وہ بھولا ہو اسپن لکھنا
 ایک پیاسے کی آزمائش میں
 ایک صحرائے لگا ودق لکھنا
 خون دل میں ڈبو ڈبو کے قلم
 وصل اور بھر کا قلق لکھنا

مشکلیں اور بھی ہیں دنیا میں
شعر شاداب کیوں ادق لکھنا



یہ سچ ہے میرا روایت پہ انحصار نہیں
لیکر پیٹتے رہنا مرا شعار نہیں
اسے فضول حوالوں سے زیر بار نہ کر
یہ شاعری ہے میری جان کا رو بار نہیں
مرا کلام ہے آئینہ عصر حاضر کا
جدیدت کا مرے ذہن پر بخار نہیں
جودل میں ہے وہی آخر زبان پہ آئے گا
میں کیا کروں کہ مجھے خود پہ اختیار نہیں
ہے فکر و فن میں مرے زندگی کا ہر پہلو
کسی بھی ازم کا اب تک میں زیر بار نہیں
ہر اک محاذ پہ میں جینے کا عادی ہوں
قبول مجھ کو کسی بھی طرح کی ہار نہیں
کبھی کبھی کوئی پل لازوال ہوتا ہے
ہر ایک شعر کسی کا بھی شاہکار نہیں
میں کیسے وحدت و کثرت میں امتیاز کروں
میں بے شمار ہوں میرا کوئی شمار نہیں
اسی پہ کس لئے مچلتے ہوئے ہوتم شاداب
یہ درد ہے کسی معشوق کا دیار نہیں



غزل

نفی سے اثبات کی طرف آ
 خلاوں سے ذات کی طرف آ
 گریز کیوں کر رہا ہے تج سے
 پھر اپنے حالات کی طرف آ
 اساس آئینیدہ کی یہی ہے
 گزشتہ لمحات کی طرف آ

☆☆☆

تو آسمان ہے تو جھک زمین پر	پھی ہے ایمان کی کسوٹی
تو دن ہے تو رات کی طرف آ	لپٹ کے شبہات کی طرف آ

پیام بن جا ہمارے حق میں	اے ذات کے بے کنار صمرا
کہ اپنی آیات کی طرف آ	پھر اپنے ذرّات کی طرف آ

نہ ختم شاداب کر فسانہ	یہ خالی کا سے بلا رہے ہیں
کہ پھر شروعات کی طرف آ	سخنی تو خرات کی طرف آ

آگے پچھے پانی کھڑا تھا تیچ میں میں تھا
 آئینہ ہر طرف جڑا تھا تیچ میں میں تھا
 گھرا ہوا تھا میں پر چھائیوں کے جنگل میں
 ہر اک سایا مجھ سے بڑا تھا تیچ میں میں تھا
 اندر باہر سننے ہی سننے تھے
 آوازوں کا کال پڑا تھا تیچ میں میں تھا

چڑھا ہوا دریا تھا ہم دونوں کے نیچ میں
 بھرا ہوا پاپوں کا گھڑا تھا نیچ میں میں تھا
 پیدا کر کے بھول گئی تی کتنی دنیا
 کوڑوں پانڈوں میں جگڑا تھا نیچ میں میں تھا
 سب کردار کہانی کے تھے دستوگر بیاں
 دشتِ بلا میں وقت کڑا تھا نیچ میں میں تھا
 سنگِ ملامت کی میرے سر پر بارش تھی
 ہر لمحہ سولی پہ چڑھا تھا نیچ میں میں تھا
 مرگِ جھالا پر لگا رکھی تھی شونے سما دھی
 سامنے اک ترشول گڑا تھا نیچ میں میں تھا
 شعر و خن کی ایک بزم شاداب بھی تھی
 ہر اک شاعر مجھ سے بڑا تھا نیچ میں میں تھا

غزل

ہر گھری آزمائش میں گزری	دن بدن کی تمازت میں
زندگی اپنی خواہش میں گزری	رات زلفوں کی بارش میں گزری

حاصلِ زندگی تھی ہمارے	پاؤں جمنے نہ پائے کہیں بھی
جو گھری ان کی پرسش میں گزری	جتنی گزری وہ گردش میں گزری

رکھ لیا ہم نے پرده کسی کا	عمر دونوں فریقوں کی باہم
لوگ سمجھے نمائش میں گزری	بھول جانے کی کوشش میں گزری
آپ اپنی ہی رخش میں گزری	حیف شادابِ عمر گریزان

کہا جو اس نے، ہمارے دلوں میں تھا شاید
 یہ وصف تو کبھی پیغمبروں میں تھا شاید
 ہو شخص جو کہ مرے دوستوں میں تھا شاید
 وہی غنیم کی اگلی صفوں میں تھا شاید
 جنہیں اجڑ کے شہروں کی داغ بیل پڑی
 سکون قلب انہیں جنگلوں میں تھا شاید
 خود اپنے آپ سے سہا ہوا تھا ہر کوئی
 عجیب سا کوئی سودا سروں میں تھا شاید
 سکون سے جو کسی کو نہ رہنے دیتا تھا
 چھپا ہوا کوئی دشمن گھروں میں تھا شاید
 شحر جو پھول اپھلا تھا پڑوں کے گھر میں
 عجیب ذائقہ اس کے پھلوں میں تھا شاید
 خود اپنی موت کے اسباب کر لیے میں نے
 شریکِ فیصلہ میں بھی جوں میں تھا شاید
 کسی کے ملنے کا امکان نہ تھا جہاں شاداب
 میں گرہی کے انہیں راستوں میں تھا شاید

غزل

وقت بدلا زمانے کے معیار بدلتے مگر ہم نہ بدلتے
 دیکھتے دیکھتے کتنے ادوار بدلتے مگر ہم نہ بدلتے
 ہر زمانے میں دیوانگی کی ادا ہم سے منسوب تھی
 سب نئے اور پرانے گھنگار بدلتے مگر ہم نہ بدلتے
 پشت ہا پشت سے ہم نے خونِ جگر گلستان کو دیا
 پھول بدلتے، چمن بدلا اور خار بدلتے مگر ہم نہ بدلتے

اپنا حصہ ہمیشہ ہمیشہ سے زہر ہلا ہلا رہا
 دیوتاؤں نے کبھی اپنے اطوار بدے مگر ہم نہ بدے
 اس طرف میں نے سب کچھ ترے واسطے جان جان تجھ دیا
 اس طرف تجھ سے سارے طرف دار بدے مگر ہم نہ بدے
 آپ اپنی خبر سے رہے عمر بھر دوستو بے خبر
 صحیح اور شام کے سارے اخبار بدے مگر ہم نہ بدے
 نت نئے پانیوں کا سفر ہم کو شاداب درپیش تھا
 ناخدا کشتیاں اور پتوار بدے مگر ہم نہ بدے



اجاڑ اجاڑ بدن اور بجھا بجھا چہرہ	کہاں فنا ہوئے حالاتر کے جہنم میں
یہ آئینے میں ہوں میں اور یہ میرا چہرہ	لختی ڈال سا جسم اور پھول سا چہرہ

پسند ہو کہ نہیں ہو نباہ کرنا ہے	پلک جھکتے پرانا پُرانا لگتا ہے
نصیب میں تو یہی ہے بُرا بھلا چہرہ	بڑھ کے دیکھ لیا ہر نیا نیا چہرہ

ہزاروں بھولنا چاہا مگر نہیں بھولا	بچھڑ گیا تھا جو ماضی کے راستوں میں کبھی
کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا وہ گمشیدہ چہرہ	جھکی جھکی وہ نگاہیں جھکا جھکا چہرہ

تقاضہ وقت کا شاداب ہے یہی، منڈھلو	تم اپنے چہرے پہ اک اور دوسرا چہرہ
-----------------------------------	-----------------------------------



غزل

سب ہیں سفر میں رختِ سفر کس کے پاس ہے
 سایا ہے کس کے پاس شجر کس کے پاس ہے
 وہ کون ہے جو مجھ کو بتائے مرا پتہ
 میں بے خبر ہوں میری خبر کس کے پاس ہے
 دل کی جراثتوں کی نمائش بھی ہے فضول
 آنکھیں ہیں کس کے پاس نظر کس کے پاس ہے
 خود اپنے سامنے کی جسارت ہے کس کے تینیں
 خود اپنے احتساب کا ڈرکس کے پاس ہے
 اس بزم ہے بصر میں بصیرت ہے کس کے پاس
 اس شہر بے ہنر میں ہنر کس کے پاس ہے
 کس کو پڑی ہے، کون کرے اس کا فیصلہ
 بھوکا ہے کون، لقمهٗ ترکس کے پاس ہے
 یہ قرض کا جہان یہ مانگنے کی زندگی
 یوں تو ہے سب کے پاس مگر کس کے پاس ہے
 مٹی کے اس طلسم سے ہے ہے کون ماورا
 سب گھر کے آس پاس ہے گھر کس کے پاس ہے
 کرنے کو سب ہی کرتے ہیں شاداب شاعری
 الفاظ کس کے پاس اثر کس کے پاس ہے

غزل

بھولے بسرے جب یاد آنے لگتے ہیں	دنیا اُس پر وہ دنیا پر ہنستا ہے
سے کے پچھی پر پھیلانے لگتے ہیں	دیوانے کو سب دیوانے لگتے ہیں

ملنا پچھڑنا کھونا پانا دکھ اور سکھ
دوراتوں میں نشہ ہرن ہو جاتا ہے
جبون کے سب تانے بانے لگتے ہیں
دودن میں دونوں اکٹانے لگتے ہیں

یادوں کی آندھی جب چلنے لگتی ہے
بیٹھے ہٹھائے جانے کیا ہو جاتا ہے
خالی رستے دھول اڑانے لگتے ہیں
شہر کے شہر ہی پاگل خانے لگتے ہیں

جب میں رات گئے گھرو اپس آتا ہوں
تہائی چپ چاپ سکنے لگتی ہے
سب خالی کمرے چلانے لگتے ہیں
اور سنائی شور مچانے لگتے ہیں

تہائی پر کر ماضی حال اور مستقبل اپنا اپنا رنگ جمانے لگتے ہیں

☆☆☆

ہم اپنے عہد میں جنش فضول بن کے رہے
یہودیوں میں خدا کے رسول بن کے رہے
روایتوں سے گریزاں رہے، جیسے جب تک
گلاب زادوں میں تہابول بن کے رہے
ہم ایسے لوگوں سے پوچھو جیات و موت کا فرق
یزیدیوں میں بھی ابن بتول بن کے رہے
رہے جہاں بھی، رہے تیقّنی کے پروردہ
خود اپنے گھر میں بھی صحرائے پھول بن کے رہے
ہے شاعری وہی شادا ب جو بہ ہر صورت
لبوں پہ شعر، دلوں میں اصول بن کے رہے

زلف جھرنے کی طرح جسم ہے صندل کی طرح
ایک جادو ہے ترے حسن میں جنگل کی طرح

جس کو بھولے سے کبھی منہ نہ لگایا تم نے
 گھومتا رہتا ہے وہ آدمی پاگل کی طرح
 دم بہ دم سرد ہوتی جاتی ہے بزمِ ہستی
 دوستو فریز میں رکھی ہوئی بوتل کی طرح
 آج تک وقت کے پتپتے ہوئے صحراؤں میں ہمیں
 کوئی سایانہ ملا آپ کے انجل کی طرح
 اپنے سینے میں سرابوں کا سمندر لے کر
 کب سے آوارہ ہوں سوکھے ہوئے بادل کی طرح
 دونوں حالات کے مارے ہیں، اسے کیا کہیے
 آپِ ڈینیتی کی مانند ہیں نل کی طرح
 ایک ناکام تک ودو کے سوا کچھ بھی نہیں
 آج کا دن بھی ہے شاداب وہی کل کی طرح

غزل

آگ، تو، چولہا، چکلا، بیلن، روٹی
 ایک اکیلی اور کتنے بندھن روٹی
 چاند سریکی اور کبھی سورج جیسی
 اماں کے ہاتھوں میں ہے روشن روٹی
 شام سوریے سوندھی سوندھی خوشبو سے
 مہکاتی رہتی ہے گھر آنگن روٹی
 کہیں بنی بنیاد عبادت گاہوں کی
 اور کہیں پر چوراہی آسن روٹی
 انسانوں کی سب سے پہلی محبوبہ
 فن کاروں کا سب سے پہلا فن روٹی

نیل کنٹھ پیدا ہوتے ہیں دنیا میں
 کرواتی ہے جب امرت منقحسن روئی
 گول گول ہے بھابی کے نخزوں جیسی
 اماں کی ممتا جیسی پاؤں روئی
 جنم جنم جو ساتھ نبھایا کرتا ہے
 پر ش پر کرتی کا ایسا بندھن روئی
 یہی زندگی کی شادا بھانت ہے
 لتی دیتی رہتی ہے جیون روئی

☆☆☆

غزل

چڑھا کہیں پر اور کہیں اُترا پانی
 رنگ بدلتا رہتا ہے کیا کیا پانی
 مرجائے گا جس دن آنکھوں کا پانی
 جھوٹا ہو جائیے گا ہر سچا پانی
 سورج نے جب ساگر کے لب چوم لیے
 بادل بن کر دھرتی پر برسا پانی
 کیا میرے سر سے اونچا ہو جائے گا
 بول رہی مجھلی باقی ہے کتنا پانی
 تیری زلفوں سے دریا سیراب ہوا
 تیرے بدن کی خوشبو سے مہکا پانی
 پاؤں اکھڑ جاتے ہیں اچھے اچھوں کے
 روک سکا ہے کون بھلا بہتا پانی
 بوند بوند کوترس رہا ہے بھاگیرتھ
 پلا رہی ہے دنیا کو گنگا پانی

دونوں اپنے جنم جنم کے ساتھ ہیں
 کوٹھ کی مائی اور چمبل کا پانی
 کہتا ہے بہتا دریا مجھ سے شاداب
 بدبو دینے لگتا ہے ٹھہرا پانی

☆☆☆

آپ اپنی نظیر سی چمبل جھولیاں بھرتی ہے مرادوں سے
 کوٹھ رانجھا سا ہیر چمبل جا بجا دست گیری چمبل

چاندنی رات میرے پہلو میں بٹ رہی ہے ہزاروں نہروں میں
 ایک ناری شریر سی چمبل ہر طرف لہر لہر سی چمبل

اپنے فرہاد کی تلاش میں ہے جلا و جمال کی مظہر
 ہائے یہ جوئے شیر سی چمبل فکرِ اقبال و میر سی چمبل

عہد حاضر کیجیسے روحِ رواں ختم ہوتا نہیں ہے فیضِ اس کا
 عہدِ نو کے ضمیر سی چمبل پانچالی کے چیر سی چمبل

اپنی غزلوں میں ڈھل گئی شاداب مصرعِ مصرع کبیر سی چمبل

☆☆☆

غزل

زمیں پر آسمان آثار برگد جڑیں اس کی بہت گہرائی تک ہیں
 خدا کی طرح سایادار برگد اگا ہے روح میں چھتنا ر برگد

ہماری لوک گا تھاؤں کا مرکز شرن میں، میں بھی تیری آگیا ہوں
رہا ہے بے درد دیوار برگد لگا میرا بھی بیڑا پار برگد

ہے دادی جیسی اس کی ٹھنڈی چھاؤں قلم، کاغذ، تختیل روشنائی
ہے دادا جیسا ڈاڑھی دار برگد دھنک، وادی، نوی، کو سہار برگد
لبوں میں بھی منتظر شاداب کب سے مجھے بھی ہو مرا دیوار برگد

☆☆☆

لمحہ لمحہ مرگِ مسلسل ہے اپنا چیتوں کی آنکھیں روشن ہیں ہر جانب
جیون ناگ پھنی کاجنگل ہے اپنا دل نجانے ڈر سے بوچل ہے اپنا

استادہ ہوں حال کے پتے صحراء میں لاحاصل کو حاصل کرنا چاہے ہے
گزر اکل ہی آئندہ کل ہے اپنا یہ بیراگی من ہی پا گل ہے اپنا

کیسے برسوں تیری پیاسی دھرتی پر ہمیں تو پنا کوٹا کوفہ جیسا ہے
آندھی کے کاندھوں پر بادل ہے اپنا اور فرات کے بد لے چمبل ہے پنا

تھا پیڑ ہوں میں شاداب پیام کا گھر اہوا سانپوں میں صند ہے اپنا

☆☆☆

غزل

بنکر ریں ہمیشہ ہمیشہ پہلیاں
مجھ پر نہ کھل سکیں کبھی میری ہتھیلیاں
نزدیک جاؤ گے تو پلٹ کر نہ آؤ گے
زندہ طسم ہیں یہ پرانی حولیاں

ایسا لگا کہ تاروں کے جھرمت میں چاند ہے
 گھرے میں اسکو لے کے چلیں جب سہیلیاں
 زفیں ہیں اسکی جیسے خزانے کی ناگنیں
 اس کا شباب جیسے اشرفی کی تھیلیاں
 یاد آرہی ہیں آج بھی انکی عنایتیں
 لودے رہی ہیں آج بھی میری ہتھیلیاں
 بھولے نہیں ہیں اب بھی وہ شاداَب رتیجے
 وہ دودھ کی کٹوریاں وہ گڑکی بھیلیاں

☆☆☆

غزل

دیواریں دلان کھڑکیاں	ہر آہٹ پر کھل جاتی ہیں
کتنی ہیں نادان کھڑکیاں	چھچھ روشن دان کھڑکیاں

کرتے ہیں سجدے دروازے	ڈوب گئی ہیں سناؤں میں
کتنی خوش الحان کھڑکیاں	پڑھتی ہیں قرآن کھڑکیاں

ہر اک گھر میں کاٹ رہی ہیں	ہر آنے جانے والوں پر
کرتی ہیں احسان کھڑکیاں	دروازوں کے کان کھڑکیاں

پیتا ہے سگرٹ دروازہ غزلوں کے اشعار جھروکے
 چبارہی ہیں پان کھڑکیاں نظموں کے عنوان کھڑکیاں
 کرتی ہیں شاداَب مرتب
 غزلوں کی دیوان کھڑکیاں

☆☆☆

غزل

صحیح ہوئی مرے کمرے میں آئی دھوپ
 دیکھ کے مجھ سے لپٹ گئی تنہائی دھوپ
 ایک کھڑکی نے جھک کر اُسے سلام کیا
 کپڑے سکھانے جب جب چھت پر آتی دھوپ
 روز سوریے پاؤں جلی بلی کی طرح
 گھر گھر جھانکتی پھرتی ہے ہر جائی دھوپ
 خاموشی سے سورج کی انگلی کپڑے
 ناپ رہی ہے پر چھائی پر چھائی دھوپ
 بال بکھرے مٹی جون کے موسم میں
 دیتی پھرتی ہے گرمی کی دہائی دھوپ
 اکثر میں نے اک لڑکی کے تصور میں
 اوڑھی دھوپ لپٹی دھوپ بچھائی دھوپ
 پیچھا کرتے رہتے ہیں بادل لڑکے اس کا
 کرنے جاتی ہے اسکوں پڑھائی دھوپ
 سردی نے آکر یہ اچھا کام کیا
 ساڑی کے بدلتے اس کو پہنانی دھوپ
 اب تو یہی اشعار ہیں میرا سرمایہ
 اب تو یہی شاداب ہے میری کمائی دھوپ



غزل

آک کادریا ڈوب کے پار کیا جائے
 آؤ اُسے اب سچا پیار کیا جائے

کیا رکھا ہے جھوٹے سچے لفظوں میں
 خاموشی سے ہی اظہار کیا جائے
 لمس کی لذت پھر کو پکھلا دے گی
 چھوکر اس ناری کو نار کیا جائے
 پورپور سے پڑھنے والے پڑھ لیں گے
 اس کے بدن کو ہی اخبار کیا جائے
 عمر گزاری سچے عشق کے چکر میں
 اب تھوڑا سا کا روبار کیا جائے
 شاید اپنے آپ میں ہو اپنا دشمن
 آج پلٹ کر خود پر وار کیا جائے
 عام روشن سے ہٹ کے چلا جائے شاداب
 کچھ اونچا اپنا معیار کیا جائے



غزل

تو ہے اک موچ روائی اور میں ہوں پھر گھٹ کا
 لکھ رہے ہیں دونوں افسانہ ندی کے پاٹ کا
 اندر اندر کٹ گئے دونوں کنارے دور تک
 بہتے دریا کو کہاں احساس اپنی کاٹ کا
 لوٹ آئیں اجڑے گھر میں پھر سے روٹھی رونقیں
 آگیا اک اجنبی جب سے نزالے ٹھٹ کا
 تیری اک نظر غلط انداز یہ کیا کر گئی
 تجھ سے مل کر اب کوئی گھر کا ہے اور نہ گھٹ کا
 پوچھتے کیا ہو کہانی خانماں بر باد کی
 ایک مٹی کا گھروند اجس پہ پردہ ٹاٹ کا

جانے والے ہو گیا ہے تیری یادوں کے طفیل
دل کا عالم، جیسے اک قصبے میں منظر ہاٹ کا
اب بھی اپنا سیڑھیاں چڑھنا اُترنا یاد ہے
دل پر اب بھی نقش ہے قصہ حطب کی لاث کا



غزل

فکرِ سود وزباں میں رہتا ہوں ہر نفس این وآل میں رہتا ہوں
ہوں دیاں یقین کا پروردہ شہر وہم گماں میں رہتا ہوں

شام کی آرتی میں ہوں شامل
لفظ بن کر نکلتا ہوں منہ سے
اور صبح کی اذال میں رہتا ہوں
تیر بن کر کمان میں رہتا ہوں

ماورائے گرفتِ حرفا و هنر
آپ اپنے خیال میں ہوں گم
میں ہر آک داستان میں رہتا ہوں
آپ اپنے جہاں میں رہتا ہوں

صید کب کر سکا ہے کوئی مجھے
لوچ بن کر رچا ہوں لجھے میں
قید کب جسم و جاں میں رہتا ہوں
سوچ بن کر زبان میں رہتا ہوں

میر پر چھائیاں زمین پر ہیں
ان کوشاید ابھی نہیں معلوم
اور میں آسمان میں رہتا ہوں
میں بھی ہندوستان میں رہتا ہوں

قهر برپا ہے سرپہ سورج کا
حرمتِ حرفا کا ہوں گرویدہ
جسم کے سائبائیاں میں رہتا ہوں
اور خطِ رایگاں میں رہتا ہوں
آپ اپنے وجود میں شاداب
آپ اپنی اماں میں رہتا ہوں

غزل

شاید کوئی کمی مرے اندر کہیں پہ ہے
 میں آسمان پہ ہوں مرا سایا زمین پہ ہے
 ہے ضبط شوق پر ہی، نہ دنیا و دیں پہ ہے
 دیوانگی کا قرض میر آستین پہ ہے
 افسانہ حیات کا ہر ایک سانحہ
 تحریر حرف حرف ہمارے جبیں پہ ہے
 اس طرح فاصلوں پہ ختم پاچ کا ہوں میں
 اک پانو آسمان پہ ہے اک زمین پہ ہے
 یوں جی رہے ہیں سخت اذیت کے باوجود
 دارو مدار زیست کا جیسے ہمی پہ ہے
 جنت خدا ہی جانے کہاں ہے کہاں نہیں
 مجھ کو یقین ہے کہ جہنم بیہیں پہ ہے



غزل

خاکِ اسلاف پہ میں رقصِ شر کرتا ہوں
 باپِ دادا کی وراثت پہ سیر کرتا ہوں
 پیاس کی آگ میں تب تپ کے ہوا ہوں گندن
 ایک مدت سے سرابوں کا سفر کرتا ہوں
 وقت کی دھوپ کو لفظوں کی ردا پہنا کر
 شاخِ بے برگ کو چھٹنا رشحر کرتا ہوں
 میری فطرت میں ہیں موجود یہ دونوں جو ہر
 خیر کرتا ہوں کبھی اور کبھی شر کرتا ہوں

سچ کو سچ کہنے کی عادت نے کیا ہے رسوا
 میں تو لے دے کے ہیں ایک ہنر کرتا ہوں
 دوسرا کوئی نہیں ہے میری خلوت کا شریک
 اپنے ادراک کو اپنی ہی خبر کرتا ہوں
 ہے یہی غیرت آدم کا تقاضا شاداب
 کام کرنا نہیں آتا ہے مگر کرتا ہوں



غزل

کمروں سے دروازے ناخوش دالانوں سے صحن خفا
 مل جل کر سب سوچو آخر ایسے گھیر کا کیا ہوگا
 میرے گھر کے آنکن میں تھی جون کی تیقتوں دوپہری
 وہ اپنے آپ نہیں تھی میں اپنے آپ میں نہ تھا
 سارے سائے سمٹ سمٹ کرسورج میں تخلیل ہوئے
 میرے اندر سے جب کوئی سایہ سایہ چلا یا
 ماضی، حال اور مستقبل میں بال برابر فرق نہیں
 میں ہی اپنا باپ تھا شاید میں ہی ہوں اپنا بیٹا
 میں نے جب دیکھا ہے دنیا انڈھی بہری گونگی ہے
 باہر سے بدلت ہو کر میں اپنے اندر ڈوب گیا
 میری آنکھوں کے طاقوں میں سلگ رہی ہے تنہائی
 میرے سینے کے گنبد میں گونج رہا ہے سناؤ
 مری آنکھیں جھوٹی تھیں یا ہر جانب آئینے تھے
 ہر چہرے میں گویا میں نے اپنا ہی چہرہ دیکھا
 بنٹا ہوا ہوں دو حصوں میں شاداب نہ جانے کیوں
 دل میں مرنے کی خواہش اور سر میں جینے کا سودا

غزل

کشمن کی طرح تن آراستہ
 سونے چاندی سا بدن آراستہ
 کھل گئی ماضی کے خوابوں کی دھنک
 ہو گیا یادوں کا بن آراستہ
 اس طرح وہ آگئے آغوش میں
 جیسے کرسی میں کشن آراستہ
 بن سنور کر آگئے وہ بام پر
 ہو گیا شہر سخن آراستہ
 میری پیشانی پہ بل حالات کے
 اس کی ماتھے پر شکن آراستہ
 اس طرف وارقی دیوانہ وار
 اس طرف دار ورسن آراستہ
 کرتے ہیں ماں باپ دے دے کر جہیز
 اپنی بیٹی کا کفن آراستہ
 کر رہے ہیں جابہ جاہل ہوں
 محفلِ داغ وزعن آراستہ
 ایسے کی شاداَب پوری یہ غزل
 جیسے ہوتی ہے دُلہن آراستہ



غزل

مجھ میں اب تک پہلا وحشی زندہ ہے
 نفس نفس میں میراخونی زندہ ہے

تھہ کے اوپر مایا مودہ کا ہے مرگٹ
 گھرائی میں سچا پانی زندہ ہے
 چھٹ کراپنے دریا سے ہر پل مجھ میں
 تڑپ رہی ہے لیکن مجھلی زندہ ہے
 پہلے پہلے ڈاکے میں جو کھوئی تھی
 آج تک وہ تن کی پونجی زندہ ہے
 جنگ میں میرے ہاتھوں قتل ہوا تھا جو
 شکل میں میری اب وہ سپاپی زندہ ہے
 جس کو دشمن کی فوجوں نے روند دیا
 وہ ہستی اب بھی کلموہی زندہ ہے
 مردہ ہے یہ تیرا یک رنگ آکاش
 میری رنگ برلنگی دھرتی زندہ ہے
 گھوم رہا ہوں جان ہتھیلی پر رکھ کر
 آئے میرے سامنے جو بھی زندہ ہے



غزل

انگت جلوے ہیں منظر ایک ہے سامنا دو دشمنوں کا ہے، مگر
 پیرین لاکھوں میں بکر ایک ہے زندگی اور موت کا ڈر ایک ہے

آئینے ہی آئینے ہیں ہر طرف اپنے گھر میں اس لئے ہوں اجنبی
 اور مرے ہاتھوں میں پتھر ایک ہے میر اندر اور باہر ایک ہے

اپنی طغیانی سے میں غرقاً ہوں ہر طرف ہے بارشِ سنگ ہوں
 مجھ کو صحراء اور سمندر ایک ہے اور میرے دوش پر سر ایک ہے

آسمان کی سر پہ چادر ایک ہے
پاؤں کے نیچے زمیں بہت



غزل

عجیب چال سمندر سے چل گیا دریا
کنارے توڑ کے باہر نکل گیا دریا
نہ ڈوبنے کی دی مہلت نہ پار لگنے کی
ہمارے ہاتھ میں آکر پھیل گیا دریا
ہماری سمت زمانے کی انگلیاں اٹھیں
قریب آکے جو رستہ بدل گیا دریا
قدم قدم تھا نشیب و فراز کا عالم
کبھی گرا کبھی گر کر سنبھل گیا دریا
خود اپنی ذات کے گرداب میں پھنسا اک دن
خود اپنی آگ میں اک روز جل گیا دریا
کبھی کبھی کسی گاگرنے بھر لیا ساگر
کبھی کبھی کسی قطرے میں ڈھل گیا دریا
ہماری پیاس کا اور اس کے ظرف کا شاداب
ہوا جو سامنا پنج کر نکل گیا دریا

زیست ہمارے حق میں کیا ہے میرا سونا بھی ہے مٹی
ایک انوکھی ویں کنیا ہے اس کی مٹی بھی سونا ہے

کیسا مکہ متھر اکعبہ کاشی ہے
من بیراگی اپنا تو سنیا سی ہے

یارو آخر کس کا وشواس کریں
 جس کو دیکھو اس کا چلن سیاسی ہے
 جنم جنم سے کوٹا اپنا مقتل ہے
 میں چمبل کا چمبل میری پیاسی ہے
 یہ تو اچھی خاصی وش کنیا نکلی
 ہم سمجھتے تھے دنیا اپنی داسی ہے
 اس کو کھو کر سب ہنگامے ختم ہوئے
 ذرے ذرے پر اب گھورا داسی ہے
 جانے والا ہاتھ جھٹک کر چلا گیا
 اب تو رونا دھونا بارہ ماںی ہے
 اپنے جذبوں پر بھی روں پڑی شاداب
 اس کی زلفوں کا بھی رنگ کپاسی ہے



غزل

کیسا پانا کیسا کھونا مائی کا	ہاتھوں کے طو طے ارجائیں گے اس دن
ٹوٹے گا اک روز کھلونا مائی کا	ہوجائے گا جس دن گونا مائی کا

رمتے جوگی پہلے پانی ہیں لوگ	کستوری سی مہک رہی ہے چاروں اور
چلانہ ہم پر جادو ٹونا مائی کا	چھان رہا ہوں کونا کونا مائی کا

قدم قدم پر سانس اکھڑنے لگتی ہے	جم جنم سے یہی کہانی ہے اپنی
کھیل یہیں ہنس ہنس کے ڈھونا مائی کا	وہی اوڑھنا وہی بچھونا مائی کا

بُسی ہوئی ہے تلسی کی خوشبوگھر میں جیون بھر کی پونچی پل میں خاک ہوئی
 رچا ہوا ہے روپ سلو نامائی کا ہائے اکارت گیا شجون نامائی کا
 نیچ میں چڑھتا دریا حائل ہے شاداب ~
 پار گے گا کیسے دونا مائی کا



غزل

ناسمجھوں کو جب ہم سمجھنے نکلے
 اندھوں کو آئینہ دکھلانے نگلے
 آگ لگانے آئے تھے جو میرے گھر
 وہ سب چہرے جانے پہچانے نکلے
 مندر مسجد کی بنیاد دیں کانپ اٹھیں
 نچے جب ماڈل کو دفنانے نکلے
 پہچانے کے جب لا ج نہ اپنی بہنوں کی
 کیسے بھائی را کھی بندھووانے نکلے
 شہرت کے بھوکے لعشوں کے سوداگر
 اخباروں میں خبریں چھپوانے نکلے
 شہر میں گویا مرگھٹ کا سننا ٹا تھا
 اپنے کیسے پر جب ہم پچھتانے نکلے
 ایک خدا کی بستی جل کر راکھ ہوئی
 چند محاذ فتنگیں تانے نکلے
 ان پر کیسے پورے اترو گے شاداب ~
 نئے نئے مذہب کے پیانے نکلے



غزل

تارکول کی تپتی سڑکیں اور برهنہ پائی ہے
 زندہ رہنے کی مجبوری مجھے کہاں لے آئی ہے
 میں نے جس کا خون پیا اور جس نے مجھ پر وار کیا
 وہ بھی میرا بھائی تھا یا رویہ بھی میرا بھائی ہے
 آسمان کے منہ پر تھوک دیا ہے میں نے گھبرا کر
 دھرتی ماں کی کوکھ مجھے پیدا کر کے شرمائی ہے
 چلو دوچلو کے غوطہ خوروں سے یہ کیا کہنا
 نیچے اتحلاپائی ہے اور اوپر گھری کائی ہے
 میں اپنے ماضی کو اب تک بھول نہیں پایا شاید
 اک ننھی منش پچی نے تیری یاد دلائی ہے
 اب لے دے کے اپنے پاس بچاہی کیا ہے جگ والو!
 ہونٹوں کی خاموشی ہے اور آنکھوں کی گویائی ہے
 کون کرے انصاف ہمارا وابستہ کوئی نہیں
 میر جانب میں تھا ہوں اس کی طرف خدائی ہے



غزل

غیر کا سوئٹر کوئی تنہارہا
 کر چیاں خوابوں کی چتنا رہا
 کر گیا کھوٹا جسے کوئی سخنی
 مختلف ہاتھوں میں وہ بختتا رہا
 جو نہیں بولا کبھی اک حرف بھی
 زندگ بھر میں اسے سنتا رہا

لے اڑا کوئی بساطِ زندگی
وقت کج رفتار سرودھنترہا
خواب گہہ سرگوشیان کرتی رہی
اور کچن سن سن کے جل بخترا رہا
کرگیا شاداب گل افشاںیاں
اور زمانہ خوشبوئیں چتنا رہا



غزل

ردیقوں قافیوں بحروں سے خون ٹپکے گا
غزل کھوں گا تو لفظوں سے خون ٹپکے گا
ہمارے عہد کی تاریخ جب رقم ہوگی
قلم سے، حروف سے، صفحوں سے خون ٹپکے گا
کچھ ایسے حد اُتے گزرے ہیں میری نظر وہ سے
ہمیشہ اب میری آنکھوں سے خون ٹپکے گا
لکھوں گا پچ کو کتابیں جلا دی جائیں گی
کروں گا ضبط تو پوروں سے خون ٹپکے گا
وہ دن بھی آئے گا جسموں کے اس جہنم میں
کٹی پٹھی ہوئی روحوں سے خون ٹپکے گا
اسی طرح سے فسادوں میں گھر جلیں گے اگر
رجیم تلسی کے دوہوں سے خون ٹپکے گا
وہ دن بھی آئے گا مذہب کے نام لیواوہ
جب آسمانی صحیفوں سے خون ٹپکے گا
گلی جو مہربان وہیان پر شاداب
اشاروں اور کنایوں سے خون ٹپکے گا

غزل

شاخ پر ایک بھی پتہ نہیں رہنے دوں گا
 پیڑ کے ساتھ میں سایا نہیں رہنے دوں گا
 وقت یہ کہہ کے رعنوت سے گزر جاتا ہے
 جیسا تو ہے تجھے ویسا نہیں رہنے دوں گا
 دل میں رہنے نہیں دوں گا میں کوئی بھی خواہش
 جیب میں ایک بھی پیسا نہیں رہنے دوں گا
 کوئی کرتا ہے یہ سرگوشی مرے اندر سے
 تجھ کو ہرگز میں اکیلا نہیں رہنے دوں گا
 اتنا رشتہ نے ستایا ہے کہ اب سوچتا ہوں
 جسم کے ساتھ بھی رشتہ نہیں رہنے دوں گا
 ہاتھ میں اب مرے جو ہر کی توانائی ہے
 اب میں دنیا! تجھے دنیا نہیں رہنے دوں گا
 میں نے سوچا ہے کہ جینا ہے مجھے مرکر بھی
 وقت کہتا ہے کہ زندہ نہیں رہنے دوں گا
 میں نے مانا کہ میں اک ڈوبتا سورج ہوں، مگر
 اپنے سائے کو میں چھوٹا نہیں رہنے دوں گا
 ابھی شاداَب یہ فہرست بہت لمبی ہے
 کیا بتاؤں کہ میں کیا کیا نہیں رہنے دوں گا



غزل

کھوکھلے الفاظ کی بھریا یوں میں کٹ گئی
 عمر ساری قافیہ پیاسیوں میں کٹ گئی

خون کے رشتوں نے مل کر خون دلوایا بہت
 میری بھی یوسف کی طرح بھائیوں میں کٹ گئی
 سستی شہرت کے لئے کیا کیا نہ کچھ کرنا پڑا
 اشرفتی سی زندگی کچھ پائیوں میں کٹ گئی
 ایک اپنے نے بھری دنیا میں تہا کر دیا
 عمر سناؤں میں اور تہائیوں میں کٹ گئی
 اتفاقاً اک میں ہی اجنبی تھا شہر میں
 کیا بتاؤں کس طرح بلوائیوں میں کٹ گئی
 گر گیا ہے آج کل کس درجہ معیار سخن
 مجھ سے اک ناداں کی دانایوں میں کٹ گئی
 سانس کے ہمراہ سورج کا سفر جاری رہا
 اور بچاری زندگی پر چھائیوں میں کٹ گئی
 گورہا شاداب غالب میں حریفوں پر مگر
 میری اپنے آپ سے پسپائیوں میں کٹ گئی

غزل

دوستی آزمانے نکلا تھا اپنے خوں میں نہا کے لوٹا ہوں
 کھوٹا سکھ چلانے نکلا تھا گھر سے گنگا نہانے نکلا تھا

ہم نے رہبر سمجھ لیا اس کو چھوڑ آیا ہوں اپنے نقشِ قدم
 غیر کا گھر جلانے نکلا تھا نقشِ ہستی مٹانے نکلا تھا

جنگ کی نذر ہو گیا جو شخص دفن ہوں آپ اپنے ملے میں
 امن کے گیت گانے نکلا تھا گھر پروئی کا ڈھانے نکلا تھا

سمٹا سمٹا ساخود میں ہوں شاداب ساری دنیا پہ چھانے نکلا تھا



غزل

سب خشک و تر داخل خارج صفحہ صفحہ کیا کرتا ہوں
سارا منظر داخل خارج اکثر اکثر داخل خارج

مٹا مٹا کر لکھتا ہے وہ ہر سورشہ روک رہے ہیں
حرف مکرر داخل خارج دیوار و در داخل خارج

اپنے ہی ہونے کی گواہی آگے چھپے دائیں بائیں
اندر باہر داخل خارج نیچے اوپر داخل خارج

آئینہ آئینہ عالم پوج رہا ہوں اپنی صورت
پیکر پیکر داخل خارج پھر پھر داخل خارج

بہت ہوا شاداب یہ قصہ اب تو بس کر داخل خارج



غزل

چند انفاظ کا ذخیرہ ہے
اور کیا زندگی میں رکھا ہے
رنج راحت کا ماجرا مت پوچھ
لوٹ میں اپنا اپنا حصہ ہے
کیا کروں فخر علم و حکمت پر
میرے اجداد کا یہ ورثہ ہے

پڑھ سکا کب کوئی کتابِ حیات
 ایک اک ہر ف کرم خورده ہے
 یہ خبر سن کے مطمئن ہوں میں
 وہ بھی میری طرح اکیلا ہے
 ایسے لکھا ہے اس نے خط مجھ کو
 جیسے تقدیر کا نوشته ہے
 آئینہ دیکھ کر پریشان ہوں
 جانے کس کا یہ مسخ چھرا ہے
 میری دشمن ہے خود مری وحشت
 میں نے خود اپنا گھر جلا یا ہے
 لعуш کی صدائیں آتی ہیں
 نقچ دریا میں کون پیاسا ہے



نظمیں

[آدمی نما]
 کا انس اک ایک گوشے سے مسلسل
 میرا پنے دانت مجھ پر ہنس رہے ہیں
 میری آنکھیں میز پر رکھی ہوئی ہے
 اور مجھ کو تک رہے ہیں
 کان میرے، میرے سر ہانے دھرے ہے
 اور مجھ کو سن رہے ہیں
 ناک پہلے تھی کبھی چھرے کی زینت
 اب نہیں ہے

جانے کتنی بارا ب تک کٹ چکی ہے
 بال میرے ایک کھوٹی پڑیں گے ہیں
 فارغ البابی پہ میری خندہ زن ہیں
 ہاتھ میرے ایک کونے میں کھڑے ہیں
 پانو بوسیدہ شکستہ اور تکن سے چور
 دروازے کی چوکھٹ پر پڑے ہیں
 وقت اک دیوار سے چپکا ہوا ہے
 اور بے رحمی سے گردش کر رہا ہے
 رات کا پچھلا پھر ہے
 میں کئی ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گیا ہوں
 گویا میں اک آدمی سے
 بخ زدہ ہے جان کمرہ بن چکا ہوں
 روز مرہ کی طرح سے
 صحیح سورج

سارے کل پر زے دوبارہ جوڑ دے گا
 اور میرے نام کی تختی لگا کر
 مجھ کو میرے گھر سے باہر چھوڑ دے گا



نیند

رات کی رِدا اوڑھے سورہا ہے سناؤ ٹا
 اوگھتے درختوں پر کلپکی سی طاری ہے
 خاموشی کے ہونٹوں پر لوریاں تھرکتی ہیں
 ہر خیال بوچل ہے، ہر نگاہ بھاری ہے

سارے شہر کی سڑکیں موحِ استراحت ہیں
 قمچے بھی راہوں کے نیند سے سلکتے ہیں
 ہوٹلیں بھی سوتی ہیں میکدے بھی ویراں ہیں
 گرچہ مندر مسجد سوئے ہوئے لگتے ہیں
 کنواریوں کے کمرے بھی، دلہنوں کے حجے بھی
 اب تو ایسا لگتا ہے تھک کے سو گئے ہوں گے
 الغرض سمجھی اپنی اپنی خواب گاہوں کے
 ریشمی انڈھیروں میں جذب ہو گئے ہوں گے
 تم بھی اجنبی گھر میں کب کی سوچکی ہو گی
 آہ جانے کیوں آخر مجھ سے نیند برہم ہے
 اب خدا کرے مجھ کو یاد بھی نہ آؤ تم
 تم سے دور زندہ ہوں یہ سزا بھی کیا کم ہے
 میں بھی ایک دن تھک کر چور ہوئی جاؤں گا
 موت بن کے آئے گی نیند، سوتی جاؤں گا



میرے وجود کے سند بادنے	کہیں کوئی پرسان نہیں تھا
ہفت اقليم کا سفر کیا ہے	جینا کچھ آسان نہیں تھا
سات سمندر ناپ لئے ہیں	تھک کر چور ہو گیا ہے اب
کتنے جزیرے چھان لئے ہیں	آخربی سانس لے لیا جانے کب
کبھی پرندے کے پنجوں میں	ایسے میں اک آخری لمحہ
کبھی طلسماں کے پھندوں میں	سفر آٹھواں کرنا ہے اب
کبھی یہاں پر، کبھی وہاں پر	جان سے اپنی گزرنا ہے اب
کوئی نہ جانے کہاں پر	یہی حصولِ آزادی ہے

سند باد ہو کر گزرا ہے یہی آخری اک وادی ہے
 کوئی صعوبت ایسی نہیں ہے ایک آخری اور جزیرہ
 جس کو اسی نے حل نہ کیا ہے کتنا روشن کتنا تیرہ
 ساری عمر سفر میں گزری

گمشدہ قبر

میں اس قبر پہ	اماں تمہاری قبر کہاں ہے
فاتحہ پڑھ کر	کسے ڈھونڈوں
انپی تسلی کر لیتا ہوں	کس سے پوچھوں
اور تمہارے نام کتبہ	چھوٹا بھائی تو تمہیں بھلا کر
اسی قبر کی پیشانی پر	تمہیں کراچی میں دفنا کر
چسپاں کر کے	خود امریکہ چلا گیا ہے
رو لیتا ہوں	کون بتائے گا ب محکو
آنسوں سے	اماں تمہاری قبر کہاں ہے
منہ ڈھولیتا ہوں	سب قبروں پر
اب یہ قبر میرے سینے کے	کتبے لگے ہیں
قبرستان کی زینت ہو گی	لیکن
میری تنہا امانت ہو گی	تمہارے نام کا کتبہ
اور ممتا کی ضمانت ہو گی	کہیں نہیں ہے
اماں تمہاری	ایک اکیلی قبر ہے جس پر
قبر کہاں ہے؟	کوئی کتبہ نہیں لگا ہے
کچھ تو بتاؤ	یہ لاوارث لحد ہی شاید
	قبر تمہاری ہو سکتی ہے

[سداسہا گن]

سداسہا گن اماں کواب	اماں دیکھو ہم سب نے
کس جلے میں پہنچانا ہے	آج تمہارے سب بیٹوں نے
لواباً جی	نہلا دھلا کر
اپنی امانت	اور سجا کر
آپ سنھالو	تمہیں اٹھا کراپنے چوڑے
اماں اباً کا یہ جوڑا	شانوں پر
ہنسوں کے جوڑے جیسا ہے	لئے آئے ہیں قبرستان میں
ہم سب کو تو	اباً جی کے پاس
فاتحہ پڑھ کر گھر جانا ہے	ہمیں بتا داماں جی اب
ایک نہ اک دن	کون سی قبر میں تمہیں اُتاریں
سب کو ہی یوں	اباً جی تو
مرجانا ہے	ہیں چپ چاپ
یہاں سے ہجرت کر جانا ہے	



[زندگی کا سایا]

اک حسین پرندے کے
خوبصورت جوڑے نے
جو الہ مکھی کے چوٹی پر
آشیاں بنایا ہے
گویا زندگی نے
موت کے دہانے میں
طرف آزمایا ہے

مرگِ ناگہانی پر
زندگی کا سایا ہے



[بستر پر]

میرے تکیے پر لمس ہے کس کا
خوشبو کس کی ہے بال کس کے ہیں
یہ دباؤ سا کس کے سر کا ہے
ہونٹ کس کے ہیں گال کس کا ہے
صف چادر پر عرق کس کا ہے
چنڈوں میں ہے کس کی عریانی
باس کس کی بسی ہے بستر میں
کس کی آخر ہے یہ مہربانی
کس نے اوڑھا ہے میری چادر کو
لمس سے کس نے اس کو مہکایا
سلوٹیں کس نے ڈال دیں اس پر
جسم سے کس نے اس کو بہکایا
کس نے بخشنا ہے وصل کا لمحہ
کس نے قربت کا بیج بویا ہے
کون جاگا ہے میری آنکھوں میں
میرے بستر پر کون سویا ہے



[دوپریاں]

دوپریاں میرے گھر آئیں
 دل کی پیاس بچانے کو
 اپنے پیار کی خوبیوں سے
 میرا آنگن مہکانے کو
 دوپریاں میرے گھر میں آئیں
 دونوں جنت کی حوریں تھیں
 دونوں باغوں کی کلیاں
 گھر میں کرتی رہتی تھیں وہ
 مزے مزے کی رنگ رلیاں
 دوپریاں میرے گھر میں آئیں
 اندر لوک کی باسی تھیں وہ
 گویا اپسرا میں تھیں
 پھولوں کی تھی کیا ریاں دونوں
 خوبصوردار ہوا میں تھیں
 دوپریاں میرے گھر میں آئیں
 ان کے دم سے خوشیاں تھیں سب
 وہ دونوں شہزادی تھیں

[متنا]

اس
 کی
 آنگیا

چاند نگر کی رہنے والی
 وہ نورانی وادی تھیں
 دوپریاں میرے گھر میں آئیں

[آگ کا دریا]

میں نے ایک کاغذ کی ناول پر
آگ کا دریا
پار کیا تھا
اک بھولی بھالی لڑکی سے
چاہت کا
اظہار کیا تھا
موم کا پیکر ہوتے ہوئے بھی
شعلوں کا
دریا کیا تھا
اور اچانک
آگ کا دریا
بچھڑ گیا تھا
رنگِ وفا کا
اُتر گیا تھا
اب میں بھنور میں
پھنسا ہوا ہوں
اور وہ لڑکی
پکھل چکی ہے
جان جسم سے
نکل چکی ہے
میں نے ہی یہ
غلطی کی تھی
اور سزا اب

[ایک نظم]

ایک نظم کہنی ہے مجھ کو
لیکن کیسے
سب کی سب لفظوں کی تتلیاں
پھولوں کے لب چوم رہی ہیں
اور خوشبوئیں
تیرے نام کی بجھ بن کر
جھوم رہی ہیں
تیرے لمس کی لذت اب تک
بستر پر میرے لیٹی ہے
رات کی رانی مہک رہی ہے
چاند کی نیت
بہک رہی ہے
تو ہی بتا ایسے میں آخر
نظم کے تانے بنے کیسے
بُن پاؤں گا
تیرے اور
ٹوٹے ہوئے دل کی
وھڑکن کے علاوہ
اور بھلا کیا سُن پاؤں گا
ایک نظم کہنی ہے مجھ کو
لیکن کیسے؟

بھگت رہا ہوں
میں نے اک کاغذ کی ناو پر
آگ کا دریا پار کیا تھا



[گرد]	[بستر کی سلوٹ]
میری بیدی کی قبر پر	میں نے اس کو
اک کتبہ ہے	اپنی ہوس کا ذریعہ سمجھا
جس پر اس کا	روزانہ محبت سے نوازا
نام لکھا ہے	اسی نے لگایا پیار کا غازہ
پیدائش اور	ہر شب کو
مرنے کی تاریخ درج ہے	رنگین بنایا
فاتحہ پڑھتے سے پہلے	میرے بستگر کی چادر پر
میں نے دیکھا کتبہ پر کچھ گرد جمیں ہیں	نئی نئی سلوٹیں
وقت کی گویا	بن گئیں
نفس تھی ہے	جسم کی ساری ریس تھیں
اپنے رومال سے	آخر کب تک
میں نے اس کی	ایک ہی ساز
گرد صاف کی	بجا یا جائے
اور فاتحہ	ایک ہی رنگ
پڑھ کر لوٹا	جمایا جائے
جب رومال کو	آخر اک دن
غور سے دیکھا	تنگ آ کر
وہ میلا تھا	بستر کی
دل میں آیا	چادرہ بدل دی

کام میں یہ انصاف نہ کرتا	نئی نئی سلوٹیں
اور وہ کتبہ	سجا میں
صاف نہ کرتا	اپنی پسند کی
	شمیں جلا میں



[سفر آخرت]

تم نے اپنی
 آخری جب سانس لی تھی
 میری آنکھوں کا
 وہ پہلا پہلا آنسو
 آج بھی دل میں
 کھلتتا ہے میرے
 آخری بچی جب آئی تھی تمہیں تو
 میرا دم گھٹنے لگا تھا
 میری جانب دیکھتے ہی دیکھتے تم
 اپنی پلکوں پر سجائے
 آخری قطرہ لہو کا
 روچکی تھی
 میرے ہاتھوں سے
 ہمیشہ کے لئے تم کھوچکی تھیں
 سوچتا ہوں
 میں بھلا کیسے تمہارے بن جیا ہوں
 مجھ کو تو
 فوراً تمہارے ساتھ

مرنا چاہیے تھا
آخرت کا یہ سفر
ہمراہ کرنا چاہیے تھا

☆☆☆

[کتبہ لکھنے والو!]
کتبہ لکھنے والو بولو
کتبے میں تم کیا لکھتے ہو
نام پتہ
پیدائش موت
کس دن ہوا تھا
بندہ فوت
اس کے علاوہ
تم کو کچھ معلوم نہیں ہے
کون تھا کیسا تھا اور کیا تھا
بھلابر اتھا
کس کی آنکھ کا
تارہ تھا وہ
کس کے دل کا سہارا تھا وہ
اس کو کھو کر
کس نے کیا کھویا ہے آخر
کس نے کتنا
دل سے لہرو یا ہے آخر

تم کیا جانو
 کام تمہارا صرف اتنا ہے
 کتبہ لکھنا
 اور قبر پر چسپاں کرنا
 کتبہ لکھنے والوں



تم سے پھر کر جی نہیں سکتا
 لوٹ کے اب واپس آ جاؤ
 ورنہ میں بھی
 مر جاؤں گا
 یہ انہوں نی
 کر جاؤں گا

[نیوڑ]

تیری تصویر اک مصوّر نے
 خون دل سے بنائی ہے شائد
 جس کو اک میگزین نے چھاپا ہے
 زفیں آ کاش پر کندیں ہیں

بازو توں و فرج کا جادوں ہیں
 سینہ ہے یا کہ دو پرندے ہیں
 اپنے ارنے کو پر جو تو لتے ہیں
 ان کو دیکھو تو منہ سے بولتے ہیں
 ناف ہے یا بھنو رہے دریا کا
 ڈوب جاتے ہیں جس میں دل والے
 اور کمر میں رچاؤ ہے ایسا
 رام کے تھا کمان میں جیسا
 فیتوں کا ایک جوڑا ہے
 اس نے جیتا نہ ہم کو چھوڑا ہے
 دانوؤں نے سحر بھونک رکھا ہے
 پنڈ لیاں ہیں کہ صاقِ سیکی ہیں
 باغِ جنت کا جیسے میوا ہیں
 جالِ نظروں کا ڈال رکھا ہے
 پیر ہن بن گیا ہے شوقِ دید
 عید کا چاند ہے سراپا تو
 یہ تصور کی برق پاشی ہے
 تیری تصویر ہے کہ کاشی ہے



[علی بابا]

علی بابا کہاں ہوتم
 کہاں ہوتم علی بابا
 بلا تا ہے تمہیں بغداد اسرا
 یہاں پر ہو گئے سب بے سہارا
 تمہارے شہر گونگا بہر اور اندھا ہو گیا ہے
 یہاں گھس آئے ہیں چالیس چور
 سارے گھرویران ہیں اب کیا کریں
 ساری دولت سارا دھن
 ہے غار میں بند
 اور دروازہ نہیں کھلتا ہے ہم سے
 ہمیں معلوم کیا
 دروازہ کیسے کھل سکے گا
 اسے واکرنا تم ہی جانتے ہو
 کہاں سے آئے گا اس اب سارا
 یہاں کے سارے باشندے تو ہو چکے ہیں
 ہے مر جینا بھی غائب
 پکاریں اب کسے آواز دیں ہم
 علی بابا کہاں ہوتم
 چلنے آؤ کہ سانسیں رُک رہی ہیں
 پہاڑی غار کا دروازہ کھولو
 کھل جاسم سم منہ سے بدبو
 اور ہمارے پنجی واپس لے کراؤ
 تمہیں کر سکتے ہو مشکل کشائی

تمہیں بغداد کے اب پیشواد ہو

تمہارا ہی سہارا ہے ہمیں اب

علیٰ بابا کہاں ہوتم

کہاں ہوتم علیٰ بابا

☆☆☆

[لامسٹ سفر]

کوئی سمت ہے نہ کوئی راستہ ہے

بس اک چلتے رہنے کی دھن میں مگن

چلے جا رہے ہیں

پہنچنا کہاں ہے

کسے فکر اس کی

ہو کو ہو کے بلوں کی

یہ سل جیسے

کہ آنکھوں پہ

جہالت کی پتی بندھی ہے

چلے جا رہے ہیں

نہ رستہ نہ منزل

نہ طوفان نہ ساحل

کہ جیسے یہ بھیڑوں کا

ہوغول کوئی

نہ اہماس کوئی نہ بھوگول کوئی

چلے جا رہے ہیں

چلے جا رہے ہیں

[جبر]

لفظوں کی تسلیاں پکڑتا ہوں
 رنگ چٹلی می چھوٹ جاتے ہیں
 خارزاروں پر جب بھی چلتا ہوں
 آبلے سارے پھوٹ جاتے ہیں
 امن کی فاختائیں روئی ہیں
 موت پر میری گدھ ہنستے ہیں
 ہوں ازل سے عجب تذبذب میں
 کیسے اس جبر سے نجات ملے
 میرے بس میں نہیں ہے اب کچھ بھی
 دسترس میں نہیں ہے اب کچھ بھی
 جاؤں تو بھاگ کر کہاں جاؤں
 جسم کی قید سے نکل جاؤں



[طاہرہ]

ہم سفر میری، شریکِ زندگی	طاہرہ بھا بھی کہاں ہیں
یہ تو بتاؤ	وہ مدارا تین وہ خاطر داریاں
کہ آخر کہاں ہو	یاد کر کر کے پریشان ہیں سمجھی
تم نے تو وعدہ کیا تھا	میں اکیلا کیا کروں
زندگی بھر ساتھ دینے کا، مگر	کچھ تو بتاؤ
اس سفر میں	ہو سکے تو لوٹ آؤ
جو مسلط ہے ازل سے	میں اکیلا کیسے آخر جی سکوں گا
اور ابد تک جور ہے گا	اس کی گارٹی نہیں ہے

کچھ تو بلو
 قائمِ دام سروں پر
 طاہرہ
 یاد ہے تم نے کہا تھا
 میں کیا کروں
 ہدم ودم ساز ہو گی
 ☆☆☆
 ہر قدم ہمراز ہو گی
 میر اسایا بن کے
 میرے ساتھ ہو گی
 زندگی کے آخری لمحے تک تم
 غمزہ غماز ہو گی
 پھر اچانک
 ان خلاؤں میں کہاں
 تم کھوئی ہو
 مجھ کو تنہایوں بتا چھوڑ کر
 کیوں سوئی ہو
 طاہرہ کچھ تو بتاؤ
 کس لئے مجھ سے خفا ہو
 دیکھو گھر میں کتنے شاعر
 مہمان بن کر ہیں آئے
 اور تم کو پوچھتے ہیں

☆☆☆

[ماں]

ماں کا نام آتے ہی
ذہن و دل کے صحرائیں
پھول کھلنے لگتے ہیں
زیست کے جزیروں میں
یار ملنے لگتے ہیں
سر پھری ہوا رُک کر
لوری گانے لگتی ہے
گنگنا نے لگتی ہے
سارے غم خوشی بن کر
جشن کرنے لگتے ہیں
زم بھرنے لگتے ہیں
ماں کا نام آتے ہی
سر پہ ایک چادر سی
امتا کی تنتی ہے
بگڑی بات بنتی ہے
ہاتھ دو دعاوں کے
سر پہ سایہ کرتے ہیں
کچے دودھ کی خوشبو
سر سرانے لگتی ہے
زندگی خود اپنے آپ
مسکرا نے لگتی ہے
میں خدا سے بھی پہلے

ماں کا نام لیتا ہوں
 اس کے قدموں کے نیچے¹
 میری اپنی جنت ہے
 ماں اگر مہرباں ہے
 تو کسی خدا کی بھی²
 ہم کو کیا ضرورت ہے
 صرف ماں ہی کافی ہے
 باقی سب اضافی ہے
 ماں کا نام آتے ہی---

☆☆☆

[صلہ]

تمہاری قبر کا کتبہ
 میں بھی دیکھتا ہوں
 دل میں میری
 ہو کاٹھی ہے
 تمارا نام
 کتبے میں جہاں لکھا ہوا ہے
 اس جگہ تو
 میرا نام ہونا چاہیے تھا
 کون ہے
 جس نے
 یہ غلطی کی ہے آخر
 لو میں اپنے ہاتھ سے
 اس نام کو یکسر مٹا کر

نام اپنا لکھ رہا ہوں
اور غلطی کا ازالہ

کر رہا ہوں

تم نہیں ہوا س لئے میں
جیتے جی ہی مر رہا ہوں

تم خفاجہ سے

نہ ہونا

یہ توسیب میری محبت کا صلمہ ہے
تم کو کھو کر جو ملا ہے

☆☆☆

[بیساکھی]

جبر و قدر کے مالک تو نے

اپنے بندوں پر

جبر کے ہتھیاروں سے

ہمیشہ وار کیا ہے

مار سے قسمت کی مارا ہے

پھر بھی یہ انسان

کہاں ہمت ہارا ہے

میرا ایکسٹرینٹ

محض اک اتفاق تھا

یا قسمت کی کوئی سازش تھی

میرا نچلا دھڑا ب میرے

لبس میں نہیں ہے

اپنے شکستہ باوں لئے میں

بیساکھی پہ اب چلتا ہوں
 مرگ و حیات کا لمبا سفراب
 بیساکھی سے طے کرتا ہوں
 دنیا کیا ہے ایک تماشہ
 بیوی میری مجھے چھوڑ کے
 اپنے میکے بھاگ گئی ہے
 میں تنہا کس طرح جیوں گا
 تیرے جر کے سائے میں
 دم گھٹتا ہے میرا
 ہار نہیں مانوں گا لیکن
 ہنسنے کا موقع نہیں دوں گا
 کبھی تجھے میں اپنے اوپر
 تو مالک ہے میں بندہ ہوں
 لیکن پھر بھی
 اپنی اس بیساکھی سے میں
 بھوسا گر کو پار کروں گا
 جیوں کی میرا تھن جیت کے
 ہی دم لوں گا
 میرے آقا
 میں مسجد ملائک ہوں
 تو میری اس بیساکھی پر
 تھوڑی دور ہی چل کے دکھاتو میں جانوں
 تو آقا ہے جبر و قدر کا مالک ہے تو
 خالق ہے تو

☆☆☆

[فریاد]

کتنے وعدے تھے عاشقی کے تھیں
 کتنے وعدے تھے ساتھ رہنے کے
 کتنا جذبہ تھا وفاداری کا
 کیا تھے محبوب صرف کہنے کے
 آخری وقت میرا جب آیا
 تم رڑپتے تھے اور روتے تھے
 درد اٹھتا تھا جب میرے دل میں
 تم بلکہ تھے صبر کھوئے تھے
 جب میری سانس رُک گئی تھی تب
 تم نے کتنی پچھاڑیں کھائی تھیں
 کھو گئے تھے گھنے اندر ہیرے میں
 آرزو کی شمعیں بجھائی تھیں
 قبر میں جب اُتارا تھا مجھ کو
 موت سے تم بھی ہم کنار سے تھے
 فاتحہ پڑھ کے جانے سے پہلے
 تم کس بے نشان غبار سے تھے
 دائیٰ صدمہ جس کو سمجھے تھے
 وہ تو اک رنج عارضی نکلا
 مجھ کو دفنائے چل دیے واپس
 اپنارشتہ تو سر سری نکلا
 مجھ کو تنہا سپردِ خاک کیا
 رحم بھی مجھ پہ اب نہیں کھاتے

میری بسری پہ بھی مگر اب تم
 فاتحہ پڑھنے بھی نہیں آتے
 ہم سفر زندگی کے تھے شاید
 موت نے سارے رشتے توڑ دیے
 اک ذرا غم کا موڑ کیا آیا
 تم نے گھبرا کے ہاتھ چھوڑ دیے
 سب کے امیدوار آتے ہیں
 سب کی قبروں پہ پھول ہنستے ہیں
 ہم ہیں اک اسے بد نصیب کہ جو
 فاتحہ کے لئے ترستے ہیں
 کاش تم ایک بار آ جاؤ
 میں بھی اک بار سرخ رو ہولوں
 اور کاندھے پہ اپنا سر رکھ کر
 میں بھی اپنے نصیب کو رو لوں
 تم اگر زندگی سے نالاں ہو
 اپنی ہر آرزو مثالی ہے
 تو چلے آؤ میرے مرقد پر
 میرے پہلو میں جگہ خالی ہے



[لیم سینا و]

وہ خلا کی شہزادی
 آگئی ہے پھر واپس
 اپنی دھرتی میا کی
 گود میں مہکنے کو

آورز میں کے اوپر
 پیار سے ٹھمکنے کو
 وہ خلا کی شہزادی
 پانی خاک پالے کر
 جو خلا کے سینے پر
 چھل قدمی کرتی تھی
 موت سے نہ ڈرتی تھی
 اپنے یاں کی جس نے
 پیار سے مزمت کی
 دور ہر شکایت کی
 اور ثابت و سالم
 واپس اس کو لے آئی
 ملک اور ملت کی
 ہونہا ربیعی نے
 کیسی یہ کرامت کی
 زیست کی حفاظت کی
 کارہائے نسوان کی
 ایک نئی سہر ہے یہ
 اور سُنیتا ولیم کی
 ایسی اک مہرے یہ
 جس پر فخر ہے ہم کو
 آج ہماری بیٹی نے
 نام وہ کمایا ہے
 جھل کے اندر ہیر روں میں

اک دیا جلایا ہے
 جس کے نور پر قرباں
 ہیں ہزار ہا سو رنج
 آؤ اپنی لاڈو کی
 آرتی اُتاریں ہم
 یہ پری خلاوں کی
 کتنی خوبصورت ہے
 اس کے حسن کے آگے
 سب کا حسن پھیکا ہے
 اور اس کے ماتھے پر
 آگئی کاٹیکا ہے
 عورتیں زمانے کی
 تجھ پہ ناز کرتی ہیں
 تو سبھی کی آنکھوں کا
 نورِ جاودا نی ہے
 تو خدا کی رانی ہے
 تو خدا کی رانی ہے



[آزمائش]

میں کہ ایک ناری ہوں
 میں کہ ایک ابلاء ہوں
 میں گزرنے والی ہوں
 امتحانِ آتش سے
 زندگی کی سازش سے

مرد کی نوازش سے
ایک آزمائش سے

☆☆☆

[گنہگار]

ایک مرد نے ایک ناجائز
بچے کی ماں بنادیا ہے
سمئے نے اتیا چار کیا ہے
جاوں کہا اب
اپنے آپ میں
سنگسار ہوں
گنہگار ہوں

☆☆☆

[بندگی]

پھول میں خوبیو ہو جیسے
میرے دل میں تو ہو جیسے
دشت میں آ ہو جیسے
اس طرح ہی زندگی ہے
تیرگی ہے، روشنی ہے
دل ہے، دل میں بندگی ہے

[شراب]

میں دشینت کی محبوبہ
بھرت کی ماں ہوں
صرف ایک انوٹھی کے
کھوجانے سے

میرا پتی مجھے بھول گیا ہے
 سمنے نے کیسی سازش کی ہے
 میں ابلاناری اب آخر

جاوہ کہاں

بے اماں ہوں، بے چاری ہوں
 بھارت ورش کی ناری ہوں
 کیسا شراب ہے
 پلچھاتاپ ہے



[کفارہ]

ایک اخبار میں
 خبر چھپیں ہے
 اک نومولود

چھوٹا سا بچہ

گھوڑے پہ پڑا ہے
 کسی کنواری مان نے

اس کو پھینک دیا ہے

آنندھی کی زد میں یہ دیا ہے

کون کرے گا اب کفارہ

کس کا جیمر دہائی دیگا

کون اب اسے رہائی دے گا

گھردے گا، انگناہی دے گا

کون آگے آئے گا لوگو

کچھ تو بولو، کچھ تو بولو

☆☆☆

[پہچان]

میرا سینہ جو لا مکھی تھا

دل سے لا وابہہ نکلا تھا

پھر بھی ہونٹوں پر مسکان تھی

ہم جیسے دیوانوں کی

شاید سب سے الگ پہچان تھی

☆☆☆

[خاندان]

گنگا جمنا کا جیسے سنگم ہیں

موت کیا ہے ان کو مار پائے گی

زیست سے ترجمان ہیں دونوں

دونوں عالم ہیں ان کے کاندھوں پر

دیکھو کتنے مہماں ہیں دونوں

کس کی یہ گمشدہ نشانی ہیں

کس کا یہ خاندان ہیں دونوں

☆☆☆

[لامحالہ]

جل پری ہے کہ حور ہے کوئی

پاس ہے کوئی، دور ہے کوئی

آپ اپنے حضور ہے کوئی

نار ہے کوئی، نور ہے کوئی

اپنی ہی ذات کا حوالہ ہے

کون آخر یہ لامحالہ ہے

☆☆☆

[کانا باتی]

ننھے منے کے ہاتھوں سے

چڑیا اڑگی پھر

لگا کون سا سر

کانا باتی گر

☆☆☆

[سرمایہ]

اک بار ود کے ڈھیر کے اوپر

ایک بٹخ نے انڈے دیے یہ

اور ان کو سینے پیٹھی یہ

جان اپنی دینے پیٹھی ہے

زیست تری کیسی مایا ہے

موت کا جیون راس آیا ہے

یہی حیات کا سرمایہ ہے

☆☆☆

[بھارت کی ناری]

تتلی پھول کلی اور خوبشو

رہتا نہیں ہے دل پر قابو

پہلا پہلا پیار ہے شاید

پہلی دل کی ہار ہے شاید

آنکھوں سے آنسو جاری ہیں

ذہن پر اندرھیارے طاری ہیں

بہتنا ہے آنکھوں کا کاجل

ریت نہ جائے یہ گنگا جل
 اشکوں کی برسات ملی ہے
 دنیا سے سوغات ملی ہے
 تن پر ہے اک میلی ساڑی
 وضنیہ ہے تو بھارت کی ناری



[لازوال منظر]

محضرا تنا ہے لباس اُس کا
 جیسے خوشبو برہنہ، ہو جائے
 جیسے فطرت نہائے دریا میں
 جیسے ہر سو اجala ہو جائے
 نظریں تکتی نہیں سراپے پر
 نور ہی نور ہے ہر اک جانب
 جیسے قوس و قزح فلک پر ہو
 حور ہی حور ہو ہر اک جانب
 تاب لامحال ہے کتنا
 وقت یہ لازوال ہے کتنا



[نام]

مرے ہی نام سے پکارو مجھے
 باپ کا نام تو اضافی ہے
 میری پچا ان مرے نام سے ہے
 کام ہر اک کو اپنے کام سے ہے
 باپ کے نام میں کیا رکھا ہے

کس نے پیدا کیا ہے کیا معلوم
حشر میں ماں کا نام آئے گا
بس یہی رشتہ کام آئے گا
میرے ہی نام سے پکارو مجھے

☆☆☆

[کلر بلاسٹڈ]

سارے رنگ سمت گئے
ایک سراپے میں
کیسے رہتا میں
آخر اپنے آپے میں
ایک ہی رنگ ہے
اب ہر جانب
دوسرا کوئی رنگ نہیں ہے
گوکہ وہ میرے
سنگ نہیں ہے

☆☆☆

[سرزنش]

تیرے دم سے
بزم ہستی میں
کشش ہے
قلبِ عاشقی کو
یہی اک سرزنش ہے

☆☆☆

[ثبوت]

جال کیسا
کیا ہے تاریخ بوت
کون دے
اس کا ثبوت
کون اس
اسرار کو افشا کرے
کون اپنے آپ کو
رسوا کرے

☆☆☆

[استعارہ]

اک سمندر
ایک آنسو
دونوں کھارے
زندگی کے
استعارے

☆☆☆

[رمز کائنات]

کیمیاگر
خاک و باد و آب و آتش
کو تناسب میں ملا کر
رکھ اساس زندگی
ہے یہی رازِ حیات
اور رمز کائنات

☆☆☆

[نجات]

ایک ناٹک کے سوا

کیا ہے حیات

پر دھگرنے پر ہی

حاصل ہو گی اب

اس سے نجات

☆☆☆

[سمندر سمندر]

سمندر سمند

تری تہہ میں

کتنے خزانے دبے ہیں

تیرے دل میں کتنے فسانے چھپے ہیں

تیری سہیلیوں میں

دمک مو تیوں کی

سامائی ہے سینے میں

تیرے خدائی

ہر اک لہر تیری

ہے موج طلاطم

زمانے ہیں کتنے

ہر اک بوند میں گم

تحبھی سے خشکی

ہو یہا ہوئی ہے

یہ دنیا تحبھی سے

تو پیدا ہوئی ہے

سمندر سمندر

ہمیں بھی تو سینے سے

اپنے لگائے

بہت تھک گئے

اب تو واپس بلا لے

سمندر سمندر

☆☆☆

[وہ ایک سورج]

وہ ایک سورج

نکل کے مشرق سے

بطنِ مغرب میں ڈوبتا ہے

وہ صبح دو پھر شام کر کے

وہ روزا پناہی کام کر کے

ہمارے تخت بستہ پیکروں کو

عمارتؤں میں بسرا رہا ہے

ہمیں وہ جینا سکھا رہا ہے

وہ ایک سورج

اٹھوا سے سنگسار کر دیں

خلافِ لیل و نہار کر دیں

لٹا پٹا اتشہا رکر دیں

کہیں یہ سورج

ہمارے نا آسودہ

حوالوں پر چھانہ جائے

ہمارے دل میں سما نہ جائے

ہمارے جسموں کو کھانہ جائے

بجھادواں کو

منٹاداں کو

ہمارے حق میں

یہیں بھلا ہے

وہ ایک سورج

☆☆☆

[بدن کے رشتے]

بدن کے رشتے بدن سے ہوں گے

نہ صرف یہ پیر ہن سے ہوں گے

تیرے بدن سے مرے بدن تک

جونہر جاری ہے

لمس کے ہے

روایتوں کی

فضول خرچی

بجانہیں ہے

اُٹھو یہ چادر

ہی پھاڑ ڈالیں

یہ چار دیواری

بھاند لیں ہم

ستم کے پرچم

اُکھاڑ پھینکیں

یہ کیسا قدر غن

لگارکھا ہے
 بدن بدن سے
 جدارکھا ہے
 سوال کل پر
 اٹھارکھا ہے
 یہ فیصلہ تو
 اب آج ہوگا
 ہمارا دشمن سماج ہوگا
 خلاف اپنے
 روانج ہوگا
 مگر یہ لازم ہے دوستواب
 بدن کے رشتے بدن سے ہوں گے
 لبوں کے رشتے دہن سے ہوں گے
 یہ کاروبار سخن سے ہوں گے
 اشارے اب اس دہن سے ہوں گے

☆☆☆

[ضرورت]

میں نے چوما ہے جب سے آؤیزہ
 اور بند یا لگائی ہونٹوں سے
 جب سے جھومر پا آنکھیں رکھی ہیں
 ب سے نتھ کو گلے لگایا ہے
 پیارے جب سے کیا ہے کنگن کو
 چوڑیوں کی کھنک سے کھیلا ہوں
 جب سے بازیب کھنکھنائی ہے

جب سے چولی کے بندکھو لے ہیں
 جب بھی جپر کو چھو کے دیکھا ہے
 جب بھی ڈھیلا کیا غارے کو
 آزمایا ہے اک شرارے کو
 تم نے نہس نہس کے مجھ کو ٹوکا ہے
 مسکرا کے روکا ہے
 چوم کے مجھ کو باز رکھا ہے
 صرف کچھ دن کا انتظار ہے اب
 اتنے بے چین کیوں ہو سو چوتو
 اب کلی پھول بننے والی ہے
 وصل کی آرہی ہے آہٹ سی
 اور بدن میں ہے سنسنا ہٹ سی
 انتظار اور بھی تھوڑا سا
 اور پھر تم یہ دیکھ پاؤ گے
 زندگی کتنی خوبصورت ہے
 ہم کو اک دوچ کی ضرورت ہے

☆☆☆

[ریشم کا کیڑا]
 جیسے ریشم کا اک کیڑا
 ریشم بُنٹا رہتا ہے
 اک اک دھاگا

خاموشی سے
 خود ہی چلتا رہتا ہے
 اس کو یہ معلوم نہیں ہے

پریشم ہی اک دن اس کی
 قبر بنے گا
 وہ تو ریشم بننے میں
 مصروف ہے اتنا
 اس کو اپنا ہوش نہیں ہے
 بس اس کی فطرت تو
 ریشم بننا ہے
 میں بھی لفظوں کے دھاگے سے
 نظمیں غزلیں
 ریشم کی طرح ہی
 ہر پل بتارہتا ہوں
 خوشبو چلتا ہوں
 ایک دن میں بھی
 اپنے ہی جال میں
 ہو کہ قید رہ جاؤں گا
 ریشم کے کیڑے کی طرح ہی
 خود ہی گھٹ کر مر جاؤں گا
 نام امر کر جاؤں گا



منتخب اشعار

سرڑکوں پر لکھ دیا ہے مجھے میرے وقت نے
تلودوں سے تم بھی اپنے کسی دن پڑھو مجھے



میں نے سہا ہے ایک زمانے کو ایک عمر
جیسا بھی کچھ ہوں میرے رفیقو! سہو مجھے



آئینے ہی آئینے ہے طرف
اور مرے ہاتھوں میں پتھرا یک ہے



زندگی کے اجازِ صحرائیں
تشنگی کا الا و روشن ہے



میں ٹھہریں پانی کی مانند قید ہوں خود میں
کناریں توڑ کے کوئی مجھے بہا ہی دے



مرا کلام ہے آئینہ عصرِ حاضر کا
جدیدیت کا مرے ذہن پر بخار نہیں



دل کی جراحتوں کی نمائش بھی ہے فضول
آنکھیں ہیں کس کے پاس نظر کس کے پاس ہے



روایتوں سے گریزاں رہے جیے جب تک
گلاب زاروں میں تنہابول بن کر رہے

☆☆☆

رہے جہاں بھی، رہے تشنگی کے پوردہ
خود اپنے گھر میں صحرائے پھول بن کر رہے

☆☆☆

یاد آرہی ہیں آج بھی ان کی عنایتیں
لودے رہی ہے آج بھی میری ہتھیلیاں

☆☆☆

ہے ضبطِ شوق پر ہی، نہ دنیا و دیں پہ ہے
دیوانگی کا قرض مری آستین پہ ہے

☆☆☆

چ کو سچ کہنے کی عادت نے کیا ہے رسوا
میں تو لے دے کے یہی اک ہنر کرتا ہوں

☆☆☆

میری آنکھوں کے تاقوں میں سلگ رہی ہے تنہائی
میرے سینے کے گنبد میں گونج رہا ہے سناٹا

☆☆☆

کبھی کبھی کسی گاگرنے بھر لیا ساگر
کبھی کبھی کسی قطرے میں ڈھل گیا دریا

☆☆☆

تارکوں کی تپتی سڑکیں اور برہنہ پانی ہے
زندہ رہنے کی مجبوری مجھے کھالے آئی ہے

☆☆☆

لکھوں گا سچ تو کتا بیس جلا دی جائیں گی
کروں گا ضبط تو پوروں سے خون ٹپکے گا



سانس کے ہمراہ سورج کا سفر جاری رہا
اور بیچاری زندگی پر چھائیوں میں کٹ گئی



یہ خبر سن کے مطمئنیں ہوں میں
وہ بھی میری طرح اکیلا ہے



BIBLIOGRAPHY

کتابیات

نمبر شمارہ	نام کتاب / رسالہ	مصنف / مرتب	سنِ اشاعت
۱.	سرابوں کے سفیر	عقلیل شاداب، ظفر غوری	۱۹۷۰ء
۲.	صحیح کا ستارہ	اخشم اختر	۱۹۹۰ء
۳.	جدید اردو نظم نظریہ و عمل	عقلیل احمد صدیقی	۱۹۹۰ء
۴.	حسنِ نظر	فضا جو کالوی	۱۹۹۱ء
۵.	انتخاب نظم شعراء راجستان	روشن اختر کاظمی	۱۹۹۳ء
۶.	اردو غزل	یوسف حسین خاں	۱۹۹۳ء
۷.	راجستان میں غزل گوشراہ	عبدالحی	۱۹۹۴ء
۸.	(مونوگراف)	اخشم اختر	۱۹۹۴ء
۹.	اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت	پروفیسر عنوان چشتی	۱۹۹۵ء
۱۰.	چھوٹ بولوں گاہیں	پر شوتم یقین	۱۹۹۷ء
۱۱.	راجستان میں غزل گوشراہ	عبدالحی	۱۹۹۷ء
۱۲.	اردو شاعری کافی ارتقاء	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۱۹۹۸ء
۱۳.	سنہرے خوابوں کی تعبیریں	بیشراحمد توفیق	۱۹۹۸ء
۱۴.	تو فیق کوٹوی کی حیات و شعری خدمات	نیلوفر اکرم	۲۰۰۹ء
۱۵.	بے آب سمندر (مجموعہ)	عقلیل شاداب	۱۹۹۹ء
۱۶.	هم سمندر سمندر گئے	شکور انور	۱۹۹۹ء
۱۷.	هم چلے کچھ اور چلنے	پر شوتم یقین	۱۹۹۹ء

نمبر شمارہ	نام کتاب/رسالہ	مصنف/مرتب	سن اشاعت
۱۸.	زرد پتہ ہرے ہو گئے	چاند شعری	۱۹۹۹ء
۱۹.	آباد خرابہ	ظفر غوری	۲۰۰۰ء
۲۰.	رات ابھی باقی ہے	پُرشومِ یقین	۲۰۰۰ء
۲۱.	رات ابھی باقی ہے	پُرشومِ یقین	۲۰۰۰ء
۲۲.	تذکرہ شعراء کوٹہ	عقلیل شاداب	۲۰۰۱ء
۲۳.	سورج سے ٹھنی ہے میری	پُرشومِ یقین	۲۰۰۱ء
۲۴.	اُداس لمحوں کے موسم	فاروق بخشی	۲۰۰۳ء
۲۵.	مفہیم	ڈاکٹر فاروق بخشی	۲۰۰۳ء
۲۶.	چہرے سب تتماتے	پُرشومِ یقین	۲۰۰۳ء
۲۷.	عقلیل شاداب کی شعری خدمات کا تقیدی جائزہ	روبنیہ	۲۰۰۳ء
۲۸.	مولوی سلیم الدین سلیم جے پوری	ڈاکٹر حسن آرا	۲۰۰۵ء
	حیات اور کارنامے		
۲۹.	دل کی دھڑکن	حسن عثمانی	۲۰۰۵ء
۳۰.	ساغر ناظمی: حیات اور کارنامے	فاروق بخشی	۲۰۰۷ء
۳۱.	پُرشومِ یقین: حیات اور شعری خدمات	نعم پٹھان	۲۰۰۹ء
۳۲.	راجستھان میں اردو نشر کی ایک صدی	ڈاکٹر قمر جہاں بیگم	۲۰۰۹ء
۳۳.	نئی حسیت کا شاعر فاروق بخشی		۲۰۰۷ء
۳۴.	کوٹہ کے نوجوان شعرا کی شعری خدمات	شاہین پروین	۲۰۱۰ء
۳۵.	ظفر غوری شخصیت، شعری خدمات اور انتخاب کلام (مقالہ)	عبد الحفیظ	۲۰۱۰ء
۳۶.	اندازِ نظر	اختشام آخر	۲۰۱۰ء
۳۷.	فضا جو کالوی فن اور شخصیت	آمنہ خاتون	۲۰۱۰ء
۳۸.	آدمی نما	عقلیل شاداب	۲۰۱۱ء

نمبر شمارہ	نام کتاب/رسالہ	مصنف/مرتب	سن اشاعت
۳۹	دریا ہریں اور کناریں	شکور انور	۲۰۱۱ء
۴۰	وہ چاند چہرہ ہی ایک لڑکی	فاروق بخشی	۲۰۱۲ء
۴۱	دریا کے کنارے	احتشام اختر	۲۰۱۳ء
۴۲	معانی و مطالب	فاروق بخشی	۲۰۱۳ء
۴۳	بے آب سمندر (ایک مطالعہ مضمون)	شاہد پٹھان	
۴۴	آزادی کے بعد راجستان میں نظم نگاری۔	ڈاکٹر حبیب الرحمن نیازی	
۴۵	روشنائی	سجاد ظہیر	
۴۶	ٹوٹ گیا سانوں کا بندھن (نظم)	فرخ ندیم	
۴۷	راجستان میں اردو زبان و ادب	ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی	
۴۸	واقع راجستان		
۴۹	تلامذہ غالب	مالک رام	

رسالہ

نمبر شمارہ	نام کتاب/رسالہ	مدیر / سن اشاعت
۱	تیور (ہندی رسالہ)	پریم پرکاش کانپوری ۱۹۷۸ء
۲	ہماری زبان (غفت روژہ رسالہ)	۱۳ اکتوبر ۱۹۸۱ء - شمارہ نمبر - ۱۰
۳	رنگ (سہ ماہی رسالہ) شمارہ ۲۱ روواں	مدیران: راشد انور راشد، شان بھارتی ۲۰۰۲ء
۴	میور (میگزین)	گورنمنٹ پی جی کالج کوٹہ ۱۹۹۲ء
۵	ماہنامہ زمانہ کانپور	دسمبر ۱۹۹۳ء
۶	نخلستان: لطفی کوٹوی	ودیسا گر